غالب نامہ

اکرام

تاج کمپنی لمیٹڈ لاہور

غالب نامہ

از

شیخ محمد اکرام ایم ۔ اے ایم ۔ آر ۔ سی ۔ اے ایس (لندن)

آئی ۔ سی ۔ ایس

۱۹۳۹ء

M

Urdu Poetry

اشاعتِ اوّل ۱۹۳۶ء

اشاعتِ ثانی (با اضافہ و تصحیح) ۱۹۳۹ء

فہرس

دیباچۂ طبعِ ثانی

تذکرہ

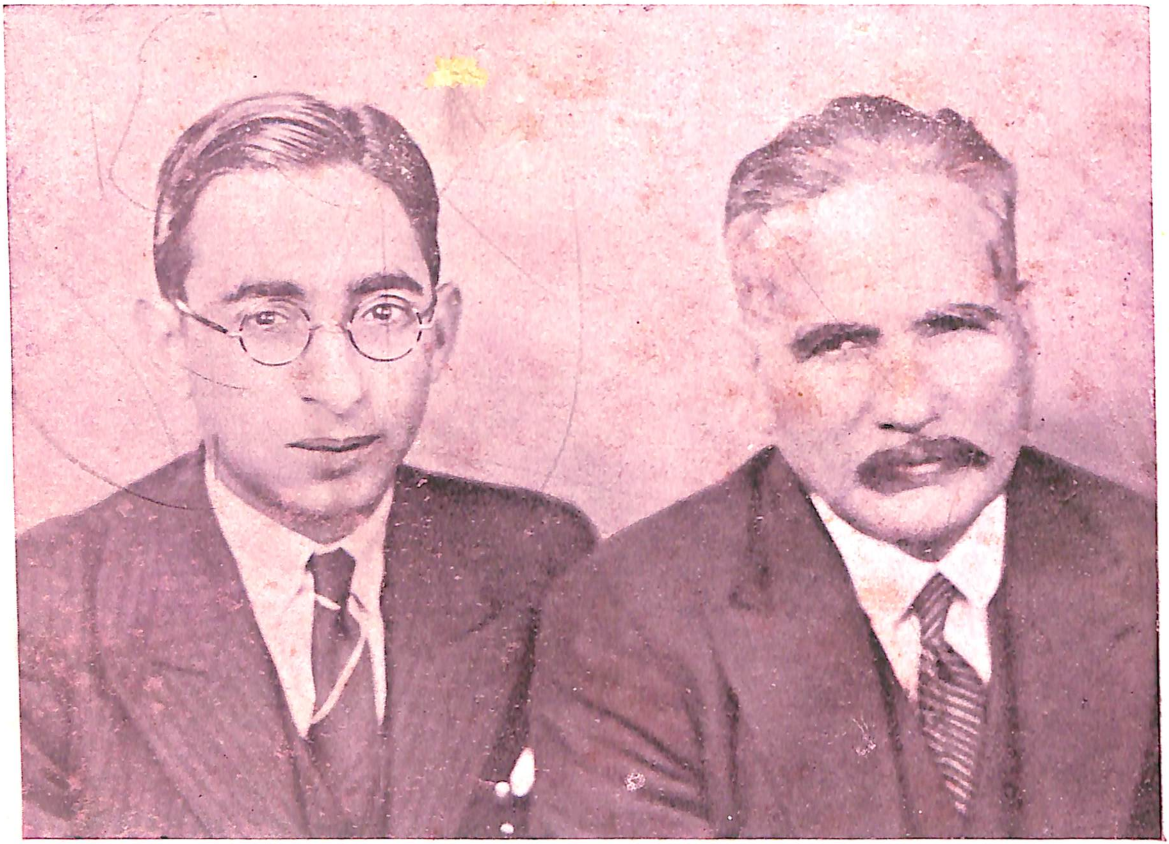
ترجمانِ حقیقت

علامہ سر محمد اقبال رحمتہ اللہ علیہ

کی

یادیں

اکرام



اقبال　　　　　　　　　　　　اکرام

۲۹ دسمبر سنہ ۱۹۳۲ء

لاندن

دیباچۂ طبعِ ثانی

غالب نامہ کا پہلا ایڈیشن دسمبر ۱۹۳۶ء میں شائع ہُوا۔ کتاب ہذا کو دوسری اشاعت کے لئے مرتب کرتے وقت ہر ممکن کوشش کی گئی ہے۔ کہ اس کا دوسرا ایڈیشن پہلے ایڈیشن کی بہ نسبت زیادہ صحیح اور مکمل ہو۔ اس خیال کے پیشِ نظر کئی جگہ ردّ و بدل کیا گیا ہے۔ اس امر کی خاص کوشش کی گئی ہے۔ کہ نسخۂ بھوپال کے باہر جس قدر غالب کا مستند غیر مطبوعہ یا غیر متداول اُردو کلام ملے۔ اُسے اس کتاب میں شامل کر لیا جائے۔ کلام کی تدوین میں بھی اہم تبدیلیاں کی گئی ہیں۔ غالب نامہ کی پہلی اشاعت کے بعد ہماری رسائی کلامِ غالب کے چند نادر و نایاب نسخوں تک ہوئی ہے۔ جن کی بنا پر کلامِ غالب کی تاریخی تدوین زیادہ مستحکم بُنیادوں پر ہو سکی ہے۔ ان نسخوں میں سے شاید اہم ترین دیوانِ غالب کا وہ قلمی نسخہ ہے۔ جو پروفیسر محمود خاں صاحب شیرانی کے کتب خانے میں محفوظ ہے۔ اور جس کی بنا پر غالب کے ان اشعار کی تاریخ تصنیف معین کی گئی ہے۔ جو ۱۸۲۱ء کے بعد اور ۱۸۲۷ء سے پہلے لکھے گئے۔ اس قلمی نسخے کے علاوہ اُردو دیوان کا دوسرا مطبوعہ ایڈیشن (۱۸۴۷ء) بھی ہمیں تدوینِ اشعار میں مفید ثابت ہُوا ہے۔ فارسی کلام کی موجودہ تدوین بھی پہلے سے زیادہ مکمل ہے۔ اس تدوین کے وقت ہماری رسائی فارسی دیوان کے پہلے مطبوعہ ایڈیشن (۱۸۴۵ء) تک ہو گئی تھی۔ اور چونکہ اس دفعہ ہم بانکی پور کے قلمی نسخہ (۱۸۳۸ء) سے بھی پہلے سے زیادہ استفادہ کر سکے ہیں۔ اس لئے پہلی ترتیب میں جو خامیاں تھیں۔ بہت حد تک ان کی اصلاح ہو گئی ہے +

کتاب ہذا کی موجودہ اشاعت کے وقت ہمیں کئی حضرات سے بیش بہا مدد ملی ہے۔ جس کا

اعتراف کرنا ہمارا خوشگوار فرض ہے۔ سب سے پہلے ہمیں لاہور کے مشہور فاضل پروفیسر محمود خاں صاحب شیرانی کا شکریہ ادا کرنا ہے۔ جنہوں نے بکمال دریا دلی ہمیں اُردو دیوان کے نادر قلمی نسخے سے مستفید ہونے کا موقع دیا۔ اور اس طرح کلام غالب کی تاریخی تدوین میں بیش بہا مدد پہنچائی۔ ڈاکٹر سید محمد عبداللہ صاحب ایم۔ اے۔ ڈی۔ لٹ بھی دلی شکریے کے مُستحق ہیں کیونکہ انہی نے ہمیں اس نادر قلمی نسخے کا پتہ دیا۔ اور جب پروفیسر صاحب کی اجازت حاصل ہو گئی۔ تو اُنہوں نے اس نسخے کے اندراجات کا مفصل خلاصہ ہمیں پُورا بھیجا۔ اور اس کے متعلق ہمارے استفسارات کا مفصل جواب دیا۔ اس کے علاوہ اُنہوں نے ہماری استدعا پر غالب نامہ کو شروع سے آخر تک پڑھا۔ اور کئی قیمتی مشورے دئے ؛

بنارس یونیورسٹی کے مشہور غالب نواز پروفیسر منشی مہیش پرشاد صاحب کا خاص شکریہ بھی ہم پر فرض ہے۔ فارسی دیوان کے پہلے مطبوعہ ایڈیشن کا سُراغ انہی سے ملا۔ اور انہی نے ہمیں اُردو دیوان کے دوسرے ایڈیشن کے متعلق مطلوبہ واقفیت بہم پہنچائی ؛

ان کے علاوہ ہم آنریبل ڈاکٹر سید محمود وزیر تعلیم صُوبہ بہار، سید کاظم رضا صاحب سپرنٹنڈنٹ پولیس بنارس، مسٹر فضل احمد کریم آئی۔ سی۔ ایس اور جناب حفیظ ہوشیارپُوری ایم اے کے ممنون ہیں۔ کہ انہوں نے مواد کی فراہمی اور کتاب کی ترتیب و تصحیح میں مختلف طریقوں سے ہماری مدد کی ؛

محمد اکرام

تذکرہ

بوادیئے کہ دراں خضر را عصا خُفتست
بسینہ می سپرم راہ گرچہ پا خُفتست

غالب

نجم الدولہ دبیر الملک مرزا اسداللہ خان

غالب



بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

باب اوّل

اکبر آباد

مغلوں کا بیشتر زمانہ دہلی میں گزرا۔ لیکن یہ عجیب اتفاق ہے کہ نہ صرف اُن کے فنِ تعمیر کا بہترین نمونہ اکبر آباد میں ہے۔ بلکہ ان کے سب سے بڑے شاعر اور ان کی تہذیب و تمدن کے بہترین ترجمان کا مولد بھی وہی بلدہ حسن و شعر ہے۔ مرزا اسد اللہ خاں خود ترک کی نسل سے تھے۔ اور ان کے دادا ان کے پہلے بزرگ تھے۔ جنہوں نے مرزا کی پیدائش سے فقط پچاس ساٹھ سال پہلے سمرقند چھوڑ کر ہندوستان کو اپنا وطن بنایا۔

مرزا شب ہشتم ماہ رجب ۱۲۱۲ھ مطابق ۲۷ دسمبر ۱۷۹۷ء کو شہر آگرہ میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد مرزا عبداللہ بیگ خاں عرف مرزا دولہا پہلے لکھنؤ اور اس کے بعد عرصے تک حیدر آباد میں ملازم رہے۔ لیکن غالب نے اپنے نانا خواجہ غلام حسین خاں کمیداں کے پاس آگرے ہی میں پرورش پائی۔ وہ پانچ برس کے تھے کہ والد کا انتقال ہو گیا۔ اور ان کے چچا مرزا نصر اللہ بیگ نے ان کو اپنے سایۂ عاطفت میں لیا۔ جب اس کے چار پانچ برس بعد ۱۸۰۶ء میں چچا کا بھی انتقال ہو گیا۔

تو مرزا کو ان کا وارث ہونے کی وجہ سے ساڑھے سات سو روپیہ سالانہ پنشن ملتی رہی۔ لیکن مرزا کے خطوط اور معاصرانہ تذکروں سے ظاہر ہے کہ آگرے میں اُن کا قیام اپنے نانا کے ہاں ہی تھا۔

غالب کے ننھیال کی نسبت ہماری واقفیت بہت محدود ہے۔ لیکن جو خط انہوں نے منشی شیونرائن کو لکھا ہے۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ ان کا ننھیال آگرے کے ممتاز ترین گھرانوں میں سے تھا۔ اور وہاں انہیں ہر طرح کا عیش و آرام اور ہر طرح کی آزادی میسّر تھی۔ ایسی آزادی کا اثر ایک نوجوان امیر زادے پر جس کے سر سے باپ کا سایہ اُٹھ گیا ہو۔ جو ہو سکتا ہے۔ وہی غالب پر ہوا۔ نواب اعظم الدّولہ اپنے تذکرے میں لکھتے ہیں:۔

"اسد اللہ خاں، مرزا نوشہ، از سمرقند مولدش
جوانِ قابل و یار باش و دردمند، ہمیشہ
بخوش معاشی بسر بردہ ...... در خاطر شمکن
غمہائے عشق مجازی تربیت یافتۂ غمکدۂ نیاز"

غالب نے اپنے خطوں میں اس رنگین زمانے کی طرف کئی جگہ اشارہ کیا ہے۔ اِن کے ایک ابتدائی فارسی قصیدے کی تشبیب ہے ؎

آں بلبلم کہ در چمنستانِ شاخسار | بود آشیانِ من شکنِ طرّۂ بہار
ہر غنچہ از دمم بفضائے شگفتگی | فیضِ نسیم و جلوۂ گل داشت پیشکار
ہر جلوہ راز من بتقاضائے دلبری | از غنچہ بود محملِ نازے بر رہگزار
ہم سینہ از بلائے جفا پیشہ دلبراں | فرہنگِ کاروانیِ بیدادِ روزگار
ہم دیدہ از ادائے مغاں شیوہ شاہداں | فہرستِ روزنامۂ اندوہِ انتظار

ہموارہ ذوقِ مستی و لہو سرور و سُور
پیوستہ شعر و شاہد و شمع دمے و قمار

لیکن اس آزادی اور مطلق العنانی کے باوجود مرزا کی تعلیم سے بے پروائی نہیں برتی گئی۔ مرزا

کی والدہ خود پڑھنا لکھنا جانتی تھیں۔ اور قرین قیاس ہے۔ کہ انہوں نے مرزا کی تعلیم کا خاص خیال رکھا ہوگا۔ معاصرانہ تذکروں سے بھی اس خیال کی تائید ہوتی ہے۔ مرزا کے ایک اُستاد نظیر اکبرآبادی تھے[1]۔ اور اگرچہ ایک دوسرے کے طبعی تفاوت کی وجہ سے غالب پر نظیر کا اثر نہ پڑ سکا۔ لیکن یہ ناممکن ہے کہ غالب جیسا ذہین طالب علم آگرے کے مشہور عالم مولوی محمد معظم سے کسب فیض نہ کر سکے۔ مرزا کی تصنیفات سے پتہ چلتا ہے کہ علوم مروجہ سے انہیں کافی واقفیت تھی۔ منطق۔ فلسفہ اور علم ہیئت کی علمی اصطلاحیں ان کے بالکل ابتدائی کلام میں موجود ہیں۔ اسلامی نظام تعلیم کے ماتحت علم طب کی واقفیت ہر تعلیم یافتہ انسان کے لئے ضروری تھی۔ اور مرزا کی تصانیف اور دوسرے ذرائع سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ وہ طب کی مشہور کتابوں سے بخوبی واقف تھے۔ عربی صرف و نحو سے بھی وہ ناواقف نہ تھے۔ اور بقول حالی جن ٹیڑھی ردیفوں میں انہوں نے غزلیں لکھی ہیں۔ ان میں غزلگوئی علم عروض کی واقفیت کے بغیر ناممکن تھی۔ لیکن ان علوم کی واقفیت سے زیادہ جو چیز مرزا کو دوسروں سے ممتاز کرتی ہے۔ وہ فارسی زبان اور ادب سے واقفیت اور اس زبان میں قدرت اظہار ہے۔ انہوں نے گیارہ برس کی عمر ہی میں فارسی شعر کہنا شروع کر دیا تھا۔ اور اس چھوٹی سی عمر میں ظہوری کا کلام اور دوسری فارسی کتابیں زیر مطالعہ رہتی تھیں۔ فارسی سے دلچسپی مولوی محمد معظم کی شاگردی کے زمانے ہی سے ہو گئی تھی۔ لیکن غالباً اس بارے میں ملا عبدالصمد ہرمزد کے احسانات ان پر سب سے زیادہ ہیں۔ مرزا اور ہرمزد کے تعلقات بہت واضح نہیں۔ ہرمزد سنہ ۱۸۱۰ء کے قریب آگرے میں سیاح کے طور پر آیا تھا۔ وہ دو سال تک مرزا کے ساتھ رہا۔ اور جب مرزا آگرہ چھوڑ کر دہلی آئے تو وہ بھی ہمرکاب تھا۔ اس سے خیال ہوتا ہے کہ وہ مرزا کا اتالیق مقرر ہو گیا ہوگا۔

مرزا ابھی تیرہ برس کے تھے۔ کہ میر محمد کاظم بیقرار جو ولی عہد شاہ دہلی ظفر کے اُستاد تھے۔ ایک سفارت پر الفنسٹن صاحب کے ساتھ سندھ گئے اور ان کی جگہ ذوق ولی عہد کے اُستاد مقرر ہوئے۔ اس وقت ولی عہد کے اُستاد کا مشاہرہ چار سو روپیہ ماہوار تھا۔ لیکن ولی عہد کی تخت نشینی کے وقت اس کے اُستاد کا اُستاد شاہ ہو جانا قدرتی امر تھا اس لئے اس تقرر سے مرزا کا

[1] گلستانِ بیخزاں

راستہ بند ہوگیا۔ جب ہم یہ واقعات دھیان میں رکھتے ہیں تو یہ سمجھنا بھی مشکل نہیں معلوم ہوتا۔ کہ ذوق کی زندگی میں غالب کا اُستادِ شاہ نہ ہونا بہادر شاہ کی بدذوقی کی وجہ سے نہ تھا۔ بلکہ اتفاقی حوادث کا نتیجہ تھا ؛

لیکن غالب کے لئے اس سال کا اور بھی اہم واقعہ مرزا الٰہی بخش معروف کی صاحبزادی امراؤ بیگم سے شادی تھی۔ مرزا کی کئی تحریروں سے بالخصوص اس دردناک مرثیہ سے جو انہوں نے ۲۵ برس کی عمر سے پہلے لکھا۔ یہ نتیجہ اخذ کرنا بہت مشکل نہیں کہ وہ شادی کو "دامِ سخت" ہی سمجھتے رہے۔ اور "اُڑنے" سے پہلے "گرفتار" ہو جانا انہیں بہت ناگوار تھا۔ لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ مرزا کے لئے یہ شادی ہزار آسانیوں کا موجب ہوئی ؛

غالب کے خسر مرزا الٰہی بخش معروف جن کے متعلق آزاد نے "آبِ حیات" میں کئی صفحے لکھے ہیں۔ ذوق کے شاگرد تھے۔ اور نہایت پاکیزہ اور مؤثر شعر کہتے تھے۔ فخر الدولہ نواب احمد بخش جنہوں نے لارڈ لیک کی فتوحات میں نام پیدا کیا تھا۔ مرزا الٰہی بخش کے بھائی تھے۔ نواب اور نواب کی اولاد سے غالب کے تعلقات کا ذکر بعد میں آئیگا۔ لیکن مرزا کے سُسرال پر سرسری نظر ڈالنے سے ہی یہ امر واضح ہو جاتا ہے۔ کہ اُن کی شادی ایسے گھرانے میں ہوئی تھی جو نہ صرف جاہ و ثروت کے لحاظ سے ممتاز اور روبہ ترقی تھا۔ بلکہ شعر و شاعری سے بھی گہرا لگاؤ رکھتا تھا ؛

غالب نے قیامِ آگرہ کے دوران میں جو اشعار لکھے وہ نسخہ حمیدیہ میں محفوظ ہیں۔ لیکن یہ فیصلہ کرنا کہ کونسے آگرے اور کونسے دہلی میں لکھے گئے۔ آسان نہیں۔ انڈیا آفس لائبریری میں اُردو شعرا کے دو تذکرے ہیں۔ "تذکرۂ سرور" اور "عیار الشعرا" جن میں غالب کو اکبر آباد کا ساکن بتایا ہے۔ لیکن ان قلمی نسخوں پر تاریخ کتابت درج نہیں۔ اور چونکہ "تذکرۂ سرور" کے مصنف سے غالب کی ملاقات آگرہ چھوڑنے کے بہت بعد تک ہوتی رہی۔ اس لئے ممکن ہے کہ اس میں کتاب کے ختم ہونے کے بعد جو اشعار ملے ہوں وہ بھی درج کر لئے گئے ہوں۔ چنانچہ انڈیا آفس میں لائبریری "تذکرۂ سرور" کا جو نسخہ ہے۔ اس میں کئی اشعار ایسے ہیں جو نسخۂ بھوپال میں بھی نہیں اور کچھ ایسے

بھی ہیں جو اور کسی دیوان میں نہیں ملتے ۔ مثلاً ؎

نیازِ عشقِ خرمن سوزِ اسبابِ ہوس بہتر — جو ہو جاوے نثارِ برق مشتِ خار و خس بہتر
جگر سے ٹوٹی ہے سوئی ہوئی سناں پیدا — دہانِ زخم میں آخر ہوئی زباں پیدا

"عُیار الشعرا" میں جو خوب چند ذکا نے اپنے اُستاد شاہ نصیر کی فرمائش پہ لکھا۔ غالب کے متعلق ذیل کا اندراج ہے :-

"مرزا اسد اللہ خاں عرف مرزا نوشہ المتخلص بہ غالب ولد مرزا عبد اللہ خاں عرف مرزا دولہ بنیرۂ مرزا غلام حسین خاں کمیدان ساکن بلدۂ اکبر آباد شاگرد مولوی محمد معظم ۔ شاعر فارسی ہندی"؛

اس تذکرے میں دو شعر ایسے انتخاب ہوئے ہیں ۔ جو اور کہیں ہماری نظر سے نہیں گزرے ؎

زخمِ دل تم نے دکھایا ہے کہ جی جانے ہے — ایسے ہنسنے کو رُلایا ہے کہ جی جانے ہے
صبا لگا وہ طمانچہ طرف سے بُلبل کی — کہ روئے غنچۂ گل سوئے آشیاں پھر جائے

ان تذکروں کے قلمی نسخے ہندوستان کے چند کتب خانوں میں بھی ہیں گر ان میں کوئی ایسا مل گیا جس پہ تاریخ کتابت درج ہوئی تو مرزا کے چند نہایت ابتدائی اشعار کے متعلق کہا جا سکے گا ۔ کہ وہ کس عُمر سے پہلے لکھے جا چکے تھے ۔ تاہم اب بھی اتنا یقینی ہے کہ مرزا نے آٹھ نو سال کی عُمر میں اُردو اور دس گیارہ برس کی عُمر میں فارسی شعر کہنا شروع کر دیا تھا ۔ اور غالباً ان اشعار کا معتدبہ حصہ جنہیں مرزا نے پندرہ بیس سال بعد دیوان ریختہ سے حذف کیا ۔ آگرے ہی میں لکھا جا چکا تھا ۔ ان تذکروں میں سے ایک میں مرزا کے حالات اسدؔ اور دوسرے میں غالبؔ کے تحت میں دیئے ہوئے ہیں ۔ مرزا نے تمام فارسی غزلیات میں غالبؔ تخلص استعمال کیا ہے ۔ اور معلوم ہوتا ہے کہ فارسی شعر گوئی شروع کرنے کے کچھ عرصہ بعد انہوں نے اردو میں بھی غالب تخلص لکھنا شروع کر دیا ۔ اور اس کے بعد بالعموم اردو اور فارسی دونوں زبانوں میں یہی تخلص قائم رکھا اگرچہ شاعرانہ سہولت کی وجہ سے بعد کی چند غزلوں میں اسدؔ بھی استعمال کیا ہے ؛

مرزا کا دہلی آنا جانا اس وقت سے شروع ہو گیا تھا۔ جب ان کی عُمر ابھی پانچ سال کی تھی۔ لیکن یہ یقینی طور پر نہیں کہا جا سکتا کہ کس زمانے میں وہ مستقلاً آگرہ چھوڑ کر دہلی گئے۔ البتہ ان کے چند خطوط سے خیال ہوتا ہے کہ وہ غالباً پندرہ سولہ برس کے ہونگے۔ جب انہوں نے آگرہ چھوڑ کر دہلی میں سکونت اختیار کی۔ چونکہ ننھیال آگرے میں تھا۔ اس لئے وہاں بھی اکثر جانے اور دیر تک مقیم رہتے اس زمانے میں ان کی والدہ زندہ تھیں۔ اور ننھیال خوش حال۔ ایسی حالت میں اُن کا آگرہ چھوڑنا بظاہر عجیب معلوم ہوتا ہے۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ غالب کے چچا مرزا نصر اللہ خاں کی وفات پر اُن کی پنشن نواب احمد بخش کی جاگیر میں شامل ہو گئی تھی۔ اور نواب نے اس کے عوض مرزا نصر اللہ خاں کے ورثا کی غور و پرداخت اور انہیں باقاعدہ پنشن دینا قبول کیا تھا۔ مرزا غالب مرزا نصر اللہ خاں کے ورثا میں سے تھے۔ اس لئے نواب اُن کی غور و پرداخت کے ذمہ وار تھے۔ اس کے علاوہ نواب کی بھتیجی سے مرزا کی شادی ہو جانے کے بعد ان کے تعلقات اس خاندان سے اور گہرے ہو گئے تھے۔ اور قرین قیاس ہے۔ کہ انہی تعلقات نے مرزا کو ترک وطن پر مجبور کیا۔ مرزا اس زمانے کے متعلق ایک اردو خط میں لکھتے ہیں:۔

"روٹی کا خرچ پھوپھی کے سر۔ بایں ہمہ کبھی خان نے کچھ دیدیا۔ کبھی
کچھ الور سے دلوا دیا۔ کبھی ماں نے کچھ آگرے سے بھجوا دیا۔"

یقینی طور پر نہیں کہا جا سکتا۔ کہ مندرجہ بالا سطور میں کس پھوپھی کی طرف اشارہ ہے۔ لیکن مرزا کی چچی جو اُنکی بیوی کی پھوپھی بھی تھیں۔ نواب احمد بخش کی ہمشیر[1] تھیں۔ ممکن ہے۔ انہیں کی طرف مؤدبانہ اشارہ ہو۔ اور قرین قیاس بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ آگرے سے آ کر مرزا اپنی بیوی کے اقارب اور اپنے چچا کے لواحقین کے ہاں مقیم ہوئے ہونگے۔ اور "زندان دہلی" کی "حراست" اسی مقدمے کے سلسلے میں ہوئی ہوگی۔ جس کا فیصلہ ۹ اگست ۱۸۱۰ء کو سنایا گیا تھا۔

[1] ۔ مرزا نے فارسی خط و کتابت پر جو رسالہ لکھا۔ اس میں نواب احمد بخش کو "عمّ عالی مقدار" لکھا ہے۔ اِس صورت میں نواب کی ہمشیر کو پھوپھی لکھنا کوئی غیر معمولی بات نہ ہوگی۔

مرزا کے اس زمانے کے حالات کسی تذکرہ نگار نے نہیں لکھے - اور نہ ان کے اس زمانے کے خطوط محفوظ ہیں - لیکن ان کی ادبی عظمت کی بنا اسی زمانے میں پڑی - اس لئے انکی کے گردوپیش کے حالات کسی قدر تفصیل کے ساتھ آئندہ باب میں درج کرینگے ؛

باب دوم

شاہجہاں آباد

مرزا کا دہلی میں آنا جانا اسی وقت سے شروع ہوا۔ جب شاہ عالم ثانی۔ جنہیں غلام قادر روہیلا نے آنکھیں نکال کر اندھا کر دیا تھا۔ تخت شاہی پر متمکن تھے روہیلوں کی بغاوت کے بعد دہلی میں مرہٹوں کا اقتدار بڑھا۔ تو سندھیا نے انہیں قید خانے سے نکال کر قلعہ میں بادشاہی تخت پر بٹھا دیا۔ اور اس کے بعد جب ۱۸۰۳ء میں لارڈ لیک نے سندھیا کو شکست دی اور دہلی میں انگریزی نظم و نسق قائم ہوا تو شاہ عالم ثانی کو بدستور تخت نشین رہنے دیا گیا۔ بلکہ معلوم ہوتا ہے کہ ان کی حالت پہلے سے بہتر ہو گئی۔ مسٹر آر چیبالڈ سٹین ریذیڈنٹ دہلی۔ بادشاہ کے جذبات کا ہر بات میں خیال رکھتے اور قلعہ اور شہر میں کسی قسم کی مداخلت نہ کی جاتی۔ بادشاہ کی جو خاصہ کی جاگیریں تھیں انکی آمدنی بڑھ گئی تھی۔ اس کے علاوہ اس زمانے میں سکّوں پر بادشاہ ہی کا نام ہوتا تھا۔ اور جاگیرداروں اور رئیسوں کی وراثت پر بادشاہ کی مُہر توثیق ہی کو سب سے زیادہ اہمیت دی جاتی۔ شاہ عالم کی وفات ۱۸۰۶ء میں ہوئی اور ان کی بجائے شاہ اکبر ثانی تخت نشین ہوئے۔ ان کے زمانے میں مسٹر آر چیبالڈ سٹین کی پالیسی قائم نہ رکھی گئی۔ لیکن قلعہ میں پھر بھی کوئی مداخلت نہ ہوئی۔ اور شہر میں شاہی جلوس اور سواری

کا اہتمام اسی شان سے جاری رہا۔ جو اس سے پہلے تھا۔ علاوہ ازیں اگرچہ بادشاہ کی ہستی شاہ شطرنج سے زیادہ نہ تھی۔ پھر بھی وہ اپنے موروثی حقوق پہ اڑے رہتے۔ چنانچہ ۱۸۱۴ء میں جب گورنر جنرل کلکتہ سے دہلی آئے تو ان کی ملاقات بادشاہ سے اسی وجہ سے نہ ہو سکی کہ بادشاہ نے ان کو اپنے برابر کرسی دینا قبول نہ کیا۔

قلعہ سے قطع نظر اس وقت شہر دہلی کی حالت موجودہ زمانے سے بہت مختلف تھی۔ شہر کے گرداگرد فصیل تھی۔ اور سارا شہر اس کے اندر آباد تھا۔ شہر کے دروازے شام کو بند ہوتے اور صبح کو کھول دیئے جاتے۔ جہاں شہر دہلی کا موجودہ سٹیشن ہے۔ وہاں اس زمانے میں مکانات تھے اور غدر سے پہلے ایک آباد محلہ تھا۔ جہاں امرا و ارا کین سلطنت رہتے تھے۔ چاندنی چوک کے درمیان اس زمانے میں نہر بہتی تھی۔ جس کے دونوں طرف خوشنما سایہ دار درخت تھے۔ معلوم ہوتا ہے کہ جب تک دہلی میں مرہٹوں کا راج رہا۔ شہر اور شہر کا قرب وجوار لٹیروں اور ڈاکوؤں سے محفوظ نہ تھا۔ جہاں جان و مال خطرے میں ہو۔ وہاں علم و فن کا عروج نہ پانا قدرتی امر ہے۔ چنانچہ دہلی میں جو کوئی شعر و سخن یا کسی اور فن میں نام پیدا کرتا۔ اُسے لکھنؤ کی کشش یہاں سے کھینچ لے جاتی۔ لیکن جب ۱۸۰۳ء میں انگریزوں کا نظم ونسق قائم ہوا۔ تو نہ صرف شہر کی آبادی و خوشحالی بہت بڑھ گئی۔ بلکہ علم و فن کا جو شیرازہ بکھرا ہوا تھا۔ وہ پھر ایک دفعہ بندھ گیا۔ اور بقول حالی "دارالخلافہ دہلی میں چند ایسے اہل کمال جمع ہو گئے۔ جن کی صحبتیں اور جلسے عہد اکبری اور شاہجہانی کی صحبتوں اور جلسوں کو یاد دلاتے تھے"۔ سر سید احمد خاں نے آثار الصنادید میں اس زمانے کے اکابر علماء اور شعرا کے حالات لکھے ہیں۔ اور جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ دوسری ممتاز ہستیوں سے قطع نظر اس زمانے کے شعرا میں شاہ نصیر۔ ذوق۔ مومن۔ علماء میں شاہ عبدالعزیزؒ۔ شاہ اسمٰعیلؒ۔ شاہ عبدالقادرؒ۔ حضرت سید احمد بریلویؒ۔ مولینا فضل حق خیرآبادی۔ اطباء میں حکیم محمود خاں۔ حکیم احسن اللہ خاں۔ حکیم رضا خاں اور نقادوں میں نواب مصطفٰے خاں شیفتہ موجود تھے۔ (یہ وہی لوگ ہیں۔ جن کے زیر اثر سر سید۔ حالی۔ نذیر احمد۔ آزاد۔ ذکاء اللہ اور داغ کی تربیت ہوئی اور جنہوں نے خود پر اپنے نظام کے پروردہ ہونے کے باوجود

بیس سال کے عرصے میں شمالی ہندوستان کو ایک نیا نظام تعلیم نیا لٹریچر اور مذہب کی مدافعت کیلئے نئے ہتھیار دے دیئے)۔ تو ہمیں غالب کے اس ماحول کا صحیح اندازہ ہوتا ہے۔ جس کا وہ خود ایک جزو تھا۔ اور جس کی ناواقفیت کی وجہ سے عوام کے نزدیک غالب کی شخصیت ایک معمّہ بنکر رہ گئی ہے ؛

حالی اُس زمانے میں دہلی آئے۔ جب یہاں پت جھڑ شروع ہو گئی تھی۔ لیکن ابھی باغ میں پھول اور پھولوں کے گرد بلبلیں موجود تھیں۔ چنانچہ انہوں نے حکیم محمود خاں کا جو مرثیہ لکھا ہے۔ اس میں اس زمانے کی نہایت موثر تصویر کھینچی ہے۔ ؎

اے جہان آباد اے اسلام کے دارالعلوم
اے کہ تھی علم و ہنر کی تیرے اک عالم میں دھوم

تھے ہنرور تجھ میں اتنے جتنے گردوں پہ نجوم
تھا افاضہ تیرا جاری ہند سے تا شام و روم

زیب دیتا تھا لقب تجھ کو جہاں آباد کا
نام روشن تجھ سے تھا غرناطہ و بغداد کا

تیری طینت میں ودیعت تھا مذاقِ علم و دیں
جیسے امی تجھ میں تھے۔ عالم نہ تھے ایسے کہیں

ہند میں تھا جو محدث تھا وہ تیرا خوشہ چیں
تھی محدث خیز اے پا تخت تیری سرزمیں

تھا تفقّہ بھی مسلّم تیری خاکِ پاک کا
تھی نہ فقیہ دیکھا اِک اِک فقیہہ اس خاک کا

طب میں گو یونانیوں کا سب سے آگے تھا قدم
آن کر اس نے لیا تھا دوسرا تجھ میں جنم

جب کہ نو آباد تھا دنیا میں اے باغِ ارم
بھر نے تھے تیرے اطبا بھی مسیحائی کا دم

ہند میں جاری تجھی سے طبِ یونانی ہوئی
شہر شہر اس جنس کی یاں تجھ سے ارزانی ہوئی

لیکے ساتھ اسلام نکلا تھا عرب سے جو علوم
جن میں تھی اسلامیوں کی چار سو عالم میں دھوم

دولت و اقبال کا جب تک رہا تجھ پہ ہجوم
کھیتیوں پہ تیری ابر آتے تھے ان کے جھوم جھوم

آئی گلشن میں نہ تیرے بھول کر فصلِ خزاں
تیری سرحد میں رہا ہے علم و دانش کا سماں

دورِ آخر میں کہ تیرا تیل تھا سب جل چکا   بجھتے بجھتے تھا کچھ اک تونے سنبھالا سا لیا

خاک نے یاں پھر تری اُگلے وہ لعلِ بے بہا   جن سے روشن ہو گیا، کچھ دن کو نام اسلاف کا

عہدِ ماضی کا سماں آنکھوں میں سب کی چھا گیا

خواب جو بھولا ہوا مدت کا تھا یاد آ گیا

جاہ و مکنت قوم کی گو تجھ میں کچھ باقی نہ تھی   پر نہ کی عرضِ ہنر میں تو نے اب بھی کوتاہی

اس برہنگی سے گذاری تیرھویں تو نے صدی   پھر گئی آنکھوں میں پھر تصویرِ دورِ اکبری

علم دین و شعر و حکمت طب و تاریخ و نجوم

ڈال دی پھر تو نے اپنی چار سو ہر فن میں دھوم

جن لوگوں نے انگلستان اور دوسرے مغربی ممالک کی ذہنی تاریخ کا مطالعہ کیا ہے وہ ریفارمیشن (Reformation یعنی اصلاح مذہب) اور ریناسینس (Renaisance یعنی حیات ثانی) کی دو تحریکوں سے واقف ہونگے۔ جنہوں نے سولھویں صدی میں وہاں نئی روح پھونک دی تھی۔ اور علمی اور مذہبی نقطۂ نظر سے ایک نئے دور کا آغاز کیا تھا۔ مرزا جس وقت دہلی آئے۔ یہاں بھی وہی حالات رُونما تھے۔ جنہوں نے دو صدیاں پہلے یورپ کی کایا پلٹ دی تھی۔ انگلستان میں چھاپہ خانہ کی ابتدا سولھویں صدی میں ہوئی۔ اور اس کے قائم ہونے کے بعد ہی علم صحیح معنوں میں عام ہونا شروع ہوا۔ دہلی میں چھاپے کے آغاز کا قریب قریب یہی زمانہ تھا۔ اور یہاں بھی اس سے اشاعت علم کو وہی فائدہ پہنچ رہا تھا۔ جو انگلستان میں ہوا۔ ریناسینس کا ایک اہم واقعہ بائبل کا انگریزی ترجمہ ہے۔ ابتدا میں جس کی بعد مخالفت ہوئی۔ اور جس کی وجہ سے وکلف اور اس کے ساتھیوں کو سخت ایذائیں پہنچائی گئیں۔ ہندوستان میں بھی قرآن مجید کا پہلا فارسی ترجمہ کرنے پر حضرت شاہ ولی اللہؒ کو ننگی تلواروں کا سامنا کرنا پڑا۔ مگر ان کی جرأت اور قابلیت سے ۱۷۳۷ء ہی میں ہندوستان میں وہ مرحلہ طے ہو گیا۔ جس کے لئے ترکی کو دو صدیاں اور انتظار کرنا پڑا۔ لیکن جس طرح مغربی "ریناسینس" کی ایک اہم خصوصیت عام ملکی زبانوں کی ابتدا تھی اسی طرح ہندوستان میں بھی فارسی اور عربی کی جگہ اردو

لے رہی تھی۔ اور چونکہ علما زمانے کی رفتار پہچانتے تھے اسلئے اردو نثر کی سب سے پہلی کتابوں میں قرآن مجید کا اردو ترجمہ تھا جسے حضرت شاہ ولی اللہؒ کے صاحبزادے شاہ رفیع الدین نے ۱۸۰۳ء میں دہلی سے شائع کیا۔ علاوہ ازیں جس طرح مغربی "رینائیسنس" کی ایک اور قابل ذکر بات درس و تدریس کا بلند معیار تھا۔ دہلی بھی اس زمانے میں اپنے معلموں اور مدرسوں کی وجہ سے شہرۂ آفاق تھی۔ بالخصوص شاہ عبدالعزیزؒ کی ذات والاصفات کی موجودگی سے جو اپنی سلامت روی۔ صحیح قوت فیصلہ اور علمی قابلیت کی وجہ سے مغربی "رینائیسنس" کی ایک قابل احترام ہستی ایرازمس (Erasmus) سے بہت مشابہ ہیں۔ اور جن کے درس کے لئے کشمیر۔ افغانستان اور بلخ و بخارا سے طلبا کھنچے آتے تھے۔ ان کے علمی تبحّر اور انصاف پسندی کے آگے سب سر جھکاتے تھے۔ اور اس میں کوئی شک نہیں۔ کہ نہ صرف وہ علم و فضل میں بے نظیر تھے۔ بلکہ زمانے کی نبض بھی خوب پہچانتے تھے۔ چنانچہ جب سرکار انگریزی نے دہلی کالج قائم کیا۔ اور لوگ وہاں اولاد بھیجنے کے متعلق متامّل تھے۔ تو شاہ صاحب نے بڑے زور سے وہاں تعلیم حاصل کرنے کی حمایت کی اور علیگڑھ کالج قائم ہونے سے کوئی پچاس سال پہلے مغربی اور سرکاری درس گاہوں میں تعلیم حاصل کرنے کے حق میں فتوٰی دیا۔[1]

جنرل سلیمن جو ٹھگی کے انسداد کی وجہ سے ہندوستان کی تاریخ میں ممتاز مرتبہ رکھتے ہیں۔ اور جنہیں ہندوستانیوں کے ساتھ ملنے جلنے کا اتفاق عام یورپین افسروں سے زیادہ ہوتا رہا۔ اس زمانے کی تعلیمی حالت کے متعلق لکھتے ہیں "دنیا میں ایسی قومیں بہت کم ہونگی۔ جن میں تعلیم اس قدر عام ہے جس قدر ہندوستان کے مسلمانوں میں۔ ان میں جو کوئی بیس روپیہ ماہوار کا متصدی ہوتا ہے وہ اپنے لڑکوں کو اسی طرح تعلیم دیتا ہے۔ جس طرح ایک وزیر اعظم اپنی اولاد کو۔ اور جو علوم ہمارے بچے لاطینی اور یونانی زبانوں میں اپنے کالجوں میں حاصل کرتے ہیں۔ وہی یہ لوگ عربی اور فارسی زبانوں میں سیکھتے ہیں۔ اور سات سال کے درس کے بعد ایک طالب علم اپنے سر پر جو آکسفورڈ کے فارغ التحصیل طالب علم کی طرح علم سے بھرا ہوتا ہے۔ دستارِ فضیلت باندھتا ہے اور اسی طرح روانی سے سقراط۔ ارسطو۔ افلاطون۔ بقراط۔ جالینوس اور بوعلی سینا پر گفتگو کر سکتا ہے۔ جس طرح آکسفورڈ کا کامیاب طالب علم"۔

---

[1] اسباب غدر مصنفہ سرسید

جنرل سیلمن نے ایک اور جگہ لکھا ہے "ایک تعلیم یافتہ مسلمان فلسفہ ادبیات اور دوسرے علوم و فنون پر قابلیت سے گفتگو کر سکتا ہے۔ اور بالعموم ان مضامین پر گفتگو کرنے اور موجودہ زمانے میں ان میں جو تبدیلیاں ہوئی ہیں۔ اُنہیں سمجھنے کا بہت خواہشمند ہوتا ہے"۔

ان سطور سے یہ تو واضح ہوتا ہے کہ شمالی ہندوستان کا نظام تعلیم اُس زمانے کے انگریزی نظام تعلیم سے یا آکسفورڈ کے موجودہ کلاسیکل کورس کے مقبول عام نصاب سے کسی طرح پست نہ تھا۔ اور اس کے علاوہ اگر درخت فقط اپنے پھل سے پہچانا جا سکتا ہے تو جیسا کہ ہم کہہ چکے ہیں جن معلموں کے حلقۂ درس سے سرسید۔ حالی۔ آزاد۔ داغ۔ شیفتہ (اور غالب!) دستارِ فضیلت باندھ کر نکلیں۔ وہ اپنے درس و تدریس پر جتنا بھی فخر کریں۔ کم ہے۔

اس عام علمی اور ادبی چہل پہل کے علاوہ ایک تحریک جس سے اس وقت دہلی کے گلی کوچے گونج رہے تھے۔ حضرت سید احمدؒ بریلوی اور شاہ اسمٰعیلؒ کی تحریک اصلاح تھی جسے سرسید احمدؒ نے لوتھر کی تحریک "ریفارمیشن" کے مشابہ قرار دیا ہے۔ اور حضرت بریلوی کے متعلق ڈاکٹر ہنٹر کے اعتراضات کا جواب دیتے ہوئے لکھا ہے۔ کہ جس طرح لوتھر نے یورپ کے بڑے حصے کو پوپ کی مذہبی غلامی سے نجات دلائی۔ اسی طرح یہ تحریک بھی تقلید اور ذہنی غلامی کی مخالفت میں تھی۔ اور سید احمدؒ بریلوی نے ان فضول اور مضر رسموں کے خلاف جو ابتدائے زمانہ سے ہندوستانی معاشرتی زندگی کا جزو ہو گئی تھیں۔ کوشش کر کے نہ صرف مذہبی بلکہ معاشرتی نقطۂ نظر سے بھی شمالی ہندوستان پر بڑا احسان کیا۔ ہمیں اس تحریک کے متعلق مفصل بحث کی ضرورت نہیں۔ لیکن غالب کا ماحول سمجھنے کیلئے اس کا تذکرہ ضروری ہے کیونکہ یہ وہ زمانہ تھا۔ جب دہلی میں تمام اہل الرائے یا اس تحریک کے طرفدار تھے۔ یا مخالف شاہ نصیر دہلوی نے جن کی مضحکہ خیز خوش اعتقادی کی کئی مثالیں آزاد نے "آب حیات" میں دی ہیں۔ اس تحریک کے خلاف نظمیں لکھیں۔ برخلاف اس کے مشہور شاعر مومنؔ مولینا سید احمد بریلوی کے مرید تھے۔ اور کلیات مومن کے کئی اشعار مولینا کی تعریف میں ہیں۔ غیر مقلدین کے سب سے نامور حامی شاہ اسمٰعیل شہید اور سرسید احمد خاں تھے۔ اور مقلدین کے پُرجوش ترجمان مولوی فضل حق۔ جو قدیم علم پرور خیرآبادی خاندان

کے رُکن اور غالب کے نہایت عزیز دوست تھے۔ مرزا نے بھی ان مباحثوں میں عملی دلچسپی لی اور ایک زمانے میں عقائدِ وہابیہ کے خلاف ایک فارسی مثنوی لکھی۔ لیکن جیسا کہ حالی نے یادگارِ غالب میں واضح کیا ہے ان کا اپنا نقطۂ نظر شاہ اسمٰعیل سے بہت ملتا تھا۔ اس مثنوی کے مطالب کافی اہم ہیں۔ لیکن اس سے بھی کہیں زیادہ اہم وہ ذہنی تطابق ہے۔ جو شاہ اسمٰعیل اور مرزا کے عام نقطۂ نظر میں تھا۔ شاہ صاحب کے مذہبی عقائد کیا ہوں لیکن آخر اُن کی تصانیف کا اہم ترین پہلو تقلید کے خلاف جہاد تھا۔ بیشک وہ قرآن شریف اور مستند احادیث کے قائل تھے۔ لیکن عوام جس کو اسلام سمجھتے تھے۔ وہ بانو رسوم و عقائد کا وہ طومار تھا۔ جو مقامی اثرات سے اسلام کا جزو بن گیا تھا۔ یا ائمۂ اربعہ کی کورانہ تقلید۔ شاہ اسمٰعیل ان میں کسی کے بھی قائل نہ تھے۔ اور جب ہم شاہ صاحب کی تصانیف پڑھتے ہیں تو خیال ہوتا ہے کہ جس آزادی اور جرأت سے وُہ رائے عامہ اور مسلمہ ہستیوں کی مخالفت کر رہے تھے۔ اور جس بے باکی سے صدیوں کے معبود بتوں کو گرا رہے تھے۔ ناممکن ہے کہ اس کا اثر غالب پر نہ ہُوا ہو[1]۔ اور اس کی طبعی آزاد خیالی اور راسخ نہ ہو گئی ہو۔ شاہ صاحب اور مرزا کے خیالات کی راہیں مختلف تھیں۔ لیکن جس طرح انہوں نے شاہ صاحب کو مذہب یا رسوم و معاشرت میں تقلید کی مخالفت کرتے دیکھا۔ اسی طرح خود فن لغت اور فن شعر گوئی میں اسنادوں پر آزادانہ نکتہ چینی کی۔ اور جس طرح شاہ صاحب بڑے بڑے بزرگوں کے نام گنا کر کہتے تھے۔ کہ آخر وُہ انسان تھے۔ اور غلطی کر سکتے تھے۔ اسی انداز سے غالب نے بھی کہا کہ اگلے جو کچھ کہہ گئے وہ سب سچ نہیں۔ اور ہر پرانی لکیر صراط مستقیم نہیں ہوتی ؎

ان دونوں تحریکوں کا جو اثر مرزا پر ہُوا ہو گا۔ وہ تو بیشتر ذہنی ہے۔ لیکن دہلی آنے سے جو اثر ان کی شاعری پر ہُوا۔ وہ سب سے زیادہ نمایاں ہے۔ آگرے میں شعرا اور شعر فہم حضرات کی وہ کثرت نہ تھی۔ جو دہلی میں تھی۔ اور غالب کے عجیب و غریب اشعار پر جب یہ لوگ معترض ہونے۔ تو وہ انہیں

---

[1] مولینا شہیدؒ نے اسی زمانے کی ایک اور عظیم المرتبہ شخصیت پر اثر ڈالا۔ حالی سرسیّد کے ابتدائی ایام کا ذکر کرتے ہُوئے لکھتے ہیں: "مولینا اسمٰعیل شہید نے ان کے خیالات کی اور زیادہ اصلاح کی۔ اور انہیں کسی قدر تقلید کی بندشوں سے آزاد کیا۔"

خاطر میں نہ لاتے۔ چنانچہ انہوں نے آگرے میں ایک رُباعی لکھی تھی ؎

مشکل ہے زبس کلام میرا اے دل
سُن سُن کے اسے ملول ہوتے ہیں جاہل
آسان کہنے کی کرتے ہیں فرمائش
گویم مشکل وگرنہ گویم مشکل

لیکن جب مرزا دہلی آئے۔ اور مولینا فضل حق اور دوسرے مسلّمہ اُستادوں نے انہیں ان اشعار کے حُسن و قبح سے آگاہ کیا۔ تو مرزا کو ان کے علم و فضل کے آگے سر جھکانا پڑا۔ اور جس طرح مندرجہ بالا رُباعی کا دوسرا مصرع تبدیل کیا۔ اور اپنے معترضوں کو بجائے "جاہل" کے "سخنوران کامل" کہا۔ اسی طرح اپنی شاعری کا رُخ بدلا۔ دیوان ریختہ کا انتخاب بھی شائد انہی کی خواہش پر ہوا[1] اور اگرچہ انتخاب کرتے وقت بعض بلند پایہ اشعار رہ گئے ہیں۔ پھر بھی بحیثیت مجموعی یہ انتخاب ذوقِ سلیم کا ثبوت ہے۔ اور حقیقت یہ ہے کہ اگر دیوان غالب تمام کا تمام شایع ہو جاتا۔ تو خدشہ تھا۔ کہ جہاں اتنے سیپ اور کوڑیاں تھیں۔ وہاں سچّے موتی بھی نظر سے پنہاں ہو جاتے:

مرزا کے اس زمانے کے احباب کے متعلق ہمیں پوری واقفیت نہیں۔ لیکن ان کی شادی نواب مرزا الٰہی بخش معروف کی صاحبزادی سے ہوئی تھی۔ جو شعر کے بڑے دلدادہ تھے۔ اور جن کے اکثر شعراء سے مربیانہ تعلقات تھے۔ اس لئے یقین ہے کہ مرزا بھی دہلی کے سب بڑے بڑے شعرا کی صحبت سے فیضیاب ہوئے ہونگے۔ معروف ذوقؔ کے شاگرد تھے۔ اور زبان میں صفائی اور روزمرہ کے بڑے مداح تھے۔ ظاہر ہے کہ انہیں مرزا کی شاعری بہت پسند نہ ہوگی لیکن یہ بھی قرین قیاس ہے کہ ان کی صحبت کے زیر اثر زبان کی صفائی کی طرف مرزا زیادہ متوجہ ہوئے ہونگے۔ معروف خود بھی شاعر تھے۔ نئی نئی زمین نکالتے۔ اور ان میں شعر کہتے اور کہلواتے چنانچہ

---

[1] آزاد کا بیان ہے۔ کہ یہ انتخاب مولینا فضل حق اور مرزا خاں کوتوال دہلی نے کیا۔ مرزا کے اپنے بیانات اور معاصرانہ تذکروں (مثلاً گلشن بیخار) سے خیال ہوتا ہے۔ کہ یہ انتخاب خود مرزا نے کیا۔ غالباً یہ خیال درست ہے۔ لیکن مرزا کے ابتدائی اور بعد کے طرز شاعری میں اتنا نمایاں فرق ہے۔ کہ یہ بیان بعید از قیاس معلوم نہیں ہوتا۔ کہ مرزا کی شاعری میں جو عظیم الشان تبدیلی ہوئی۔ اُس میں کسی خارجی رہنمائی کو بھی دخل تھا۔ اور بقول مرزا انہوں نے اپنا طرز خاص اسلئے ترک کیا کہ اسے "میاروں نے چلنے نہ دیا" (جلوۂ خضر)

مرزا کی وہ غزل جس کا حسب ذیل شعر مشہور ہے ؎

پلا دے اوک سے ساقی جو ہم سے نفرت ہے
پیالہ گر نہیں دیتا۔ نہ دے، شراب تو دے

انہی کی نکالی ہوئی زمین میں ہے۔ اور اس میں غالب کے علاوہ دہلی کے اور مشہور شعرا نے بھی طبع آزمائی کی۔

ہرمزد کے متعلق ہم لکھ چکے ہیں کہ مرزا دہلی آئے تو وہ ہمرکاب تھا۔ اس کی صحبت سے مرزا کو فارسی زبان میں وہ ملکہ حاصل ہو گیا جو عموماً اہل زبان کا حصہ ہوتا ہے۔ اور جس طرح عام ایرانی ہندوستانیوں کی فارسی کو خاطر میں نہیں لاتے۔ مرزا بھی شروع ہی سے "ہندی زبانانِ فارسی نویس" کو حقارت کی نظر سے دیکھنے لگے۔ اس کے علاوہ ہرمزد کی وجہ سے پارسیوں کے عقائد سے بھی مرزا کی واقفیت بڑھ گئی۔ اور مذہب کے متعلق عام طور پر ایک آزاد خیالی پیدا ہو گئی۔ ہرمزد کے عقائد کے متعلق ہمیں پوری خبر نہیں۔ لیکن عجب نہیں کہ وہ شیعہ ہو۔ اور اپنے خاندان کے طریقے کو چھوڑ کر مرزا کا شیعہ ہونا اسی کے زیر اثر ہو۔

دہلی آنے کے بعد غالب کی شاعری میں جو نمایاں تبدیلی ہوئی۔ اس کی ایک اہم وجہ ہندوستان کے فارسی شعرا کا غائر مطالعہ اور ان کی تقلید ہے۔ اور حقیقت یہ ہے۔ کہ مرزا کی شاعری کا صحیح اندازہ اسی صورت میں ہو سکتا ہے۔ جب بجائے میر اور سودا کے انہیں بیدل اور عرفی کا جانشین سمجھا جائے۔ بیشک انہوں نے اردو شعر لکھے۔ لیکن کسی اردو شاعر کی پیروی نہیں کی۔ بلکہ اردو میں بھی پہلے بیدل اور بعد میں عرفی و نظیری کی طرز میں اشعار لکھے۔ وہ میر کے مداح تھے۔ لیکن میر کی غزلوں پر بھی انہوں نے جو غزلیں کہی ہیں۔ وہ میر نہیں بلکہ بیدل کے رنگ میں ہیں۔ اور اگرچہ ان کے اس زمانے کے اشعار کی زبان اردو ہے۔ لیکن مضمون اور زبان کی تمام خصوصیات فارسی شاعری کی ہیں۔ مرزا اپنے اردو اور فارسی کلام میں وہ حدِ فاصل نہیں رکھتے تھے۔ جو اس زمانے میں فارسی سے عوام کی ناواقفیت کی وجہ سے ہو گئی ہے۔ وہ کلی

رعنا کے دیباچے میں لکھتے ہیں کہ انہوں نے اردو اشعار کے لکھنے میں بھی وہی طریقہ اختیار کیا۔ جو فارسی اشعار کے لکھنے میں کیا تھا۔ انکی شاعری بقول ان کے ایک باغ کی طرح ہے۔ جس کے دو دروازے ہیں ایک اُردو اور ایک فارسی۔ اور مرزا کے مقابلے میں باقی اُردو شعرا کے کلام کی پستی کی ایک وجہ یہ بھی ہے۔ کہ ان شعرا کی نظروں سے آگئے نہ جاتی تھی۔ اور ان کے کلام میں مضامین کی وہ شادابی اور تنوع نہیں۔ جو مرزا کے کلام میں ہے۔ اور جن کی روایات کا سلسلہ حزیں۔ بیدل ظہوری عرفی اور نظیری کے واسطے سے امیر خسرو تک پہنچتا ہے۔ مرزا نے آغاز بیدل کے رنگ میں کیا۔ لیکن جب انہوں نے فارسی شاعری کا زیادہ مطالعہ کیا۔ اور "شیخ علی حزیں نے مسکرا کر ان کی بیراہ روی انہیں جتائی۔ اور طالب آملی اور عرفی شیرازی کی غضب آلود نگاہ نے آوارہ اور مطلق العنان پھرنے کا جو مادہ تھا۔ فنا کر دیا۔ اور نظیری نے اپنی خاص روش پر چلنا سکھایا۔" تو ان کے کلام میں ان شعرا کی خصوصیات زیادہ آگئیں۔ اور وہ تشبیہوں کی غرابت اور پیچیدہ تراکیب کے اس سراب سے بچ نکلے۔ جس میں بیدل کی شعریت فنا ہوئی تھی۔ جیسا کہ ہم اس کتاب کے دوسرے حصے میں دکھلائینگے۔ مرزا کے کلام کی سب سے بڑی خصوصیت انسانی فطرت کی واقفیت ہے۔ جو اُردو کے اور شعرا میں نہیں۔ لیکن آخر مرزا کا نفسیاتی تعمق اکبری شعرا کی وہی معاملہ بندی ہے۔ جو عرفی اور دوسرے شعرا میں تو محبت کے چند پہلوؤں تک محدود تھی۔ لیکن جسے مرزا نے وسعت دیکر تمام انسانی فطرت کا مطالعہ بنا دیا ہے۔ مرزا کو دہلی آنے سے پہلے ہی فارسی شاعری سے لگاؤ تھا۔ لیکن فارسی کا کلام پڑھنے اور سمجھنے کا زیادہ موقعہ انہیں یہاں آنے کے بعد ہی ملا ہوگا۔ اور ہمارے خیال میں ان کی شاعری پر خارجی اثرات میں سب سے اہم فارسی شعرا کا مطالعہ اور ان کی پیروی ہے +

اس کے علاوہ مرزا کی شاعری میں جو انقلاب آیا۔ وہ بڑی حد تک اس انقلاب کا عکس تھا جو مرزا کی ذہنی گہرائیوں میں وقوع پذیر ہو رہا تھا۔ اس زمانے میں مرزا کی طبعی انفرادیت بہت کم ہو گئی تھی۔ عنفوان شباب میں انسان اپنے تئیں دُنیا کا مرکز سمجھتا ہے۔ اور یہ خیال کرتا ہے۔

کہ میری رائے اور پسند کے آگے سب کو سر جھکانا پڑے گا۔ مرزا کی طبیعت میں یہ رجحان جیسا کہ ان کے خاص طرز شاعری دیا ان کے بھائی کی علالت سے بھی) خیال کیا جا سکتا ہے۔ عوام سے بہت زیادہ تھا۔ اور بقول ایڈلر اس انتہائی انفرادیت کے دو ہی نتیجے ہو سکتے ہیں کہ یا تو انسان قناعت اور خودداری کو حد سے بڑھا کر اور اپنے سوا باقی سب کو جاہل اور ہوش سے عاری سمجھ کر سوسائٹی سے اس طرح بیگانہ ہو جائے کہ سوسائٹی کے نزدیک وہ اپنا دماغی توازن کھو بیٹھے اور یا دوسروں کے نقطۂ نظر کو سمجھتے ہوئے اپنی انفرادیت کو ان حدود میں رکھے۔ کہ اپنا امتیازی رنگ بھی قائم رہے اور دوسروں کے نزدیک سڑی پن بھی نہ ہو۔ یہ اردو ادب کی خوش قسمتی تھی۔ کہ مرزا کے طبعی رجحانات پر ان کی عقل سلیم غالب آئی۔ اور خوش قسمتی سے ایسے دوست میسر آئے۔ جن کی صحبت نے ان کی بے قاعدگیاں ہموار کر دیں۔ شخصی انفرادیت مٹانے اور مناسب حس تناسب سکھانے کے لئے سوسائٹی کا سب سے بڑا حربہ ظرافت ہے۔ جسے کنج تنہائی سے بزم احباب زیادہ راس آتی ہے۔ اور جب مرزا کا حلقۂ احباب وسیع ہو گیا۔ اور ساتھ ساتھ مشاہدے اور تجربے سے طبیعت کی زود حسی کم ہوئی۔ تو اُن کی انفرادیت بھی خوشگوار حدود میں آ گئی۔ اور عجیب و غریب خیالات اور طبیعت کی یبوست کی جگہ خوشگوار خیالات اور ظرافت نے لے لی۔

بابِ سوم

لکھنؤ۔ کلکتہ

دیوان غالب کا بھوپالی نسخہ ۱۸۲۱ء میں یعنی اس وقت مرتب ہوا۔ جب غالب آلام دنیا سے بالکل آزاد تھے۔ غالب اس وقت نواب احمد بخش کے ساتھ رہتے تھے۔ نواب احمد بخش ریاست الور کے وکیل تھے۔ اور انہوں نے مرہٹوں کے خلاف لارڈ لیک کو ریاست کی طرف سے مدد دی تھی۔ ۱۸۰۶ء میں لارڈ موصوف نے ان خدمات کے عوض میں انہیں فیروز پور جھرکا کا علاقہ جو اب ضلع گڑگاؤں کا حصہ ہے۔ تفویض کیا تھا۔ نواب نے مہاراجگان الور اور سرکار انگریزی کے درمیان تعلقات قائم کرنے میں بھی بہت حصہ لیا تھا۔ اور مہاراجہ الور نے ان خدمات کے صلے میں پرگنہ لوہارو انہیں بخش دیا تھا۔ نواب کی جائداد کافی تھی۔ اور جس طرح بڑے گھروں میں بہت سے متعلقین آسانی سے بسر اوقات کرتے ہیں۔ نواب کے برادرزادہ مرزا علی بخش اور غالب نواب کے ساتھ گاہے گاہے مقیم رہتے۔ اور جب انگریزی فوج نے دسمبر ۱۸۲۵ء میں مہاراجہ بھرتپور کے خلاف چڑھائی کی۔ تو غالب اور مرزا علی بخش بھی نواب کے ہمرکاب تھے[1]۔ غالب کی نثر کی سب سے پہلی تصنیف اسی زمانے کی یادگار ہے؎

---

[1] کلیات نثر غالب صفحہ ۲۰۔ لیکن مرزا غالباً بہت دیر تک نواب کے ساتھ نہیں رہے۔ بھرتپور کی فتح کے بعد ۲ فروری ۱۸۲۶ء کو انگریزی فوج نے مہاراجہ الور اور نواب احمد بخش کا قضیہ چکانے کے لئے الور کا کوچ کیا۔ لیکن یہی زمانہ تھا۔ جب مرزا نواب سے مدد کیلئے فیروز پور جھرکا گئے ہوئے تھے (کلیات نثر غالب صفحہ ۱۵۶)

مرزا علی بخش نے جو غالب کی بیوی کے بھائی بھی تھے۔ غالب سے استدعا کی۔ کہ فارسی خط و کتابت کے قواعد اور القاب خیریت وغیرہ کے موزوں فقرے ایک جگہ جمع کر دیں۔ چنانچہ مرزا نے ایک مختصر رسالے میں جو ان کی کلیات نثر فارسی میں موجود ہے۔ فارسی مکتوب نویسی کے قواعد جمع کئے ہیں۔ یہ رسالہ صاف اور سلیس زبان میں لکھا ہوا ہے۔ اور اس کے دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ خط و کتابت کا جو نفیس اسلوب انہوں نے تیس برس بعد اردو زبان میں اختیار کیا (اور جس سے ان کے فارسی خطوط بیشتر عاری ہیں) اس وقت بھی انہیں پسند خاطر تھا۔ وہ اس رسالے میں لکھتے ہیں :-

"مکتوب الیہ را بلفظیکہ فراخور حال اوست آوازہ دہم و زمزمہ سنج مدعا گردم۔ القاب و آداب گوئی و خیریت گوئی و عافیت جوئی حشو زائد است۔ و پختگان حشو را وضع نہند نامہ نگار را باید۔ کہ نگارش را از گذارش دور تر نبردہ منشتن را رنگ گفتن دہد"۔ فارسی زبان میں انہوں نے بہت حد تک رواج عام کی پیروی کی ہے۔ لیکن اردو رقعات میں مندرجہ بالا اصولوں پر پوری طرح عمل کیا ہے۔ اور بقول اپنے "مراسلہ کو مکالمہ بنا دیا۔ دور سے بیٹھے بزبان قلم باتیں کیا کیجئے"۔

اس رسالے سے یہ بھی پتہ چلتا ہے۔ کہ ہندوستانی فارسی نویسوں کی زباندانی سے جو نفرت انہیں تمام عمر رہی۔ اور جس نے بعض اوقات تلخ بحث کا رنگ اختیار کر لیا۔ اس وقت بھی موجود تھی۔ چنانچہ وہ فارسی لکھنے والے کو ہدایت کرتے ہیں۔ "اندازہ خوبی زبان نگاہدارد و این پارسی آمیختہ بتازی را در کشاکش تصرفات ہندی زبانان پارسی نویس ضایع نگرداند"۔

بھرتپور کا محاصرہ اخیر ۱۸۲۵ء میں ہوا۔ اگرچہ اس زمانے کی تصنیفات سے غالب کی جائداد کے جھگڑوں کے متعلق کوئی اطلاع نہیں ملتی لیکن غالباً ان کی ابتدا اسی زمانے میں ہو گئی تھی۔ نواب احمد بخش کے تین صاحبزادے تھے۔ نواب امین الدین۔ نواب ضیاء الدین نیر و رخشاں جو غالب کے شاگرد اور عزیز دوست تھے۔ اور ان دونوں کے سوتیلے بھائی اور مشہور شاعر داغ کے والد نواب شمس الدین۔

نواب احمد بخش نے ۱۸۲۲ء میں سرکار انگریزی اور مہاراجہ الور کی اجازت سے نواب شمس الدین کو تمام جائداد کا وارث قرار دیا تھا۔ لیکن اس فیصلے سے سب بھائی خوش نہ تھے اسلئے اسمیں بعد کو کچھ

ترمیم بھی ہوئی۔ اور فروری ۱۸۲۵ء میں اپنے والد کے مشورے سے نواب شمس الدین نے پرگنہ لوہارو چند شرطوں کے ماتحت اپنے دو بھائیوں کے نام منتقل کر دیا۔ اور بالآخر اکتوبر ۱۸۲۶ء میں جائیداد کا انتظام اپنے ہاتھوں میں لیا۔

چونکہ مرزا کی جاگیر بھی نواب احمد بخش کی جاگیر میں شامل ہو گئی تھی اسلئے ظاہر ہے کہ مرزا کو بھی اپنی حق تلفی کا خیال اسی زمانے میں پیدا ہوا ہوگا۔ جب نواب احمد بخش نے جاگیر کے متعلق آخری فیصلہ کیا۔ مرزا کو جاگیر اپنے چچا مرزا نصر اللہ خاں بہادر کے وارث ہونے کی وجہ سے ملی تھی۔ جو پہلے مرہٹوں کی طرف سے اکبر آباد کے صوبہ دار تھے۔ اور جب لارڈ لیک کی عملداری ہوئی۔ تو چار سو سواروں کے رسالدار مقرر ہوئے۔ انہیں اس کے صلے میں علاوہ ذاتی زر معاوضہ کے معقول جائداد حین حیات ملی تھی لیکن ایک سال کے بعد ہی ان کا انتقال ہو گیا۔ ان کی وفات پر ان کی جاگیر نواب احمد بخش کی جاگیر میں شامل ہو گئی اور نواب نے اس کے عوض ان کے ورثا کو پنشن دینا قبول کیا۔ مرزا نصر اللہ کی اولاد کوئی نہ تھی۔ اور اُن کے وارث مرزا غالب، مرزا یوسف اور مرزا نصر اللہ کی ماں اور بہنیں تھیں۔ مرزا غالب کا دعویٰ تھا کہ ان کے اپنے اور شرکائے حقیقی کیلئے دس ہزار روپیہ سالانہ پنشن مقرر ہوئی تھی۔ لیکن نواب فقط تین ہزار دیتے تھے۔ جن میں خاص مرزا کا اپنا حصہ فقط ساڑھے سات سو روپیہ تھا۔ شروع میں تو نواب سے ان کے بہت اچھے تعلقات تھے۔ اور نواب ان کی مدد اور خبر گیری کرتے رہے۔ لیکن ۱۸۲۶ء کے قریب اختلافات رونما ہوئے۔ مرزا کے خسر نواب الٰہی بخش معروف جو نواب کے بھائی تھے۔ اسی سال فوت ہوئے۔ اور ممکن ہے ان کی وفات کے بعد نواب سے مرزا کے تعلقات کمزور ہو گئے ہوں۔ مرزا کی عمر اس وقت بیس انتیس سال کی تھی۔ اور تمام عمر عیش و عشرت کا عادی رہنے کے بعد اب عیش و مسرت کا سر چشمہ خشک ہوتا نظر آتا تھا۔ اس کے علاوہ جن لوگوں نے ابتدائی توقعات کی بنا پر قرضے دیئے تھے۔ وہ اب مختصر پنشن دیکھ کر تقاضے کر رہے تھے۔ اور سب سے بڑا صدمہ اس موقعہ پر یہ ہوا کہ ان کا چھوٹا بھائی مرزا یوسف دیوانہ ہو گیا۔

غالب کی حساس طبیعت کے لئے ذریعۂ معاش کی تنگی۔ بھائی کی بیماری قرضخواہوں کے تقاضے

اور دوسری مصیبتیں ناقابلِ برداشت تھیں۔ دوستوں نے مشورہ دیا۔ کہ نواب کی خدمت میں جا کر ساہوکاروں کے تقاضوں[1] اور اپنی مصیبتوں کا حال کہو۔ ممکن ہے وہ مدد کرے۔ چنانچہ مرزا دہلی سے فیروزپور جھرکا گئے۔ نواب ان دنوں اور اپنی پریشانیوں میں گرفتار تھا۔ اس لئے مرزا کو فیروزپور جھرکا رکنا پڑا۔ یہاں سے انہوں نے جو خطوط اپنے شاگرد منشی جواہر سنگھ کے والد رائے چھجمل کھتری کے نام لکھے ہیں۔ ان سے ان کی مصیبتوں کا پتہ چلتا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:۔

"چہ نالہ ہا کہ از بیم رسوائی از دل نا بہ زباں نرسیدہ خون میگردد و چہ خونہا کہ از دو دبیکسی کسوتِ اشک پوشیدہ از چشم بیروں میرود۔ چارۂ رنج بیدلی معدوم و پایانِ کار نا معلوم است۔ پیدا است کہ از قفس بدام افتادہ را چہ حال خواہد بود" اس کے بعد نواب کے انتظار میں جو بیقراریاں ہوئی ہیں۔ ان کا ذکر کر کے لکھا ہے "ہر چند در وطن نیم اما قربِ وطن نیز قیامت است۔ ہنوز با اہلِ کاشانہ راہِ نامہ و پیام است۔ ہر چہ دیدہ میشد آشوبِ چشم بود ہر چہ شنیدہ میشود زحمتِ گوش است۔ نیم جانے کہ ازاں ورطہ بیروں آوردہ ام ودیعتِ خاکِ فیروزپور است۔ کہ مرا ایں اقامتِ اضطراری اتفاق افتاد" آخر جب خدا خدا کر کے نواب الور کے قضیوں سے فارغ ہوا۔ اور فیروزپور واپس آیا تو معلوم ہوا کہ دوستوں کے مشورے سے امیدوں کے جو قلعے بنائے ہوئے تھے۔ ان کی بنیاد ریت پر ہے۔ اور نواب سے کسی طرح کی توقع رکھنا عبث ہے۔ چنانچہ بقولِ غالب "نواب صاحب مرا بہ لطفِ زبانی فریفتند و بکرشمۂ سنجے کہ بالتفات می مانست از راہ بردند" چنانچہ مرزا کو دہلی ناکام واپس لوٹنا پڑا۔

مرزا کو جب نواب کی طرف سے قطعی مایوسی ہوئی۔ تو انہوں نے نواب کی تقسیم کے خلاف کلکتہ میں اپیل کرنے کا ارادہ کیا۔ بقولِ حالی ریذیڈنٹ دہلی نے انہیں کامیابی کی امید بھی دلائی چنانچہ وہ تیس برس کے ہونگے۔ جب اس دور دراز سفر کے لئے گھر سے روانہ ہوئے۔

---

[1] مرزا نے اس زمانے میں مولینا فضل حق کے نام صنعت تعطیل میں جو خط لکھا تھا۔ اس سے اس سفر کے مقصد پر روشنی پڑتی ہے۔ (کلیات نثر غالب صفحہ ۶۳۲-۶۴)

مرزا دہلی سے کب روانہ ہوئے - اس کی صحیح تاریخ تو معلوم نہیں - لیکن دہلی سے وہ لکھنؤ گئے - اور وہاں سے ان کی تاریخ روانگی ۲۷ رجون ۱۸۲۷ء یا ۲۶ ذیقعد ۱۲۴۲ھ ہے - لکھنؤ میں غالب نے کافی عرصے تک قیام کیا - اور اگر اس فارسی نثر کی تاریخ تحریر کو جو انہوں نے وزیر اودھ کی تعریف میں لکھی تھی - صحیح سمجھا جائے - تو یہ ماننا پڑے گا - کہ کم از کم "دوم محرم الحرام"۱؎ سے "۲۶ ذیقعد" تک یعنی قریباً ۱۱ مہینے وہ لکھنؤ مقیم رہے:

مرزا جب لکھنؤ پہنچے تو وہاں غازی الدین حیدر بادشاہ تھے - اپنے والد نواب سعادت علیخاں کی وفات کے پانچ سال بعد تک وہ نواب وزیر ہی کہلاتے رہے - لیکن جب ۱۸۱۸ء میں لارڈ ہیسٹنگز نے نظام حیدر آباد اور نواب وزیر اودھ کو بادشاہ کا خطاب اختیار کرنے کا مشورہ دیا (اور نظام نے مغلیہ بادشاہ کے احترام کے خیال سے نہ مانا) تو غازی الدین حیدر نے اپنے بادشاہ ہونے کا اعلان کر دیا - اور سال ۱۸۱۹ء میں بڑی دھوم دھام سے ان کی تخت نشینی کی تقریب ہوئی - جس کی ناسخ نے تاریخ کہی - ع "بگو ناسخ کہ ظل اللہ گردید" - انہیں شعر سے تھوڑی بہت دلچسپی ضرور تھی - چنانچہ مشہور ہے کہ انہوں نے ناسخ کو ملک الشعرا کا خطاب دیکر اپنے دربار سے متعلق کرنا چاہا لیکن ناسخ نے یہ کہکر خطاب واپس کر دیا کہ غازی الدین کو نہ تو شاہانِ دہلی کا مرتبہ حاصل ہے اور نہ سرکار انگریزی کا زور و اقتدار:

جب مرزا لکھنؤ پہنچے - تو بادشاہ کی خدمت میں باریابی کے لئے نائب السلطنت کی مدد کی ضرورت تھی - نائب السلطنت اس وقت معتمد الدولہ آغا میر تھے - جنہوں نے ملازمت کا آغاز بطور ایک خدمتگار کے کیا تھا - لیکن نواب بیگم اور ریذیڈنٹ کی مدد سے بادشاہ پر اس قدر اقتدار حاصل کر لیا تھا - کہ اب وہ سلطنت کے سیاہ و سفید کے مالک تھے - جیسا کہ غالب کے خطوں سے پتہ چلتا ہے - ان کی نیابت تاریخ اودھ کا ایک نہایت تاریک باب ہے - لیکن معلوم ہوتا ہے

۱؎ اس صورت میں مرزا دوم محرم ۱۲۴۲ھ یعنی اگست ۱۸۲۶ء سے پہلے دہلی سے روانہ ہو چکے ہونگے:

کہ انہیں بھی شعر گوئی سے تھوڑی بہت دلچسپی ضرور تھی۔ اور (شاید اپنے مد مقابل حکیم مہدی کی ضد سے) وہ ناسخ کے مربی گنے جاتے تھے۔ چنانچہ مرزا نے بھی ان کی خدمت میں پیش کرنے کے لئے ایک مدحیہ نثر صنعتِ تعطیل میں لکھی۔ لیکن اس نثر کے پیش کرنے کی نوبت نہ آئی وجہ اس کی یہ تھی۔ کہ ملاقات کے لئے نائب نے جو شرطیں پیش کیں۔ انہیں مرزا باعث شرم اور خودداری کے خلاف سمجھتے تھے چنانچہ غالب ایک خط میں لکھتے ہیں "آنچہ در باب ملازمت قرار یافت۔ خلاف آئین خویشتن داری و ننگ شیوہ خاکساری بود"

مرزا بقول اپنے اس وقت "نو آموز شیوۂ گدائی" تھے۔ اور شاہانِ اودھ کی تعریف میں سب سے پہلے جو قصیدہ انہوں نے لکھا ہے۔ اس میں بھی بار بار اس امر کی طرف اشارہ ہے ؎

نازپروردۂ خلوت گہہ آزادگیم کافرم گر بسراپردۂ سلطان رفتم

من ہم از خیلِ گدایانم و خجلت نبود

گر بدریوزہ بدرگاہِ کریمان رفتم

اس قصیدے میں جس کی زبان بہت صاف ہے۔ مرزا نے اپنی مصیبتوں اور دہلی سے لکھنؤ جانے کی دردناک داستاں لکھی ہے ؎

چہرہ اندودہ بگرد و مژہ آغشتہ بخوں خود گواہم کہ ز دہلی بہ چہ عنواں رفتم

اضطرار آئینہ پرداز جلائے وطنست نہ بدل رفتم از آں بقعہ بل از جاں رفتم

ہم جگر تفتہ زکیں خواہیٔ اغیار شدم ہم دلِ آزردہ ز بے مہریٔ خویشاں رفتم

ایمن از فتنۂ عیاریٔ عیارانم باچنیں تجربہ کز یاریٔ یاراں رفتم

منت از خویش بہ اندازۂ طاقت دارم

کہ بدیں بارِ الم ہائے فراواں رفتم

لہ مرزا نے یہ قصیدہ دہلی سے پہلے شاہ اودھ کے وکیل راجہ صاحب رام اور پھر منشی محمد حسن کے پاس اسلئے بھیجا کہ وہ اسے ضرور اودھ تک پہنچائیں۔ اور وزیر اسے بادشاہ کی خدمت میں پیش کرے۔ مرزا نے اسکے ساتھ منشی محمد حسن کو ایک خط لکھا ہے جسمیں وہ لکھتے ہیں "بو کہ مرا بجائزۂ بادخوانی وصلۂ مدح گستری اینما یہ سامان فرزانہ آید۔ کہ خود را گرد آورده بگلکتہ توانم رو و کارے توانم کرد" اس خط میں تاریخ کتابت یا بادشاہ یا وزیر کا نام درج نہیں اسلئے یہ فیصلہ کرنا مشکل ہے کہ یہ قصیدہ لکھنؤ کب بھیجا گیا۔ اور کیا شروع سے ہی اس میں نصیر الدین حیدر اور روشن الدولہ کا نام تھا۔ یا پہلے ... سے نصیر الدین کے دربار میں پیش کیا گیا*

غالب لکھنؤ سے ۲۷ر جون ۱۸۲۷ء کو روانہ ہوئے اور ۱۹ر اکتوبر ۱۸۲۷ء کو غازی الدین حیدر کا انتقال ہو گیا۔ اور ان کی جگہ نصیر الدین حیدر جو اُن کے بیٹے کہلاتے تھے۔ تخت نشین ہوئے۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس کے سات آٹھ سال بعد جب روشن الدولہ نائب السلطنت تھے۔ تو منشی محمد حسن اور روشن الدولہ کی وساطت سے یہ قصیدہ بادشاہ کے دربار میں پڑھا گیا۔ اور وہاں سے پانچ ہزار روپیہ دینے کا حکم ہوا۔ لیکن بقول ناسخ اس میں سے تین ہزار نواب روشن الدولہ نے کھائے۔ دو ہزار متوسط یعنی منشی محمد حسن نے اور غالب بیچارے کو پانچ روپے بھی نہ ملے۔

حالی نے مرزا کے قیام لکھنؤ کی نسبت ایک آدھ لطیفہ لکھا ہے اس سے زیادہ اس قیام کی نسبت ہمیں بہت واقفیت نہیں۔ ناسخ سے ان کے تعلقات دوستانہ تھے۔ لیکن چونکہ اس نے بادشاہ کا خطاب حقارت سے ٹھکرا دیا تھا۔ وہ ان دنوں بادشاہ کے زیر عتاب تھا۔ اور اس زمانے میں لکھنؤ سے باہر تھا۔ ورنہ قرین قیاس ہے کہ (اگر غالب سے اس کے تعلقات بعد کے نہیں تو) وہ آغا میر کے پاس رسائی میں مفید ہوتا۔

مرزا نے قیام کلکتہ کے دوران میں فارسی اشعار اُردو اشعار سے کہیں زیادہ لکھے ہیں۔ اس سے اور مرزا کی بعض تحریروں سے خیال ہوتا ہے۔ کہ وہ اس زمانے میں اُردو شعر نسبتاً کم لکھتے تھے۔ لیکن لکھنؤ میں فارسی کا قدردان کوئی نہ تھا۔ اس لئے قرین قیاس ہے۔ کہ اس جگہ انہوں نے اُردو اشعار زیادہ لکھے ہونگے۔ یہ غزل تو یقیناً قیام لکھنؤ کی یادگار ہے۔

وان پہنچ کر جو غش آتا پئے ہم ہے ہم کو
صد رہ آہنگِ زمیں بوسِ قدم ہے ہم کو

پہلے اس غزل کے آخر میں ذیل کے قطعہ بند اشعار تھے۔

لکھنؤ آنے کا باعث نہیں کھلتا غالب
ہوسِ سیر و تماشا، سو وہ کم ہے ہم کو
طاقتِ رنجِ سفر ہی نہیں پاتے اتنی

ہجرِ یارانِ وطن کا بھی الم ہے ہم کو
لائی ہے معتمد الدولہ بہادر کی اُمید
جادۂ رہ کششِ کافِ کرم ہے ہم کو

جب معتمد الدولہ کی طرف سے مرزا کو مایوسی ہوئی۔ تو انھوں نے قطعہ مندرجہ بالا کو بدل کر ذیل کا قطعہ درج دیوان کیا ہے

لکھنؤ آنے کا باعث نہیں کھلتا یعنی
ہوسِ سیر و تماشا، سو وہ کم ہے ہم کو
مقطعِ سلسلۂ شوق نہیں ہے یہ شہر
عزمِ سیرِ نجف و طوفِ حرم ہے ہم کو
لئے جاتی ہے کہیں ایک توقع غالبؔ
جادۂ رہ کششِ کافِ کرم ہے ہم کو

مرزا ۲۶ ذیقعدہ یعنی ۲۷ جون ۱۸۲۷ء کو بروز جمعہ لکھنؤ سے روانہ ہوئے۔ اور تین روز میں کان پور پہنچے۔ وہاں سے باندہ گئے۔ جہاں مولوی محمد علی صدر امین نے باوجودیکہ مرزا سے پہلے تعارف نہ تھا۔ ان سے بڑا نیک سلوک کیا۔ قیام باندہ میں انہیں آرام سے رکھا۔ اور کلکتہ کے بارسوخ آدمیوں کے نام تعارفی خطوط بھی دیئے۔ مرزا کا قیام باندہ اس لئے بھی دلچسپ ہے۔ کہ انہوں نے یہاں سے چند غزلیں اپنے کسی دوست کو بھیجیں۔ جو قلمی نسخہ دیوان غالب (مملوکہ حافظ محمود خاں صاحب شیرانی) کے حاشیے پہ درج ہیں۔ ایک غزل کا مطلع ہے ہے

ستائش گر ہے زاہد اس قدر جس باغِ رضواں کا
وہ اک گلدستہ ہے ہم بیخودوں کے طاقِ نسیاں کا

ایک اور غزل میں اپنا دردِ دل بیان کیا ہے ہے

تھی وطن میں شان کیا غالبؔ کہ ہو غربت میں قدر ‌ ‌ ‌ بے تکلف ہوں وہ مشتِ خس کہ گلخن میں نہیں

قلمی نسخے کے حاشیے پہ اور بھی کئی غزلیں ہیں۔ جن کے متعلق دیوان میں تو کوئی تصریح نہیں کہ وہ کب لکھی گئیں۔ لیکن جو سفر کلکتہ کا کلام معلوم ہوتی ہیں۔ ایک غزل کا مقطع ہے ؎

کرتے کس منہ سے ہو غربت کی شکایت غالبؔ
تم کو بے مہریٔ یارانِ وطن یاد نہیں

ذیل کی دردناک قطعہ بند غزل بھی اس قلمی نسخے کے حاشیے پر درج ہے ؎

ظلمت کدے میں میرے شبِ غم کا جوش ہے
اِک شمع ہے دلیلِ سحر سو خموش ہے

باندہ سے مرزا موڈا آگئے۔ اور موڈا سے چلّہ تارا۔ آخری حصہ سفر کے لئے انہوں نے گھوڑا گاڑی لی۔ لیکن جب انہیں اس سفر میں معلوم ہوا۔ کہ سواری آسانی سے نہیں ملتی۔ اور جو جانور ملتے ہیں۔ وہ غالب نیم جان سے بھی سُست رفتار۔ تو انہوں نے چلہ تارا سے کشتی لی۔ اور دریا کے راستے سے الہ آباد پہنچے۔ معلوم ہوتا ہے۔ کہ یہاں جاتے وقت یا واپسی پر کوئی ناخوشگوار ہنگامہ پیش آیا۔ جس کی نسبت ایک فارسی قصیدے میں اشارہ ہے ؎

نفس بلرزہ ز بادِ نہیبِ کلکتہ
نگاہ خیرہ ز ہنگامۂ الہ آباد

یہاں ان کا کچھ دیر توقف کا ارادہ تھا۔ لیکن غالباً اس کا موقع نہ ملا۔ اور وہ بنارس پہنچے۔ جس وقت وہ بنارس پہنچے تو طبیعت ناساز تھی۔ چنانچہ رائے چھجمل کو ایک خط میں لکھا ہے "چہ نویسم کہ از متاع نوشتنیہا پُر تہیدست افتادہ ام۔ اگر از داخلیات گفتہ آید۔ ہماں رنج معدہ دامعاست۔ دہماں بُرودت جگر و حرارت قلب و ضعف قوا۔ د اگر از خارجیات سخن راندہ شود۔ بیش ازیں نیست قطعہ

مغلوب سطوتِ است دِل غالب حزیں ‌ ‌ ‌ کاندر تنش ز ضعف توانگفت جاں نبود
گویند زندہ تا بہ بنارس رسیدہ است ‌ ‌ ‌ ماراازیں گیاہِ ضعیف ایں گماں نبود

بنارس پہنچتے وقت وہ علیل تھے۔ لیکن بنارس جس کے پر فضا مناظر نے حزیں کے پاؤں میں بیڑیاں ڈال دی تھیں۔ غالبؔ کے لئے جنت نگاہ تھا۔ چنانچہ تھوڑے ہی دنوں میں طبیعت بحال ہوگئی۔ اور اب سوائے اس کے کوئی افسوس نہ تھا۔ کہ ان کے عزیز دوستوں نے انہیں بھلا رکھا ہے چنانچہ "چراغِ دیر" میں لکھتے ہیں ؎

، از اہلِ وطن غمخوارہ من نیست
مرا در دہر پنداری وطن نیست

اور مولوی فضل حق۔ نواب امین الدین رئیس لوہارو اور نواب حسام الدین حیدر خاں کو یاد کر کے افسوس کیا ہے ؎

گرفتم کز جہاں آباد رفتم | مرا نیاں را چرا از یاد رفتم
مگر داغِ فراقِ بوستاں سوخت | غم بیمہریِ ایں دوستاں سوخت

اس کے بعد بنارس کی بہت تعریف کی ہے۔ اور شاہ جہاں آباد پر اسے ترجیح دی ہے ؎

جہاں آباد گر نبود الم نیست | جہاں آباد باد جائے کم نیست
بنا شد قحط بہرِ آشیانے | ہرِ شاخِ گلے در گلستانے
بخاطر وارم اینک گلزمینے | بہار آئیں سواد و دلنشینے
کہ می آید بدعواگاہ لافش | جہاں آباد از بہر طوافش

تعالی اللہ بنارس چشم بد دور
بہشتِ خرم و فردوسِ معمور

معلوم ہوتا ہے۔ بنارس مرزا کو بہت پسند آیا (چنانچہ چالیس برس بعد بھی ایک خط میں لکھا ہے کہ اگر میں جوانی میں وہاں جاتا تو وہیں بس جاتا) لیکن جب پسماندگان کا خیال آتا ہے تو طبیعت بیقرار ہو جاتی ہے ؎

فرو ماندن بکاشی نارسائی است | خدارا ایں چہ کافر ماجرائی است
بکاشی لختے از کاشانہ یاد آر | دریں جنت از اں ویرانہ یاد آر

در بغاد رو طن وا ماندۂ چند | نجونِ دیدہ زورق راندۂ چند
ہوس را پائے در دامن شکستہ | بامید تو چشم از خویش بستہ
بشہر از بیکسی صحرا نشیناں | بروئے آتشِ دل جا گزیناں

از آنانت تغافل خوشنما نیست
بداغ شاں ہوئے گل روا نیست

بنارس سے غالب کا ارادہ تھا۔ کہ باقی سفر کشتی سے طے کریں۔ لیکن چونکہ دریا کی سفر کے اخراجات بہت زیادہ تھے۔ بنارس سے وہ گھوڑے پر روانہ ہوئے۔ چنانچہ ایک خط میں لکھتے ہیں ''ناخدایاں ناخدا شناس بنارس در باب کشتی مضائقہ کردند۔ چہ ہر کہ بہ غور روم تا کلکتہ کم از صد روپیہ نہ طلبید۔ دنا پٹنہ افزوں از بست روپیہ خواست۔ ناچار ہماں اسپ سوار نا بداں بقیہ صحرا خواہم پیمود'' غرض اس طرح وہ پٹنہ اور مرشد آباد ہوتے ہوئے سہ شنبہ چہار شعبان ۱۲۴۳ھ یعنی ۲۰ ر فروری ۱۸۲۸ء کو کلکتے پہنچے۔ یہاں انہوں نے شملہ بازار میں مرزا علی سوداگر کی حویلی میں ایک فراخ مکان دس روپیہ کرائے پر لیا۔ اور حصول مدعا کے لئے کوشش شروع کی سہ

غالب رسیدہ ایم بہ کلکتہ وزمے
از سینہ داغِ دوریِ احباب شستہ ایم

مرزا ابھی کلکتہ نہیں پہنچے تھے کہ انہیں اطلاع ملی۔ کہ نواب احمد بخش جن کی تقسیم کے خلاف وہ کوشش کرنے یہاں آئے تھے۔ وفات پا گئے۔ لیکن انہوں نے جائداد کا وارث نواب شمس الدین کو قرار دیا تھا۔ اب مرزا کا تنازعہ ان سے تھا۔ معلوم ہوتا ہے۔ کہ شروع شروع میں جب وہ کلکتہ میں حکام سے ملے۔ تو انہیں کامیابی کی بہت امید بندھ گئی تھی۔ اس وقت کلکتہ میں چیف سیکرٹری اینڈریو سٹرلنگ تھے۔ اور اسسٹنٹ سیکرٹری مسٹر سائمن فریزر موخر الذکر کی ملاقات ان سے دوستانہ طریقے سے ہوئی۔ اور ''معانقہ و عطائے عطر و پان'' تک کی نوبت آئی۔ مسٹر اینڈریو سٹرلنگ نے بھی جن کی تعریف میں مرزا کا فارسی قصیدہ موجود ہے۔ نواب گورنر جنرل کے نام غالب کی عرضداشت

لے کر اس کا انگریزی ترجمہ کرایا۔ اور کونسل میں پیش کیا۔ لیکن جب یہ عرضداشت گورنر جنرل کی کونسل میں پیش ہوئی۔ تو وہاں سے حکم ہوا کہ پہلے یہ فریاد ایجنٹ دہلی کے پاس ہونی چاہیئے۔ چنانچہ مرزا خود تو کلکتہ رُکے۔ اور اپنے وکیل ہیرالال کو دہلی لکھا۔ کہ مناسب عرضداشت پر سر ایڈورڈ کولبرگ ایجنٹ دہلی کی سفارش کرا کے کلکتہ بھجوائے۔ جب کہیں مہینوں کے بعد مرزا کا خط دہلی پہنچا۔ اور وکیل کو وکالت نامہ ملا۔ تو سر ایڈورڈ کولبرگ دورہ پر چلے گئے تھے۔ اور عرضی پیش نہ ہوسکی۔ ادھر لارڈ ولیم بینٹنگ گورنر جنرل شکار پر مالدہ گئے ہوئے تھے۔ اور ان کی کونسل کے مختلف ارکان جا بجا پریشان تھے۔ مرزا سے اپنے مقدمہ کے متعلق تو کچھ نہ ہوسکا۔ ہاں فارسی شعر گوئی کا جو شوق طبیعت میں راسخ ہو گیا تھا۔ اسے پورا کرنے کے موقعے ملتے رہے۔ کلکتہ میں ایسٹ انڈیا کمپنی نے جو مدرسہ جاری کیا تھا۔ اس سے متعلق انہی دنوں وہاں ایک بزم سخن قائم ہوتی تھی۔ جہاں ہر مہینے پہلے اتوار کو مشاعرہ ہوتا۔ اور اردو فارسی غزلیں پڑھی جاتیں۔ مرزا نے بھی اس میں غزلیں پڑھیں۔ ان میں ایک غزل تھی۔ جس کا مقطع مشہور ہے ؎

گر دہم شرح ستمہائے عزیزاں غالب
رسم امید ہمانا ز جہاں برخیزد

جب ذیل کا شعر پڑھا گیا۔ تو لوگ معترض ہوئے ؎

جزوے از عالمم واز ہمہ عالم بیشم
ہمچو موئے کہ بُتاں را ز میاں برخیزد

اعتراض یہ تھا۔ کہ عالم واحد ہے۔ اور ہمہ بقول قتیل کے واحد سے پہلے نہیں آسکتا۔ اسی طرح معلوم ہوتا ہے کہ ذیل کے شعر پر بھی اعتراض ہوا۔ کہ زدہ کا استعمال غلط ہے ؎

شوید اشکے بہ فشارِ بُنِ مژگاں دارم
طعنہ بہ بے سروسامانیٔ طوفاں زدہ

غالب کے معترضین میں مولوی عبدالقادر رام پوری۔ مولوی کرم حسین بلگرامی، مولوی نعمت علی

عظیم آبادی اور فارسی کے دوسرے مستند استاد تھے۔ لیکن مرزا بھی تنہا نہ تھے۔ انہی دنوں شاہزادہ کامران کی طرف سے کفایت خاں ایک ایرانی سفیر کلکتے آیا ہوا تھا۔ اس نے غالب کے اشعار کی تعریف کی اور اساتذہ کے پانچ سات اشعار ایسے پڑھے جن میں ہمہ عالم، ہمہ روز، ہمہ جا، اس طرح کی ترکیبیں موجود تھیں۔ اس کے علاوہ نواب اکبر علی متولی امام باڑہ اور دوسرے بااثر آدمیوں نے مرزا کی حمایت کی لیکن مرزا طبعاً صلح پسند تھے۔ اور اب بالخصوص اس غربت اور احتیاج کی حالت میں کلکتے کے بااثر لوگوں سے بگاڑ مول لینا دانشمندی کے خلاف تھا۔ چنانچہ انہوں نے ایک فارسی مثنوی باد مخالف" لکھی جس میں معترضوں کے جواب اسناد و دلائل کے ساتھ دیئے ہیں۔ اور ساتھ ساتھ اراکین انجمن اور قتیل کی تعریف کر کے صلح و آشتی کی کوشش کی ہے۔ قیام کلکتہ کے دوران میں مرزا نے زیادہ تر فارسی اشعار لکھے۔ لیکن وہ اردو اور فارسی دونوں زبانوں میں شعر گوئی پر یکجا قادر تھے۔ چنانچہ چکنی ڈلی کی تعریف میں ان کا مشہور اردو قطعہ کلکتے ہی کی ایک صحبت کی یادگار ہے:

کلکتے میں غالب کی ملاقات لکھنؤ کے مولوی سراج الدین احمد سے ہوئی۔ جن کا اخبار "آئینۂ اسکندر" سے کچھ تعلق تھا۔ اور جن کا حکام میں بھی بہت رسوخ تھا۔ انہیں مرزا کے عزیز ترین دوستوں میں سے سمجھنا چاہیئے۔ اور غالب کے فارسی مکتوبات میں سب سے زیادہ خطوط انہی کے نام ہیں۔ ان کے ایما پر غالب نے قیام کلکتہ کے دوران میں اپنے اُردُو اور فارسی کلام کا "گل رعنا" کے نام سے انتخاب کیا۔ بدقسمتی سے اس انتخاب کا کوئی نسخہ اس وقت دستیاب نہیں ہوتا۔ ورنہ غالب کے کلام کا کچھ حصہ تیقن سے ترتیب دیا جا سکتا۔ لیکن اس انتخاب کے لئے غالب نے جو مقدمہ اور خاتمہ لکھا ہے۔ وہ کلیات فارسی میں موجود ہے۔ اور مرزا کی شاعری کے طالب علم کے لئے بہت کارآمد ہے۔ شاید کلکتے ہی میں مرزا کی ملاقات لکھنؤ کے ایک اور قابل ذکر فرد میر حسن علی سے ہوئی۔ جو ۱۸۱۰ء میں لنڈن میں ہندوستانی کے پروفیسر "شیکسپیئر" کے معاون ہو کر رہے تھے۔ اور ولایت سے واپسی پر ایک اعلیٰ گھرانے کی انگریز خاتون سے (بطور اہل کتاب) شادی کر کے اسے ساتھ لائے تھے۔ مسز میر حسن علی قریباً ۱۲ سال ہندوستان میں رہیں۔ اور اس اثناء میں ہندوستانی مسلمانوں پر انہوں

نے ایک مفصل کتاب لکھی ہے۔ جس کا نیا ایڈیشن حال میں آکسفورڈ یونیورسٹی پریس کی طرف سے شائع ہُوا ہے۔ اور جس سے بہتر کتاب اس زمانے کے ہندوستانی مسلمانوں کے متعلق کسی مشرقی یا مغربی زبان میں نہیں؛

غالب کا قیام کلکتے دو سال سے کچھ کم رہا ہوگا۔ شروع شروع میں تو نئی نئی صورتیں اور نئے انتظامات نظر کو بہت بھائے۔ گورنر جنرل کی خدمت میں باریابی حاصل ہوئی اور باقاعدہ دربار کا اعزاز ملا۔ لیکن جب دو سال گذر گئے۔ اور جس منزل کو پیش نظر رکھ کر گھر سے نکلے تھے۔ وہاں تک رسائی نہ ہوئی۔ تو مرزا کی طبیعت پر مایوسی غالب آگئی۔ چنانچہ ان کے بعد کے خطوط اس تلخی سے پُر ہیں۔ اور ایک فارسی قطعے میں بھی کلکتہ کے متعلق انہوں نے مکالمے کی صورت میں تلخ جذبات کا اظہار کیا ہے ؎

حالِ کلکتہ باز جستم و گفت بایداقلیم ہشتمش گفتن

گفتم اینجا چہ شغل سود دھد؟ گفت از ہر کہ ہست ترسیدن

گفتم اینجا چہ کار باید کرد؟ گفت قطع نظر ز شعر و سخن

گفتم از بہر داد آمدہ ام

گفت بگریز و سر بسنگ بزن

معلوم ہوتا ہے کہ دہلی سے سر ایڈورڈ کولبرگ نے مرزا کے حق میں رپورٹ کی تھی۔ اور کلکتہ سے بھی حوصلہ افزا جواب گیا تھا۔ لیکن ابھی وہ جواب نہ پہنچا تھا۔ کہ کولبرگ معزول ہوگیا۔ اور معاملے پر نئے سرے سے تفتیش شروع ہوئی۔ چونکہ کلکتے میں مرزا کا قیام کسی طرح مفید نہیں ہو رہا تھا۔ اور دہلی میں کوشش زیادہ کارآمد ہو سکتی تھی۔ اور گورنر جنرل خود دہلی کی طرف جانیوالا تھا اسلئے مرزا ابھی کلکتے سے دہلی واپس گئے۔ اور ۲۹ نومبر ۱۸۲۹ء کو وہاں پہنچکر نئے ایجنٹ فرانسس ہاکنس سے مدد چاہی۔ کرنیل ہری ایلاک نے مرزا کی سفارش نئے ایجنٹ سے کی تھی۔ اور انہیں کچھ امید بھی ہوئی۔ لیکن ایجنٹ نے رپورٹ نواب شمس الدین رئیس فیروزپور کے حق میں کی۔ مرزا کو ان کے دوستوں نے اس کی اطلاع دی۔ لیکن وہ مطمئن تھے۔ کہ اسٹرلنگ چیف سکرٹری معاملے کو سنبھال لے گا۔ لیکن ابھی یہ رپورٹ کلکتے نہیں

پہنچی تھی۔ کہ ۲۳ مئی ۱۸۳۰ء کو سٹرلنگ مرگیا۔ اور ۲۷ جنوری ۱۸۳۱ء کو لارڈ ولیم بینٹنگ نے فیصلہ مرزا کے خلاف کر دیا ؛

معلوم ہوتا ہے کہ نواب نے تقسیم جائداد کی تائید میں لارڈ لیک کا ایک فارسی حکم پیش کیا تھا۔ جسے مرزا جعلی بتاتے تھے۔ اس کے مطابق نصراللہ خاں کے وارثوں کی جو پنشن مقرر ہوئی تھی وہ لارڈ لیک کے احکام کے مطابق دس ہزار سے پانچ ہزار سالانہ رہ گئی تھی۔ جس میں سے دو ہزار خواجہ حاجی کے پندرہ سو مرزا نصراللہ خاں کی ماں اور بہنوں کے اور پندرہ سو اسکے دو بھتیجوں کے تھے۔ مرزا اس "نامۂ فارسی بے نام ونشاں" کی صحت اور اہمیت کے قائل نہ تھے۔ لیکن سر جان ملکم نے جن سے اس امر میں استصواب کیا گیا، اسے درست تسلیم کیا۔ اور ان کے مشورہ پر لارڈ ولیم بنٹنگ نے مرزا کا دعوے خارج کر دیا ؛

یہ صحیح ہے کہ بظاہر مرزا کا سفر کلکتہ بے کار ثابت ہوا۔ اور حصول جائداد کی تمام تگ و دو رائیگاں گئی۔ لیکن مرزا کے مشاہدے کی وسعت اور ذہنی نشوونما کے لئے کلکتے کا سفر بہت مفید رہا ایک تو غربت میں طرح طرح کی تکلیفیں اٹھا کر جو قسم قسم کے آدمیوں کا تجربہ ہوتا ہے۔ وہ ہوا دوسرے کلکتہ ان دنوں ایسٹ انڈیا کمپنی کا صدر حکومت تھا۔ مغرب کی تمام ترقیاں اور ایجادیں سب سے پہلے ہندوستان میں وہاں شروع ہوتی تھیں۔ مرزا کو انہیں بچشم خود دیکھنے کا موقعہ ملا۔ اور اس معاملے میں ان کی واقفیت اپنے ہموطنوں سے زیادہ تھی۔ اسی طرح لکھنؤ میں بھی مرزا کو دیر تک قیام کرنے اور وہاں کی طرزِ شاعری اور زبان کی صفائی میں ناسخ جو کوششیں کر رہے تھے انہیں مطالعہ کرنے کا موقعہ ملا۔ یقین ہے کہ مرزا کی اثر پذیر طبیعت نے ان تمام باتوں کا فائدہ اٹھایا ہوگا۔ انہوں نے سفر کلکتہ کے بعد عرصے تک اردو اشعار بہت کم لکھے ہیں۔ لیکن اس کے پہلے اور بعد کے فارسی اشعار میں جو فرق ہے۔ وہ طبیعت اور دماغ کی اس پختگی کو نمایاں کرتا ہے۔ جو اس تین سال کے عرصے میں انہیں حاصل ہوئی ؛

بابِ چہارم

مقدمے کے بگڑ جانے سے غالب کی جو حالت ہوئی اُس کا اظہار کئی خطوں میں ہے ۔ چنانچہ مولوی سراج الدین کو جنھوں نے اس سلسلے میں ان کے لئے بہت کچھ کیا تھا ۔ لکھا ہے "در کارِ من بداد گاہِ دہلی چنانکہ دانستہ باشد تباہی گزید ۔ حالیا بداں سرم کہ اگر مرگ اماں دہد ۔ بارِ بداں در رسم و دردِ دل بداں زمزمہ فرو ریزم کہ مرغان ہوا و ماہیان دریا را بخود بگریانم ۔ ہیہات اگر معاش من ہمیں پنجہزار روپیہ سالانہ بدیں تفریق از روئے دفتر سرکار کہ سادہ دلاں آں را معدلت آثار گویند ثابت شدہ بود ۔ بلسے کہ صاحبان صدر مرا از پیش راندندے و گفتندے کہ ہرزہ مخروش ۔ آنچہ تو بازیافت را نمودۂ یافتنی از ان فزوں تر نیست ۔ و نفرا داد نیز ہما نست ۔ لاجرم دیوانہ بودمے ۔ اگر بدیں کشور باز آمدمے و بایک قبیلہ کہ خویشاں و برادراں اند ۔ بہ ستیزہ برخاستمے و بباطل سپری نام برآوردمے " ان سطور سے یہ خیال ہو سکتا ہے ۔ کہ مرزا کو پھر کلکتے جانے اور صدر میں کوشش کرنے کا خیال تھا ۔ لیکن غالباً یہ فقط انشا پردازی ہے ۔ مرزا پھر کلکتے نہیں گئے ۔ اور اس خط کے آخر میں لکھتے ہیں " اکنوں مصلحت دراں می بینم کہ ازیں داوری قطع نظر فرمائید و وکالت نامۂ من کو نزد منشی نصراللہ است ۔ باز ستانند واز ہم بدرند و بگذرند اللہ بس ماسویٰ ہوس " مرزا کو ایک تو

اتنی کوشش رائیگاں جانے کا افسوس تھا۔ دوسرے اہالیانِ دہلی کے طعنے۔ جن سے بچنے کے لئے معلوم ہوتا ہے انہیں شروع میں کنجِ عزلت میں پناہ لینی پڑی۔ ابتدا میں تو مایوسی اور رنج کی شدت سے طبیعت فکرِ شعر کے ناقابل تھی۔ لیکن آہستہ آہستہ اس زخم کا اندمال ہونا شروع ہوُا۔ ان کے عزیز دوستوں میں سے ان کے تعلقات مولوی فضل حق سے ہمیشہ برقرار رہے تھے نواب مصطفیٰ خاں سے رابطہ اسی زمانے میں بڑھا۔ اور نواب امین الدین اور نواب ضیاء الدین سے جو نواب شمس الدین سے بہت خوش نہ تھے۔ رشتۂ اخوت اور مضبوط ہوگیا۔ ہم ذکر کر چکے ہیں۔ کہ نواب شمس الدین نے پرگنہ لوہارو اپنے دونوں بھائیوں کے نام منتقل کر دیا تھا۔ انتظام اس کا نواب امین الدین کے ہاتھ میں تھا۔ اور ایک شرط یہ تھی۔ کہ اس کی آمدنی میں سے ۱۰۵۲۱ روپیہ سالانہ سرکاری خزانے میں نواب ضیاء الدین کے اخراجات کے لئے جمع کر دیا جائے۔ معلوم ہوتا ہے کہ نواب امین الدین یہ رقم باقاعدہ خزانے میں جمع نہیں کرا سکے۔ اس پر نواب شمس الدین نے کوشش شروع کی کہ نواب امین الدین دستاویز کی سب شرطیں پوری نہیں کر سکے۔ اس لئے ایک سالانہ رقم کے عوض یہ پرگنہ انہیں واپس مل جائے۔ مسٹر مارٹن ریذیڈنٹ دہلی نے اس کی تائید کی۔ اور گورنمنٹ اوف انڈیا کے احکام کے مطابق لوہارو۔ نواب شمس الدین کو واپس مل گیا۔ مسٹر ولیم فریزر جو نئے ریذیڈنٹ ہو کر آئے تھے۔ اس تبادلے کے حق میں نہ تھے۔ شروع میں نواب شمس الدین سے ان کے گہرے ذاتی تعلقات تھے۔ لیکن بعد میں کشیدگی ہوگئی۔ انہوں نے نواب امین الدین کو مشورہ دیا۔ کہ وہ اس فیصلے کے خلاف کلکتے جا کر کوشش کریں مرزا بھی ان کوششوں میں شریک تھے۔ چنانچہ جب اکتوبر ۱۸۳۴ء میں نواب کلکتے گئے تو غالب نے انہیں اپنے کلکتے کے دوستوں کے نام نہایت محبت بھرے تعارفی خطوط دیئے۔ مولوی سراج الدین کو ایک خط میں انہوں نے لکھا تھا:

"بالجملہ بدیں نامہ نگاری مدعائے اصلی بدیں رنگ است۔ کہ برادر صاحب مشفق نواب امین الدین خان بہادر ابن فخر الدولہ دلاور الملک نواب احمد بخش خان بہادر را ہماں موج بلا کہ زورق تم شکستہ بود۔ خانہ بسیلاب فنا داد۔ کمر بہ غمخواری و راہرو نوازی استوار بندید و خود را دوست دیرینۂ امین الدین خان دانستہ آنچناں چارہ سازی

وسگالش گیری بجا آرید۔ کہ این دردمند دور از خانماں اسد اللہ روسیاہ را فراموش کند و شمارا بجائے او داند۔"

مرزا کے عزیز دوست کئی تھے۔ لیکن اُن کے باوجود مرزا کے مصائب کم نہیں ہوئے۔ اس کی وجہ ایک تو یہ تھی۔ کہ نواب شمس الدین کا دہلی میں بہت رسوخ تھا۔ دوسرے مرزا کا قرضہ جو کلکتے جانے سے پہلے ہی انہیں گھبرا رہا تھا۔ بہت بڑھ چکا تھا۔ اور چونکہ قرضخواہوں کو بڑی جائداد کوئی نظر نہ آتی تھی۔ وہ حصول زر کے لئے بیتاب ہو رہے تھے۔ چنانچہ اسی سال ان میں سے دو نے دیوانی عدالت میں مرزا کے خلاف دعویٰ کر کے ڈگری حاصل کر لی۔ مرزا کے لئے یہ زمانہ سخت مصیبت کا تھا۔ ان میں زر ڈگری ادا کرنے کی طاقت نہ تھی۔ اور قاعدے کے مطابق انہیں جیل جانا تھا۔ لیکن چونکہ بقول ان کے مشہور اشخاص کے ساتھ اتنی رعایت ہوتی تھی۔ کہ عدالت کا چپڑاسی ان کے گھر نہ جاتا اور جب تک مدیون رستے میں نہ ملے اسے قید نہ کر سکتے تھے۔ مرزا بھی گھر بیٹھ رہے۔ چنانچہ انہوں نے ایک اہم فارسی خط میں ناسخ کو اس زمانے کے تمام حالات لکھے ہیں:۔

"چار ماہ است۔ کہ نامہ نگار بہ کنجے نشستہ در آمد شد بروئے خویش و بیگانہ بستہ اگر بزنداں اندرنیم اما خود و خفت من بزندانیاں ماند۔ آنچہ دریں چند روز از رنج و آشوب دیدہ ام۔ کافر باشم اگر ہیچ کافر بصد سالہ عقوبت جہنم یک نیم ازاں تواند دید" مرزا اس "قید خانہ نشینی" میں تھے کہ ۲۲ مارچ ۱۸۳۵ء کی شام کو ولیم فریزر ریذیڈنٹ دہلی کو کسی نے گولی سے ہلاک کر دیا۔ فریزر سے مرزا کے دوستانہ تعلقات تھے۔ اور انہیں امید تھی۔ کہ شاید اس کی اعانت سے جاگیر کا عقدہ حل ہو جائے چنانچہ اس کی تعریف میں ان کا ایک پُرزور قصیدہ بھی ہے ؎

زجیب افق مہر چوں سر بر آرد — مے از سبز مینا بساغر بر آرد
من و بزم ولیم فریزر کہ بہا دِر — کہ از جیب ہر گوشہ گوہر بر آرد
خہے دادگستر کہ در حضورش — خسے داد از دست آذر بر آرد
کشد انتقام خس از شعلہ چنداں — کہ دُود از نہادِ ہرا خگر بر آرد

مرزا کو اس کی موت کا بہت رنج ہوا۔ چنانچہ وہ اسی خط میں لکھتے ہیں دیکھے از ستمگران خدا ناترس که بعذاب ابدی گرفتار باد۔ ولیم صاحب بہادر را که ریذیڈنٹ دہلی و غالب مغلوب را مربی بود۔ در شب تاریک بضرب تفنگ کشت و مرا غم مرگ پدر تازہ کرد۔" ان دنوں جو صاحب دہلی میں مجسٹریٹ تھے۔ وہ غالب کو جانتے تھے۔ انہوں نے غالب سے تفتیش جرم کے سلسلے میں مدد لی۔ اور سرکاری تفتیشات کا نتیجہ یہ نکلا کہ نواب شمس الدین اور اس کا ایک سپاہی مجرم قرار دیئے گئے نواب اور غالب کے تعلقات تو عوام کو معلوم ہی تھے۔ دہلی کے لوگ یہ اڑے کہ نواب بے گناہ ہے۔ اور غالب اور فتح الہ بیگ[1] خاں نے کینہ وری سے حکام کو اس کے خلاف بھڑکا رکھا ہے۔

نواب شمس الدین سے جنہیں مسٹر کالون کی مزید تحقیقات کے بعد سوم اکتوبر ۱۸۳۵ء کو کشمیری بازار کے باہر شارع عام میں پھانسی دیگئی۔ عوام کو بہت ہمدردی تھی۔ اور غالب کے متعلق اگرچہ عوام کا خیال بے بنیاد ہی ہو تاہم یہ خیال عام ہونے کے بعد ان کا غالب سے جو برتاؤ ہوگا۔ وہ ظاہر ہے۔ اور مرزا نے ناسخ کے نام اس زمانے میں جو دو خط لکھے ہیں۔ ان سے بھی پتہ چلتا ہے کہ ان کے لئے یہ وقت کس ابتلاء اور آزمائش کا تھا۔ اور وہ غصے اور عداوت سے کس طرح بے قابو ہو رہے تھے۔

نواب کی وفات کے بعد فیروزپور جھرکا کی ریاست ضبط ہوگئی۔ اور مرزا کی پنشن جو انہیں اس ریاست سے ملتی تھی۔ دہلی کلکٹری سے ماہوار ملنی شروع ہوئی۔ مرزا نے اس موقعے پر پھر ایک مفصل عرضی گورنمنٹ آف انڈیا کی خدمت میں نواب کی جائداد سے پورا حق پانے کے لئے پیش کی۔ لیکن لارڈ ولیم بنٹنگ نے مرزا کے حقوق کا قطعی فیصلہ کر دیا تھا اسلئے وہ داخل دفتر ہوئی۔ اس پر مرزا نے کورٹ آف ڈائرکٹرز کے سامنے گورنمنٹ کے فیصلے کے خلاف مرافعہ کیا۔ لیکن مرزا کو اس عرضداشت کا جواب بھی نہ ملا۔ معلوم ہوتا ہے۔ کہ اس کے بعد انہوں نے انگریزی میں ایک عرضداشت

---

[1] سوانحعمری لارڈ لارنس میں درج ہے کہ نواب کے متعلق شک ایک شخص فتح خاں (؟) کے ایک فقرے کی وجہ سے پیدا ہوا جسے مٹکاف صاحب نے ذاتی عداوت کا اظہار سمجھکر نظرانداز کر دیا تھا۔ لیکن لارنس صاحب نے دھیان میں رکھا اور مجرم کا سراغ کھود نکالا۔

ملکہ وکٹوریہ کی خدمت میں بھی ارسال کی۔ لیکن یہ سب سعی بے سود ثابت ہوئی۔ اور جہاں تک پتہ چلتا ہے مرزا کو باسٹھ روپیہ آٹھ آنے ماہوار سے زیادہ پنشن کبھی نہیں ملی ؛

فریزر کے قتل سے چند مہینے پہلے مرزا نے دربار شاہی میں اپنا اثر بڑھانے کی کوشش کی تھی۔ لیکن اس زمانے میں ان کی سب تدبیریں اُلٹی پڑ رہی تھیں۔ یہ کوشش بھی چنداں کامیاب نہ ہوئی۔ اس زمانے میں تخت شاہی پر اکبر شاہ متمکن تھے۔ اور ظفر ولی عہد تھا۔ لیکن ظفر کی دماغی حالت بہت اچھی نہ سمجھی جاتی تھی۔ اس لئے بادشاہ نے ۱۸۳۴ء میں کوشش کی۔ کہ کسی طرح بجائے ظفر کے شاہزادہ سلیم ولی عہد تسلیم ہو جائے۔ مرزا غالب سمجھتے تھے۔ کہ ظفر تو ذوقؔ کا ہو رہا۔ اگر شہزادہ سلیمؔ آگے چل کر بادشاہ ہوا تو میرے لئے بہتر رہے گا۔ چنانچہ اسی سال عید البقر کے موقعے پر انہوں نے "شہ و شاہزادہ" کی تعریف میں ایک قصیدہ لکھا۔ جس میں بادشاہ اکبرؔ کی تعریف کے ساتھ ساتھ ذیل کا مطلع ثانی لکھ کر شہزادہ سلیمؔ کی تعریف کی تھی ؎

زہے مناسبتِ طبعِ شاہزادہ سلیم
بہ فیضِ تربیتِ پادشاہِ ہفت اقلیم

لیکن بادشاہ کی اس تجویز کو حکام انگریزی نے نہ مانا اور ۱۸۳۷ء میں اکبر شاہ کی وفات پر ظفر بادشاہ ہو گیا۔ ممکن ہے اس کے دل میں اس قصیدے کا کچھ ملال رہا ہو۔ اور اس کی تعریف میں ابتدائی فارسی قصائد میں غالب کو بار بار معذرت کرنے کی جو ضرورت پیش آئی۔ اس کا اس قصیدے سے بھی کچھ تعلق ہو ؛

جس سال بہادر شاہ تخت نشین ہوا۔ اسی سال نصیر الدین شاہ اودھ کا انتقال ہوا۔ اور امجد علی شاہ اس کا جانشین ہوا۔ مرزا نے اس کی تعریف میں ایک قصیدہ لکھا۔ لیکن وہ غالباً پڑھا نہیں گیا اس قصیدے میں تشبیب اور مدح کے بعد اپنی قسمت کا رونا رویا ہے۔ ؎

با من کہ تابِ نازِ نکویاں نداشتم
بد کرد بد کہ جور و جفا کرد روزگار

ایک قطعہ بند بھی ہے جس کا مضمون اقبال کی مشہور نظم "اسیری" سے جو انہوں نے مولانا محمد علی کی رہائی پر لکھی تھی، بہت ملتا جُلتا ہے ؎

گفتم بہ عقلِ کُل کہ ندانم برائے من — حکم دوام حبس چرا کرد روزگار
گفت اے ستارہ سوختہ زاغ و زغن نہ — کانرا گرفت و باز رہا کرد روزگار
تو بلبلی ہمیں کہ بدام آمدی ترا — اندر قفس نہ بہر نوا کرد روزگار

بیشک غالب کے لئے یہ حصۂ زندگی مصیبتوں اور ناکامیوں سے بھرا ہوا تھا۔ لیکن ادبی نقطۂ نظر سے یہ زمانہ بنجر نہ تھا۔ قرین قیاس ہے کہ جب مرزا کے نوابی اور جاگیرداری کے خواب پریشان ہو گئے ہونگے۔ تو انہیں شعر و سخن سے جو انکی دلچسپی تھی۔ وہ اور بھی بڑھ گئی ہوگی۔ چنانچہ فارسی غزلیات کا معتدبہ حصہ اسی زمانے میں لکھا گیا۔ اور جب ۱۸۳۵ء میں نواب شمس الدین کی پھانسی کے کچھ دیر بعد مرزا کے نسبتی بھائی مرزا علی بخش خاں[1] ان کے ہاں آکر مقیم ہوئے۔ تو ان دنوں مرزا کا دیوان فارسی مسمّٰی "بہ میخانۂ آرزو" مرتب ہو چکا تھا۔ اس دیوان کا خاتمہ ۱۸۳۵ء میں لکھا گیا۔ اور اس کا ایک قلمی نسخہ رائے چھجمل کے ہاتھ کا لکھا ہوا خدا بخش لائبریری میں موجود ہے۔ جس کا ان کی فارسی شاعری کی ترتیب میں وہی مرتبہ ہے۔ جو نسخۂ بھوپال کا اُردو شاعری میں۔ اور جس سے ان کا ابتدائی چالیس سال کا فارسی کلام وثوق سے ترتیب دیا جا سکتا ہے ؛

ابتدا میں جب غالب نے دیوان فارسی مرتب کیا۔ تو اس میں اشعار کے ساتھ ساتھ فارسی خطوط دیباچے وغیرہ شامل تھے۔ مرزا علی بخش کو انہیں یکجا کرنے کا خیال پیدا ہوا۔

---

[1] مرزا علی بخش مرزا کے نسبتی بھائی تھے۔ انکے علاوہ غالب کی بھتیجی یعنی میرزا یوسف کی صاحبزادی مرزا علی بخش کی بہو اور مرزا غلام فخر الدین کی بیوی تھی۔ مرزا غالب اور مرزا علی بخش کے تعلقات شروع میں اچھے تھے۔ لیکن معلوم ہوتا ہے۔ بعد میں انمیں فرق آگیا۔ مرزا نے اپنے دو خطوں میں مرزا علی بخش کی "دروغ بافیوں" کا ذکر کیا ہے۔ اسکے علاوہ اردوئے معلے سے پتہ چلتا ہے کہ مرزا انکی تدفین میں بھی شامل نہیں ہوئے۔ معلوم ہوتا ہے مرزا علی بخش نے غدر کیوقت مرزا کی مدد نہیں کی۔ وہ ایک اُردو خط میں اپنے سکّہ کے متعلق لکھتے ہیں "سبحان اللہ گولہ انداز کا بارود بنانا اور توپیں لگانا اور بنگھ اور میگزین کا لوٹنا معاف ہو جائے اور شاعر کے دو مصرعے معاف نہوں۔ ہاں صاحب گولہ انداز (مرزا معین الدین ؟) کا بہنوئی (مرزا ضیا الدین ؟) مددگار ہے۔ اور شاعر (غالب) کا سالا (مرزا علی بخش ؟) بھی جانبدار نہیں ؛

اور انہوں نے میخانۂ آرزو[۱] میں جو نثر شامل کی تھی۔ اس کے علاوہ دوسرے خطوط فراہم کر کے "پنج آہنگ" مرتب کی۔ اس کتاب کے شروع میں مرزا علی بخش کا اپنا دیباچہ ہے۔ جس میں یہ تفصیلات درج ہیں۔ آہنگ اوّل میں فارسی خطوط نویسی کے متعلق وہ سطور ہیں۔ جو غالب نے سفر بھرتپور کے دوران میں لکھی تھیں۔ آہنگ دوم میں فارسی مصادر و مصطلحات ہیں۔ آہنگ سوم میں مرزا نے اپنے فارسی دیوان کے کئی شعر انتخاب کئے ہیں۔ اور خطوط نویسی میں ان کا محل استعمال بتایا ہے۔ آہنگ چہارم میں تقاریظ کتب اور متفرق مضامین اور آہنگ پنجم میں مرزا کے اپنے فارسی خطوط معلوم ہوتا ہے۔ خطوط کے فراہم کرنے میں کچھ دیر لگی اور ۱۸۴۰ء کے قریب یہ کتاب مرتب ہوئی۔ انڈیا آفس لائبریری میں اس کا جو نسخہ ہے۔ اس کی تاریخ طباعت ۱۸۵۳ء ہے۔ اس کے بعد آہنگ چہارم اور آہنگ پنجم میں اضافہ ہوتا رہا۔ لیکن مرزا کے کئی خطوط غدر میں نواب ضیاء الدین اور نواب حسین مرزا کے کتب خانوں کی تباہی سے ضائع ہو گئے تھے۔ اسلئے بقول غالب پنج آہنگ نامکمل ہے۔ اور اس کے مکمل ہونے کا کوئی امکان نہیں؛

آہنگ اوّل کا تذکرہ ہم ابتدائی حالات میں کر چکے ہیں۔ آہنگ دوم میں فارسی صرف و نحو کے معمولی قواعد ہیں۔ آہنگ سوم کے اشعار اس لئے بھی کارآمد ہیں کہ ان سے کئی فارسی غزلوں کی تاریخ تصنیف تعین کی جا سکتی ہے۔ اور اس کے علاوہ مرزا کے اپنے قلم سے ان کے اشعار کا مفہوم اور محل استعمال پڑھنا بحد دلچسپ ہے۔ لیکن اس میں شک نہیں کہ اس کتاب کا سب سے قیمتی جزو مرزا کے وہ فارسی خطوط ہیں۔ جن کا بیشتر حصہ ۱۸۲۶ء سے ۱۸۵۳ء تک لکھا گیا۔ یہ خطوط غالب کے سوانح نگار کے لئے ایک بیش بہا خزانہ ہیں۔ اور کسی کتاب سے مرزا کی ان ستائیس سالوں کی کوششوں مصیبتوں اور ان کے ماحول کا صحیح اندازہ نہیں ہو سکتا۔ جتنا ان خطوط کے مطالعہ سے۔ ہم نے اس کتاب میں دوسرے تذکروں سے زیادہ مفصل اور صحیح حالات لکھنے کی کوشش کی ہے۔ اور اگر ہم اس کوشش میں کامیاب ہوئے ہیں۔ تو بیشتر اسی محنت کا صلہ ہے۔ جو ان خطوط کے مطالعہ میں صرف کی گئی؛

[۱] مرزا کی تصنیفات کے نام بہت شاعرانہ ہیں۔ گل رعنا۔ میخانۂ آرزو۔ پنج آہنگ۔ مہر نیمروز۔ اردوئے معلی۔ عود ہندی۔ سبد چین۔

مرزا کے اردو خطوط کی سوانحی اہمیت کو سب مانتے ہیں۔ لیکن سوائے ان خطوط کے جن میں مرزا نے اپنے واقعات زندگی مختصراً دہرائے ہیں۔ ان میں نو دس سال سے زیادہ کے واقعات نہیں۔ اور چونکہ اس زمانے میں نواب مصطفیٰ خاں کے تعلقات کی وجہ سے حالی کو بھی جو نواب کے لڑکوں کے اتالیق تھے۔ مرزا سے ملنے کے زیادہ موقع ملتے رہتے تھے اسلئے اس زمانے کے حالات اور قصے یادگار غالب میں بالتفصیل مندرج ہیں۔ لیکن ان کے ابتدائی حالات میں ابھی بہت کد و کاوش اور تلاش کی گنجائش ہے۔ اور جیسا کہ ہم لکھ چکے ہیں۔ اس کے لئے مرزا کے فارسی خطوط بہت مفید ہیں۔ جو ان کی عمر کے بڑے حصے کی کم و بیش ایک مکمل تاریخ ہیں۔ اور جو اس وقت لکھے گئے۔ جب مرزا کو یہ حالات درپیش تھے۔ اس شخصی اہمیت کے علاوہ مرزا کے فارسی خطوط اس لئے بھی دلچسپ ہیں۔ کہ ان کے مطالعہ سے اس زمانے کی بہت ممتاز ہستیوں سے شناسائی ہو جاتی ہے۔ جن لوگوں کے نام مرزا نے خطوط یادگار چھوڑے ہیں۔ ان کی فہرست بہت پرشکوہ ہے۔ اور اس میں اس زمانے کے اکثر ممتاز آدمیوں کے نام آ جاتے ہیں۔ چنانچہ شعراء میں سے ناسخ۔ مومن۔ شیفتہ۔ نیر درخشاں اور علماء میں سے مولینا فضل حق۔ مولانا صدر الدین صدر الصدور و قاضی القضاۃ مولینا ولایت حسین اور اکابر میں سے شہزادہ بشیر الدین میسوری شہزادہ سلیمان شکوہ۔ مبارز الدولہ ممتاز الملک حسام الدین حیدر خاں۔ سر جیمز طامسن مہاراجہ الور نواب سعد الدین خاں شفق۔ مجتہد العصر مولوی سید محمد و حکیم احسن اللہ خاں۔ ان سب کے نام مرزا کے دوستانہ خطوط موجود ہیں۔ جن سے نہ صرف مرزا کی قدر و منزلت کا اندازہ ہوتا ہے۔ بلکہ انیسویں صدی کے آغاز میں شمالی ہندوستان میں جو بڑی بڑی ہستیاں تھیں۔ ان سے بھی تعارف ہو جاتا ہے۔ خطوط میں بیشتر ذاتی حالات کا تذکرہ ہے۔ لیکن ان سے اس زمانے کے حالات پر بھی روشنی پڑتی ہے مثلاً انہوں نے اپنے سفر بنگالہ کی جو صعوبتیں بیان کی ہیں ان سے اس زمانے کے وسائل آمد و رفت کی تصویر آنکھوں کے سامنے آ جاتی ہے۔ یا جو خط انہوں نے لکھنؤ سے روانگی کے وقت لکھا ہے۔ اس میں لکھنؤ اور اہل لکھنؤ کی ان مصیبتوں کی تفصیل ہے۔ جو انہیں معتمد الدولہ کی وزارت میں برداشت کرنی پڑیں۔ اس کے علاوہ کئی خطوط میں مولوی سراج الدین کو دہلی کی دلچسپ خبریں لکھی ہیں۔ مثلاً ۳ جنوری ۱۸۳۵ء

کے ایک خط میں مولوی فضل حق کے سرکاری ملازمت سے مستعفی ہونے اور دہلی سے روانہ ہونے کی تفصیلات درج کی ہیں۔ اور لکھا ہے۔ کہ جونہی انہوں نے استعفیٰ دیا۔ نواب فیض محمد خاں نے فوراً پانچسو روپیہ ماہوار ان کے اخراجات کے لئے مقرر کر دیا۔ اور جس روز وہ دہلی سے روانہ ہوئے اہالیان دہلی کی بُری حالت تھی۔ ولیعہد شاہِ دہلی مرزا ابوظفر نے انہیں اپنے پاس بلایا۔ اور ایک دوشالہ ملبوس خاص نذر کر کے آنکھوں میں آنسو لا کے نہایت رنج و درد سے الوداع کیا۔ ایک اور خط میں لارڈ ڈالنبرا کے اس فیصلے کی طرف اشارہ ہے۔ جس کی رو سے تاج محل اور قلعہ آگرہ کی عمارتوں کا سنگ مرمر اتار کر بیچ ڈالنے کا ارادہ تھا۔ اور جو بقول لارڈ کرزن آرٹ کی خوش قسمتی سے عمل میں نہ لایا جا سکا؛

حالی نے یادگار غالب میں مرزا کی فارسی نثر کا انتخاب کر کے فارسی کے دوسرے مشہور نثر نویسوں کی تحریروں سے اس کا مقابلہ کیا ہے۔ لیکن اس میں کوئی شک نہیں۔ کہ مرزا خواہ کچھ کہیں۔ انہوں نے نثر میں اکثر اُن فارسی نثر نویسوں کا اتباع کیا۔ جن کی تصنیفات بیشتر ہندوستان میں لکھی گئیں اور اس امر پر قریب قریب سب فارسی اہل زبان متفق ہیں۔ کہ ہندوستان اور ہندوستان سے باہر ترک یا مغل بادشاہوں کی سرپرستی میں جو فارسی کتابیں لکھی گئیں۔ ان کا طرز تحریر کسی طرح بھی قابل تقلید نہیں۔ وہ بالعموم موٹے موٹے عربی لفظوں پیچیدہ ترکیبوں اور شاعرانہ رنگ آمیزی کے طوفان میں اصل مطلب خبط کر دیتے ہیں۔ مرزا بھی اس اصول سے مستثنےٰ نہیں۔ اور ظہوری ابوالفضل اور بیدل کی طرح ان کی نثر میں بھی غیر مانوس الفاظ اور پیچیدہ تراکیب بہت ہیں۔ لیکن یہ صحیح ہے کہ اُن کی آخر عمر کی تصانیف دستنبو اور قاطع برہان کی زبان کسی قدر صاف ہے۔ اور اکثر فارسی خطوط میں بھی وہ اشکال نہیں۔ جو تقریظوں اور دوسری سنجیدہ اور رسمی تحریروں میں ہے۔ اکثر خطوط کی عبارت صاف اور موثر ہے۔ شاعرانہ نازک بیانی سے بھی لطف پیدا کیا ہے۔ لیکن ان کے فارسی خطوط ان کے اردو خطوط کے مرتبے کو نہیں پہنچتے۔ ان میں وہ شگفتگی اور بے تکلفی نہیں۔ جو اردو خطوط میں ہے۔ اور جو شوخی اور ظرافت بعد کے اردو خطوط کا طرۂ امتیاز ہے۔ فارسی خطوط میں سراسر مفقود ہے بالعموم یہ کہنا صحیح ہے کہ مرزا کی دلچسپ شخصیت جو اردو خطوط میں عریاں اور بے نقاب جلوہ نما ہے

اس پر فارسی خطوط میں تکلّفات اور رسمی انشا پردازی کم پردے پڑے ہوئے ہیں۔ اور اس کے دلچسپ اور ہر دلعزیز پہلو مشکل سے ہی نظر کے سامنے آتے ہیں۔ لیکن آخر فارسی اور اردو ہر دو تصنیف ایک ہی ذہن رسا کے نتائج تھیں۔ اور جس طرح ایک ہی مضمون کو مرزا نے فارسی اور اُردو اشعار میں ادنیٰ اختلاف کے ساتھ نظم کیا ہے اسی طرح فارسی خطوط میں کئی خیالات اور جذبات ایسے ہیں جنہیں نثر نگی دیکھ انہوں نے بعد میں نہایت موثر طریقے سے ادا کیا۔ مثلاً انہوں نے عارف کی موت پر جو غزل لکھی ہے وہ اُردو کے موثر ترین مرثیوں میں سے ہے۔ لیکن اس کا چربہ اس سے پندرہ سال پہلے کے ایک فارسی خط میں موجود ہے۔ جو انہوں نے مولوی سراج الدین کو مرزا احمد بیگ کی وفات پر لکھا:۔ میگفت کہ بدہلی می آیم۔ وعدہ فراموش بیمروت راہ گم داند و ناقہ سرمنزل دیگر راند۔ گرفتم کہ خاطر دوستاں عزیز نداشت۔ چرا بحال خرد سالاں نہ پرداخت"۔ یہی آخری خیال ہے جس کو انہوں نے اُردو غزل میں نظم کیا ہے ؎

مجھ سے تمہیں نفرت سہی نیّر سے لڑائی
بچوں کا بھی دیکھا نہ تماشا کوئی دن اور

باب پنجم

غالب کو مقدمے کا فیصلہ اگست ۱۸۳۱ء میں معلوم ہوا۔ اس دس سال کے عرصے میں زمانے نے کئی رنگ بدلے تھے۔ جائداد کا قضیہ غالب کے لئے بڑی اہمیت رکھتا تھا۔ لیکن اب جن سے تنازعہ تھا۔ وہ ہی نہ رہے تھے۔ اور ان کی لاکھوں کی جائدادیں نذرِ فنا ہو گئی تھیں۔ مرزا بھی اپنی قسمت پر قانع ہو چلے تھے۔ یہ درست ہے کہ جب ان کے تعلقات کسی انگریز افسر سے بڑھتے اور منزلِ گم گشتہ کی ایک جھلک نظر آتی۔ تو وہ ایک نئی عرضداشت گورنمنٹ اوف انڈیا کے پاس بھیج دیتے۔ اور پنجاب گورنمنٹ کے ریکارڈز میں ایسی کئی عرضیاں محفوظ ہیں لیکن ان کوششوں اور جسم و جان کی اگلی بازیوں میں بہت فرق تھا۔ اور اب اگر یہ عرضیاں داخلِ دفتر ہوتیں تو مرزا بہت مایوس نہ ہوتے۔ مرزا اب اپنے ماہوار مشاہرے سے مطمئن ہو چلے تھے۔ اور غالباً چند احباب و امرا کی اولاد کو درس دینا بھی شروع کر دیا تھا۔ ان کی تصانیف ملک میں عام ہو چکی تھیں۔ اور ان کی قبولیت سے ان زخموں کا اندمال ہوتا تھا۔ جو تلاشِ روزگار میں کھائے تھے۔

ان کی مالی حالت بہت اچھی نہ تھی۔ لیکن سرکاری طور پر جو رقم ملتی۔ اور جو کچھ احباب کی عنایت سے حاصل ہو جاتا۔ مرزا اس سے مطمئن تھے۔ اور اپنے ذرائع آمدنی بڑھانے کے لئے بہت بیقرار نہ تھے۔

چنانچہ جب ۱۸۴۲ء میں طامسن کالج میں فارسی کی پروفیسری کے لئے انہیں بلایا گیا۔ تو چونکہ وہ اپنے آپ کو جاگیردار سمجھتے تھے۔ انہوں نے ملازمانہ طریقے سے حکام سے ملنا قبول نہ کیا۔ اور یہ ملازمت نہ لی۔ بعض لوگ حیران ہیں کہ مرزا جو عام مجسٹریٹوں اور منصدیوں کی تعریف میں زمین آسمان کے قلابے ملا دیتے تھے اور خوشامد و تملق کا کوئی پہلو ہاتھ سے جانے نہ دیتے تھے۔ وہ چیف سکتر کے استقبال نہ کرنے سے کیوں اس قدر چراغ پا ہو گئے۔ حقیقت یہ ہے کہ مرزا مداحیہ قصائد میں جو ایک طرح کا مبالغہ روا رکھتے۔ اسے وہ ایک شاعرانہ رسم سمجھتے تھے۔ جس کے شروع سے سب شاعر پابند چلے آئے ہیں۔ وہ طبعاً خود دار اور حساس تھے۔ اور وضعداری کے تمام اصولوں کا دھیان رکھتے تھے +

ان دنوں ان کے تعلقات سر سیّد احمدؐ خاں اور ان کے بھائی سید محمد خاں سے بڑھے۔ چنانچہ اکتوبر ۱۸۴۱ء میں ان کا منتخب دیوان ریختہ ان بھائیوں کے پریس سیّد المطابع سے چھپ کر شائع ہوُا۔ فارسی دیوان بھی اس سے چار سال بعد شائع ہوُا۔ چنانچہ مہاراجہ بنارس کے کتب خانے میں دیوان غالب کا جو ایڈیشن ہے۔ اس کی تاریخ طباعت ۱۸۴۵ء ہے۔ ظاہر ہے کہ ان کتابوں کی اشاعت سے مرزا کی شہرت جہاں پہلے نہ پہنچی تھی۔ پہنچ گئی ہو گی۔ اور ان کا بلند مرتبہ سب تسلیم کرنے لگے ہونگے +

علاوہ ازیں ان دنوں دہلی میں جا بجا مشاعرے ہو رہے تھے۔ جن میں فارسی اور اردو غزلیں پڑھی جاتیں۔ مرزا سب میں تو نہ جاتے تھے۔ لیکن جن مشاعروں کا انتظام نواب ضیاء الدین کرتے ان میں نواب زین العابدین عارف آ کر کھینچ لے جاتے۔ مرزا نے ان مشاعروں میں چند ایک غزلیں پڑھیں۔ جن میں سے چند اشعار ہم انتخاب کرتے ہیں ؎

ہر چہ فلک نخواستست ہیچکس از فلک نخواست ظرفِ فقیہ مے نجست بادۂ ماگزک نخواست

غرقہ بموجہ تاب خورد تشنہ ز دجلہ آب خورد زحمتِ ہیچیک ندا در احتِ ہیچیک نخواست

جاہ نہ علم بیخبر علم ز جاہ بے نیاز! ہم محکِ تو زرندید ہم زرِ من محک نخواست

شحنۂ دہر ہو بلا ہر چہ گرفت پس نداد — کاتب بخت در خطا ہر چہ نوشت حک نخواست
بحث و جدل بجائے ماں میکدہ جوئے کاندراں — کس نفس از جمل نزد کس سخن از فدک نخواست
گشتہ دار انتظار بود دیدۂ پیرہ سفید — در رہِ شوق ہر ہی دیدہ زمردمک نخواست

سہل شمرد و سرسری تا تو ز عجز نشمری
غالب اگر بداوری داد خود از فلک نخواست

اس مشاعرے میں جو طرحی غزل انہوں نے پڑھی اس کے دو شعر بہت پر لطف ہیں ؎

چہ عیش از وعدہ چوں باور ز عنوانم نمی آید — بہ نوعے گفت می آیم کہ می دانم نمی آید

دبیرم شاعرم رندم ندیمم شیوہ ہا دارم
گرفتم رحم بر فریاد و افغانم نمی آید

انہوں نے عُرفی کی طرز پر جو قصیدہ "گلستان" کی ردیف میں لکھا ہے وہ بھی نواب ضیاء الدین کے دیئے ہوئے مصرع طرح پر تھا۔ معلوم ہوتا ہے۔ کہ جس مشاعرے میں یہ قصیدہ پڑھا گیا۔ اس میں میر نظام الدین ممنون اور مولوی امام بخش صہبائی علالت کی وجہ سے نہ آئے تھے۔ اور چونکہ فارسی کے قدردان تھوڑے ہی لوگ تھے۔ مرزا اشش و پنج میں تھے۔ کہ پڑھوں یا نہ۔ مولینا صدر الدین آزردہ جو ابھی نہیں آئے تھے۔ آ پہنچے۔ چنانچہ مرزا ایک خط میں نواب مصطفیٰ خاں کو جنہیں وہ مشاعروں کے حالات میرٹھ بھیجا کرتے تھے۔ لکھتے ہیں: "بندہ را در زمین "گلستان" نگارش قصیدہ اتفاق افتادہ بود۔ آں ی سنجیدم کہ ایں ورق را چوں بدات نامقبول باز ہم در ریختہ گویاں را در و سر ندہم کہ آمدن حضرت آزردہ دل بخود بالید و زمزمہ دستوری یافت۔" چنانچہ وہ قصیدہ مشاعرے میں پڑھا گیا۔ اور جیسا کہ یادگارِ غالب کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے۔ بہت پسند ہوا۔

مرزا نے عرصے سے اردو شاعری قریب قریب ترک کر رکھی تھی۔ اور ۱۸۴۳ء کے ان مشاعروں میں جن میں اور شعرا نے اردو غزلیں پڑھیں۔ مرزا نے فارسی اشعار ہی پڑھے۔ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ ۱۸۴۵ میں گاہے گاہے انہوں نے اُردو غزلیں لکھنا شروع کر دی تھیں۔ چنانچہ جب نواب اصغر علی خاں نے

نے اس سال مشاعرہ منعقد کیا۔ اور ذوق ۔ مومن اور غالب کو دعوت دی۔ تو انہوں نے اردو غزل ہی پڑھی تھی ؎

نویدِ امن ہے بیدادِ دوست جاں کے لئے
رہی نہ طرزِ ستم کوئی آسماں کے لئے

اس زمانے میں انہیں نواب تجمل حسین خاں رئیس فرخ آباد نے دعوت دی ہوئی تھی ۔ مرزا نے لگے ہاتھوں غزل میں ان کی بھی تعریف کر دی ؎

دیا ہے خلق کو بھی تا اسے نظر نہ لگے
بنا ہے عیش تجمّل حسین خاں کے لئے

اسی طرح اس زمانے میں ایک اور عظیم الشان اردو مشاعرہ ہوا۔ جس میں ذوق اور مومن نے طرحی غزلیں پڑھیں۔ مرزا نے بھی دوغزلہ کہا ؎

ملتی ہے خوئے یار سے نار التہاب میں
کافر ہوں گر نہ ملتی ہو راحت عذاب میں

اس کے علاوہ مرزا نے مختلف موقعوں پر فارسی قصائد اور قطعات بھی بکثرت لکھے ہیں ۔ جب مسٹر جیمز طامسن جنہوں نے مرزا کی جاگیر کا سوال نئے سرے سے اٹھانا چاہا تھا آگرہ کے گورنر ہوئے ۔ تو مرزا نے اس موقعے پر دس شعر کا ایک نفیس قطعہ لکھا تھا۔ جس کا پہلا شعر ہے ؎

ہوا عبیر فشان است و ابر گوہر بار
جلوسِ گل بسریرِ چمن مبارک باد

عموماً یہ قطعات مدحیہ ہوتے تھے ۔ اور اکثر کسی مقصد کو پیش نظر رکھکر لکھے جاتے ۔ لیکن ۱۸۴۶ء میں جب انگریزوں نے سکھوں کو شکست دیکر پنجاب فتح کیا۔ تو مرزا نے اکیس شعر کا ایک فارسی قطعہ لکھا جو نہ کسی کی تعریف میں ہے اور نہ غالباً کسی کو بھیجا ہی گیا۔ اس میں سکھ فوج کے خلاف بُری طرح زہر اُگلا ہے ۔ سرسیّد کی کتاب آثار الصنادید سے پتہ چلتا ہے کہ جب مہاراجہ رنجیت سنگھ کے

چند احکام کے خلاف مولانا سید احمدؒ بریلوی نے جہاد کا اعلان کیا۔ تو دہلی میں بہت سے لوگ ان کے ہمخیال تھے۔ مہاراجہ کے فرانسیسی جرنیلوں کے خلاف تو مولینا اپنے ساتھیوں کے نفاق کی وجہ سے کامیاب نہ ہوئے۔ لیکن جب ۱۸۴۶ء میں خالصہ افواج کو انگریزوں نے شکست دی۔ تو دہلی کے مسلمان بہت خوش تھے۔ چنانچہ قرین قیاس ہے کہ مرزا نے بھی یہ قطعہ اسی وقت لکھکر دل کا غبار نکالا۔ انہوں نے اس موقعہ پر جو پُرکیف قصیدہ لارڈ ہارڈنگ کی تعریف میں لکھا ہے۔ وہ بھی بہت پُر لطف ہے۔ اس میں لکھتے ہیں۔ کہ اگر میں جوان ہوتا تو "حصول ثواب" کی "نیت" سے حکومت پنجاب کے خلاف لڑائی میں شریک ہوتا۔ لیکن پنجاب کا امن داماں انہیں جس چیز کے لئے عزیز ہے۔ وہ کشمیر کی شراب ہے ؎

گزاف شیوۂ من نیست راست میگویم | دریں زمانہ مرا بودے ارزمانِ شباب
پئے شکستنِ کفار بستمے بہ نبرد | کمر بہ سرخوشئ نیتِ حصولِ ثواب
کنوں کہ ملک مطیعست و راہ بیخس و خارہ | زمن بگو بصروشندگانِ بادۂ ناب
شرابِ قندئ ہندوستاں دماغم سوخت | زشیرہ خانۂ کشمیرم آورند شراب

ادبی نقطۂ نظر سے اس زمانے کی اہم ترین تصنیف ان کی فارسی مثنوی "ابر گوہربار" ہے۔ حالی کے خیال میں یہ ان کی آخری عمر کی تصنیف ہے۔ لیکن جب ۱۸۴۵ء میں سر سید احمد خاں نے آثار الصنادید لکھی۔ تو اس وقت یہ مثنوی ۱۵-۱۶ اجزو کے قریب ہو چکی تھی۔ اور اس سے زیادہ اب بھی نہیں ملتی؛

حقیقت میں مرزا کا ارادہ حفیظ جالندھری کی طرح شاہنامہ کا جواب لکھنے کا تھا۔ اور ان کا خیال تھا کہ جس طرح فردوسی نے رستم کی لڑائیوں کی داستان لکھی ہے۔ وہ ابتدائے اسلام کے جنگوں کو مثنوی کی صورت میں بیان کریں۔ چنانچہ وہ بڑے فخر سے لکھتے ہیں ؎

ز فردوسیم نکتہ انگیز تر | ز مرغ سحر خواں سحر خیز تر
فرد بردن شمع ساسانیاں | بود صبح اقبال ایمانیاں
رقم سنج منشور یزدانیم | نہ ایمانیاں گویم ایمانیم

کسے را کہ نازد بہ بیگانگاں	خمد در شمار روز دیوانگاں
باقبال ایمان و نیروئے دیں	سخن رانم از سید المرسلیں

لیکن انہیں یہ ارادہ پورا کرنے کا موقعہ نہیں ملا - اور وہ حمد و نعت و منقبت اور ابتدائی ساقی نامے سے زیادہ نہیں لکھ سکے - نعت کا حصہ صاف اور موثر زبان میں ہے - اور اس میں چند نئے مضامین بھی پیدا کئے ہیں مثلاً ؎

زخونیکہ در کربلا شد سبیل
ادا کرد وام زبانِ خلیل

یا معراج کے متعلق لکھا ہے ؎

بدرِ توشد لن ترانی کہن	فصاحت نگر رنگنجد سخن
ترا خواستگار است یزدانِ پاک	ہر آئینہ از لن ترانی چہ باک

ساقی نامے میں انہوں نے بیچارے نظامی کا مذاق اڑایا ہے - اور ساقی سے خطاب کیا ہے ؎

بیا ساقی آئینِ جم تازہ کن	طرازِ بساطِ کرم تازہ کن
مبادا نظامی ز راہے برد	بدستاں سوئے خانقاہت برد
فریبش مخور چوں مے آشام نیست	ستمدیدۂ گردشِ جام نیست
ورع پیشۂ مسکین چہ داند ترا	بہ آرائشِ نامہ خواند ترا

لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان کا ساقی نامہ بہت پھیکا ہے - اور مناجات اور معراج کے آخری حصے میں جو شاعری کا بلند معیار انہوں نے قائم کیا ہے - اسے وہ بالعموم نباہ نہیں سکے اس کی وجہ ایک یہ ہے کہ نفس مضمون میں چند ایسی اصولی مشکلات تھیں - جن کی وجہ سے اس میں شاعرانہ شوخی اور مبالغے کی گنجائش نہ تھی - اور یہ تمام نظم انہوں نے رک رک کر لکھی ہے - چنانچہ وہ خود اسی مثنوی کے آخری حصے میں لکھتے ہیں ؎

دریں رہ بہ پیچ سفرہا لبیت | بود راست لیکن خطرہا لبیت

بزمے کہ درو ے بود اجتناب   زرود و سرود و شراب و کباب

سخنور چہ گفتار پیش آورد   کزاں رنگ بر روئے خویش آورد

دریں بزم اوباش را بار نیست   مے و ساغر و زخمہ و تار نیست

بہت ممکن ہے کہ مثنوی کے نامکمل رہنے کی ایک وجہ مضمون کی مشکلات ہوں۔ ویسے اس زمانے میں چوسر کے ساتھ کچھ بد کر کھیلنے کی بدولت اُن پر ایک حادثہ بھی ایسا گذرا تھا۔ جس کی وجہ سے ممکن ہے کہ ان کے کئی ارادے نامکمل رہ گئے ہوں۔ ۱۸۴۷ء میں چوسر کی وجہ سے مجسٹریٹ دہلی کی عدالت میں ان پر جو فوجداری مقدمہ چلایا گیا۔ اس کی تفصیلات بمبئی کے احسن الاخبار مورخہ ۲۵ رجون ۱۸۴۷ء میں شایع ہوئی تھیں۔ اور چونکہ اس سے زیادہ مکمل اس واقعہ کی تفصیلات اور کہیں نہیں ملتیں[1]۔ ہم متعلقہ اندراج تمام کا تمام درج ذیل کرتے ہیں:

"دہلی ۱۵ رجمادی الثانی۔ مرزا اسد اللہ خاں بہادر کو دشمنوں کی غلط اطلاعات کے باعث گرفتار کر لیا گیا۔ معظم الدولہ بہادر کے نام سفارشی چھٹی لکھی گئی۔ کہ ان کو رہا کر دیا جاوے۔ یہ معززین شہر میں سے ہیں۔ یہ جو کچھ ہوا ہے محض حاسدوں کی فتنہ پردازی کا نتیجہ ہے۔ عدالت فوجداری سے نواب صاحبکلاں بہادر نے جواب دیا کہ مقدمہ عدالت کے سپرد ہے۔ ایسی حالت میں قانون سفارش کی اجازت نہیں دیتا۔" معلوم ہوتا ہے۔ بادشاہ کی سفارش کارگر نہ ہوئی۔ اور مرزا کو جرمانے اور قید کی سزا ہو گئی۔ چنانچہ اسی اخبار کی اشاعت مورخہ دوم جولائی ۱۸۴۷ء میں لکھا ہے "مرزا اسد اللہ خاں غالب پر عدالت فوجداری میں جو مقدمہ جاری تھا۔ اس کا فیصلہ سنا دیا گیا۔ مرزا صاحب کو چھ مہینے کی قید بامشقت اور دو سو روپیہ جرمانے کی سزا ہوئی۔ اگر دو سو روپیہ جرمانہ نہ ادا کریں۔ تو چھ مہینے قید میں

---

[1] حال ہی میں اس واقعہ کے متعلق سید ناصر نذیر فراق نے بھی چند سطور لکھی ہیں۔ (لال قلعے کی ایک جھلک صفحہ نمبر ۳۴) ان کا بیان ہے۔ کہ مرزا کا مقدمہ کنور وزیر علی خاں کی عدالت میں پیش ہوا۔ اور قبل از وقت رہائی لاٹ صاحب (مسٹر ٹیمپلٹن) یا کسی اور بڑے افسر کے اختیارات خاص کی وجہ سے ہوئی۔

اور اضافہ ہو جائے گا۔ اور مقررہ جرمانے کے علاوہ اگر پچاس روپے زیادہ ادا کئے جائیں۔ تو مشقت معاف ہو سکتی ہے۔ جب اس بات پر خیال کیا جاتا ہے کہ مرزا صاحب عرصے سے علیل رہتے ہیں۔ سوائے پرہیزی غذا قلیہ چپاتی کے اور کوئی چیز نہیں کھاتے۔ تو کہنا پڑتا ہے۔ کہ اس قدر مصیبت اور مشقت کا برداشت کرنا مرزا صاحب کی طاقت سے باہر ہے۔ بلکہ ہلاکت کا اندیشہ ہے۔ امید کی جاتی ہے کہ اگر سشن جج صاحب بہادر کی عدالت میں اپیل کی جائے اور اس مقدمے پر نظر ثانی ہو۔ تو نہ صرف یہ سزا موقوف ہو جائے۔ بلکہ عدالت فوجداری سے مقدمہ اٹھا لیا جائے۔ یہ بات عدل و انصاف کے بالکل خلاف ہے کہ ایسے باکمال رئیس کو جس کی عزت و حشمت کا دبدبہ لوگوں کے دلوں میں بیٹھا ہوا ہے۔ معمولی سے جرم میں ایسی سخت سزا دی جائے جس سے جان جانے کا قوی احتمال ہے۔"

غالب ایک تو اس زمانے میں بیمار اور کمزور تھے۔ دوسرے ایک معزز اور خاندانی آدمی کے لئے اس طرح جیل میں جانا انتہائی توہین اور بے آبروئی تھی۔ ان پر اس واقعہ کا بڑا اثر ہوا۔ چنانچہ مولوی کریم الدین تذکرۃ الشعرا میں لکھتے ہیں "ان دنوں سرکار کی طرف سے ان پر ایک بڑا حادثہ گذرا ہے۔ جس کے سبب سے انہیں رنج لاحق ہے" اور تفتہ کے نام بھی انہوں نے ایک خط میں لکھا ہے کہ یہ بہت بڑا دھبّہ رہ گیا۔ قید کے زمانے میں انہوں نے ایک ترکیب بند لکھا تھا۔ جسے ہم نے تمام کا تمام حصۂ انتخاب میں نقل کیا ہے۔ اس ترکیب بند سے بھی معلوم ہوتا ہے۔ کہ اس مصیبت کے وقت نواب مصطفیٰ خاں نے ان کی بڑی مدد کی۔ اور مرزا نے نواب مصطفیٰ کی تعریف میں جو زبردست فارسی قصیدہ لکھا ہے۔ اس میں بھی اس واقعہ کی طرف اشارہ ہے ؎

بشنود ے آنکہ باد آں رابرد
نالہ گہ در گنج زنداں می زنم

مولٰنا حالی کا بیان ہے کہ مرزا کو قید کی پوری میعاد بھگتنی نہیں پڑی۔ اور قریباً تین مہینے کے بعد ہی رہا ہو گئے۔ رہائی کے بعد وہ بہادر شاہ کے مرشد کالے خاں صاحب کے مکان پر مقیم تھے۔ اور

انہی کی سفارش سے دربار میں باریاب ہوئے۔ معلوم ہوتا ہے کہ باریابی سے پہلے وہ بہت سے قصیدے کسی کی معرفت دربار میں پیش کر چکے تھے۔ اور وہاں سے انہیں تحفے تحائف بھی جاتے۔ لیکن ابھی باریابی کی نوبت نہ آئی تھی۔ چنانچہ ایک فارسی قصیدے[1] میں لکھتے ہیں ؎

---

[1] بہادر شاہ کی تعریف میں مرزا کا سب سے پہلا قصیدہ یہی ہے۔ اور بادشاہ کی تخت نشینی کے سال میں لکھا گیا۔ یہ قصیدہ غالب کے فارسی منقولہ ۱۸۳۸ء ۱۲۵۴ھ میں موجود ہے۔ معلوم ہوتا ہے۔ اس قصیدے سے بادشاہ کی خفگی دور نہیں ہوئی۔ اور مرزا کو کئی معذرت آمیز قصیدے لکھنے پڑے۔ مثلاً "قصیدہ پانزدہم جس کا مطلع ہے ؎

نہ ہے ز نوبش نشانِ کمال صنع اللہ

سراج دین نبی بوظفر بہادر شاہ

یہ قصیدہ ۱۸۳۵ء ۱۲۵۱ھ سے پہلے لکھا گیا۔ لیکن اس سے بھی عتاب شاہی رفع نہ ہوا۔ اور مرزا نے معذرت کے انداز میں ایک اور قصیدہ کہا جو ۱۸۴۱ء کے بعد اور ۱۸۴۵ء سے پہلے تصنیف ہوا ؎

ردیفِ شعر ازاں کہ دم اختیار گہ

کہ از من است بہ ابروئے شہر یار گرہ

معلوم ہوتا ہے۔ کہ مرزا اس عذر خواہی کے باوجود باریاب نہیں ہوئے اور ۱۸۴۵ء کے بعد بھی انہیں ایک قصیدے میں عفو تقصیر کی درخواست کرنی پڑی۔ اس قصیدے کا مطلع ہے ؎

گفتم حدیث دوست بہ قرآں برابر است

نازم بہ کفرِ خود کہ بہ ایماں برابر است

کلامِ غالب کے مختلف معاصرانہ نسخوں سے اور ان سطور سے جو مرزا نے مہر نیمروز کے شروع میں لکھی ہیں خیال ہوتا ہے کہ مرزا دربار میں پہلی دفعہ قید کے بعد باریاب ہوئے۔ لیکن یادگارِ غالب اور کلامِ غالب کے معاصرانہ قلمی نسخوں سے اس امر کا بھی بدیہی ثبوت ملتا ہے۔ کہ باریابی سے پہلے ہی مرزا اور بادشاہ کے تعلقات سدھر چکے تھے۔ مرزا غالب کا جو اردو دیوان ۱۸۴۱ء میں یعنی قید کے واقعہ سے پہلے مطبع دارالسلام سے شائع ہوا ہے اس میں غالب کا وہ قطعہ موجود ہے جس میں بادشاہ کی طرف سے بیسنی روٹی پانے کا شکریہ ادا کیا ہے۔ اسی طرح ۱۸۴۵ء میں مرزا کا جو فارسی دیوان شائع ہوا۔ اس میں غالب کی فارسی مثنوی "شرحِ منقبتیں" جس میں بہادر شاہ کی بیان کی ہوئی ایک تمثیل کی شرح کی ہے۔ اور وہ مرثیہ جو انہوں نے شہزادہ فرخندہ شاہ کی وفات پر لکھا۔ دونوں موجود ہیں۔ اس کے علاوہ بانکی پور لائبریری میں ۱۸۴۱ء ۱۲۵۷ھ کا نقل کیا ہوا جو دیوانِ غالب محفوظ ہے۔ اس میں مرزا کی پانچ فارسی رباعیاں ہیں جو بادشاہ کے ایک خواب کے متعلق ہیں۔ ظاہر ہے۔ کہ یہ رباعیاں ۱۸۴۱ء سے پہلے لکھی گئیں۔ کلیاتِ نثر کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے۔ کہ مرزا نے ان میں سے چار رباعیاں نواب مبارز الدولہ مرزا حسام الدین حیدر خاں کو بھیجیں۔ تاکہ وہ انہیں ظفر الدولہ کی وساطت سے حضورِ شاہ میں (اپنے نام سے؟) پیش کریں۔ ان کے علاوہ اردو دیوان مطبوعہ ۱۸۴۱ء میں دو رباعیاں اور ایک غزل ہے۔ ان میں بھی غالب نے بہادر شاہ کی طرف اشارہ

ہے +

خواہیم قربِ شاہ ولیکن دریں مراد
عبرت ز نامرادیٔ سنجر گرفتہ ایم

ایک اور فارسی قصیدے میں دربار سے دُور ہونے کی نسبت لطیف اشارہ ہے ؎

شہنشہا زغمِ دُوریٔ درت کارم — بداں رسیدہ کہ بیمرگ جاں دہم ناگاہ
ببارگہ نرسم خانۂ سپہر خراب — ندیمِ شہ نشوم روئے روزگار سیاہ
چہ سر کنم روش مدح گستری چو مرا — ببزمِ خسروِ گیتی ستاں نباشد راہ

معلوم ہوتا ہے۔ کہ ذوق اور اس کے معاونین مرزا کی کوششوں میں روڑے اٹکاتے تھے۔ چنانچہ مرزا کا وہ فارسی قطعہ جس کا ذیل کا شعر بہت مشہور ہے۔ اور جس میں سوائے ذوق کے کوئی اور مخاطب معلوم نہیں ہوتا۔ اسی زمانے کی یادگار ہے[1] ؎

فارسی بیں تا بہ بینی نقش ہائے رنگ رنگ
بگذر از مجموعۂ اردو کہ بیرنگِ من است

اسی زمانے میں انہوں نے بہادر شاہ کی تعریف میں ایک فارسی قصیدہ لکھا تھا۔ جس میں کئی شعر اپنی حالت کا بیاں معلوم ہوتے ہیں ؎

گفتم حدیث دوست بقرآں برابر ست — نازم بکفر خود کہ بایماں برابر ست
گو چرخ دشمنی مکن و بخت سرکشی — خود خواہش محال بحرماں برابر ست
با چارہ گر بگوئے کہ تیمار پیش کش — درد لیست در دلم کہ بدرماں برابر ست
زیں موج خوں کہ می گذرد دمبدم زسر — دستارِ من بہ لالۂ نعماں برابر ست
کینہائے آشکار کہ سر جوش ناز اوست — در ذوق با نوازش پنہاں برابر ست
نے وعدۂ نہ پرسش رازے نہ شکوۂ — داغم ز نامۂ کہ بہ عنواں برابر ست
نے کف گرفتہ ساعد و نے لب ربودہ بوس — در ناخوشی وصال بہ ہجراں برابر ست

[1] یہ قطعہ ۱۸۴۵ء سے پہلے لکھا گیا۔ اور غالب کے پہلے مطبوعہ دیوان میں موجود ہے۔

پیوستہ پر فشان و نہ جستہ ز آشیاں
پروانۂ من بہ جنبشِ مژگاں برابر ست

اس قصیدے میں غالباً ذوق کی طرف اشارہ ہے ؎

بالد بخویش خواجہ چو گوئی سخنورش — غافل کہ این ترانہ بہ بہتاں برابر ست
نے ہر ترانہ سنج نکیسا نوا بود — نے ہر سخن سرائے بہ سحباں برابر ست
نے ہر شتر سوار بہ صالح بود ہمال — نے ہر شباں بموسیٔ عمراں برابر است
نے ہر کہ گنج یافت ز پرویز گوئے برد — نے ہر کہ باغ ساخت بہ رضواں برابر ست

آخر میں اپنی محرومیٔ قسمت کی طرف اشارہ ہے اور بادشاہ سے عفو تقصیر کی درخواست کی ہے ؎

باآنکہ بر سرِ پرشہ افشاندہ ام ز کلک — این نکتہ ہا کہ با دُر و مرجاں برابر ست
اینک مرا ز خجلتِ گفتارِ نارسا — جوشِ عرق بموجۂ طوفاں برابر ست
پوزش پذیر و مکرمت انگار کہ تو ام — خود یک نگہ بہ لطفِ نمایاں برابر ست
آرے قبولِ عذرِ گنہ از گناہگار — با صد ہزار بخشش و احساں برابر ست

دربار میں مرزا کے باریاب ہونے کی صحیح تاریخ لکھنا تو مشکل ہے۔ لیکن اتنا یقینی ہے کہ یہ باریابی بہادر شاہ کے مُرشد شاہ نصیر الدین عرف کالے شاہ صاحب کی وساطت سے ہوئی۔ چنانچہ مرزا مہر نیمروز کے آغاز میں لکھتے ہیں:-

"پس از پنجاہ سالہ آوارگی کہ تیزیِ رفتارِ من از مسجد و بتخانہ گرد انگیخت۔ و خانقاہ و میکدہ را بیکدگر زد۔ بفروغ از اں فرۂ ایزدی کہ فریدوں را بفر تاب داد گرہی دل افسردہ و خستہ مرا فرہنگ سخن گستری آموخت۔ بداں در فرودم آورد کہ تو نیز چوں حلقۂ چشمے بداں در داری و نتوانی کہ دیدہ بہ در داری۔ دیوار کاخ والا پایۂ ہما سایہ بیدار دل دیدہ ور قدسی سرشت گہر جادہ شناسِ راہِ سیر و سلوک و راہ نمائے جادۂ فقر و فنا مشاہد شہود شاہد یقین مولانا محمد نصیر الدین را نازم کہ ہر کہ بسایۂ آں دیوار ہمایوں آثار گام زند۔ نشگفت کہ سایۂ خویش در فردوس افگند۔

نخست آبِ رحمت کہ بر من از بالا فرود آمد رو دادنِ خجستگی زمیں بوسِ گیہاں خدیو خداواں بود۔ دولت روئے آورد و بخت از خواب جست"۔

حضرت کالے شاہ کی کوشش سے یہ تو ہوا۔ کہ مرزا دربار میں بار یاب اور بہادر شاہ کے مرید ہو گئے۔ وہ دربار میں حاضر ہوتے۔ قصائد اور نظمیں پڑھتے۔ اور انعام اور خلعت پاتے۔ لیکن ان سب باتوں کے باوجود انہیں دربار شاہی سے کوئی مستقل تعلق نہ تھا۔ اور پیٹ کا دھندا ابھی باقی تھا۔ یہ تعلق بادشاہ کے مدار المہام احترام الدولہ حکیم احسن اللہ خاں کی مہربانی سے پیدا ہو گیا۔ احترام الدولہ مرزا کی فارسی نثر کے بڑے مداح تھے۔ چنانچہ جب بہادر شاہ کو شاہان تیموری کی تاریخ لکھوانے کا خیال پیدا ہوا۔ تو انہوں نے مرزا کو بلا کہ یہ کام اُن کے سپرد کر دیا۔ مرزا "مہر نیمروز" میں لکھتے ہیں:۔ "اگر در شرع روا بودے گفتمے۔ کہ شاہ سکندر است و حکیم ارسطو ہمانا بلند نامی سلطان دہر و رہ آفاق چشم داشت۔ کہ چوں منے را کہ بہ جادو بیانی شہرۂ آفاقم بکمہ دارگذاری گماشت من خود ازاں رہ کہ دل و زبان ایں بیدار مغز آئینہ دار دل و زبانِ شاہ است دانم کہ آنچہ عمدۃ الحکما دریں باب لمبن فرمودہ فرمانِ شاہ است"۔ چنانچہ بادشاہ نے حکیم صاحب کی تجویز پہ صاد کیا۔ اور ۴ جولائی ۱۸۵۰ء کو مرزا نجم الدولہ دبیر الملک نظام جنگ کے خطاب اور خلعت سے سرفراز ہوئے اور چھ سو روپیہ سالیانہ پر شاہان تیموریہ کی تاریخ نویسی پہ مامور ہوئے۔

باب ششم

لال قلعہ

۱۸۵۰ء میں مرزا بادشاہ کے درباری مؤرخ مقرر ہوئے۔ اس کے کچھ عرصہ بعد ولی عہد شاہ شہزادہ فتح الملک نے انہیں اپنا استاد چُنا۔ اور چار سو روپیہ سالانہ مشاہرہ مقرر کیا۔ ولی عہد نے غالب کے قدیمی دشمن نواب شمس الدین کی بیوہ سے شادی کی تھی۔ اور ظاہر ہے۔ کہ مرزا کی ادبی شہرت بہت مستحکم ہو گئی ہوگی۔ جو ولی عہد نے تمام پچھلے واقعات سے چشم پوشی کر کے مرزا کو اپنا استاد چنا۔ ولیعہد کی تعریف میں مرزا نے چند قطعات اور تین بلند پایہ فارسی قصائد لکھے ہیں۔ ان میں سے ایک کی تشبیب میں "روزِ ازل" کی دلچسپ روئداد لکھی ہے۔ دوسرا قصیدہ رودکی کے قصیدے کی بحر میں ہے ؎

داورِ سلطاں نشاں آید ہمی | سرورِ گیتی ستاں آید ہمی
شہریاراں نکتہ داناں بودہ اند | شہریارِ نکتہ داں آید ہمی
شہریاری باجوانی خوشتر است | شہریارِ نوجواں آید ہمی

تیسرے قصیدے کے کئی شعر تغزل کے نقطۂ نظر سے بہت پُر لطف ہیں ؎

فریبِ پرسشِ پنہاں نگر کہ من ہمہ عمر ۔۔۔ بذوقِ وصل ابد ساختم بہ ہجرانش
کسم بخود نہ پذیرد بہ فنّ و دہر بازم بُرد ۔۔۔ چو نامۂ کہ بُوَد نانوشتہ عنوانش
ازاں بہ گلشنِ گیتی نشاط میورزی ۔۔۔ کہ بوئے زہر ہمی شنوی ز ریحانش

ویسے مرزا کی یہ خوش قسمتی عارضی تھی۔ کیونکہ ولیعہد دو سال بعد چل بسے۔ اور اگرچہ ادبی نقطۂ نظر سے درباری تعلقات نیک پھل لائے۔ کیونکہ ایک تو مرزا کے اردو خطوط کا آغاز اسی زمانے سے ہوا[1]۔ دوسرے ان تعلقات کی وجہ سے مرزا کو فارسی چھوڑ کر اردو غزلیں لکھنی پڑیں۔ لیکن ذوق سے معاصرانہ کشمکش باقی تھی۔ اور دسمبر ۱۸۵۱ء ہی میں سہرے کا ناخوشگوار واقعہ پیش آیا۔ آبِ حیات میں اس قضیے کی تمام تفصیلات درج ہیں۔ اور غالب نے انور الدولہ نواب سعد الدین خاں شفق کے نام ایک خط میں بھی اس کے متعلق ذکر کیا ہے۔ "از دیرباز سرِ دستانسرائی اردو ندارم۔ ہمانا از رضا جوئی شہریار سلیماں پیشگاہ است گاہ گاہ ناگاہ رنگ ریختہ ریختن و شرہ بفرمان بانوی بلقیس پرستار است در ریختہ بدیں ردیف نارہ وا دلِ آویختن مگر در مقطع غزل سرمستانہ ہوئے زدہ باشم آں یکے کہ گمان کمالے کہ نداشت داشت پنداشت کہ روئے سخن سوئے اوست۔ در مقطع غزلکہ سرود بہنجار ستیزہ گام زد و دانست کہ گفتار مرا پاسخ سازد و من لبسبہ مستیٔ ایں تجربہ کہ فرد ریختہ خامۂ من است۔ ع

[1] ۔ حالی نے یادگار غالب میں لکھا ہے۔ کہ مرزا کو اردو خط و کتابت ۱۸۵۰ء میں شروع کرنی پڑی۔ جب وہ [illegible] "مہر نیمروز" کے لکھنے میں مصروف ہوگئے۔ ہم بتا چکے ہیں (اور مرزا کے اپنے فارسی خطوط ہی اس امر کا بین ثبوت ہیں) کہ مرزا نے آسان اور سادہ خطوط نویسی کے جو اصول اپنے رسالۂ خطوط نویسی میں بتائے تھے۔ ان پر خود جہاں تک فارسی خطوط کا تعلق ہے۔ کبھی عمل نہیں کیا۔ لیکن اردو میں انہوں نے جو خطوط لکھے ہیں وہ بے تکلف اور "سخن آرائی" سے پاک ہیں۔ وہ خود منشی نولکشور کو لکھتے ہیں "در پارسی زبان لبا سخن گفتہ ام و سرنامہ ہا نگاشتہ۔ اکنوں کہ دل از ناتوانی سگالش برنمی تابد۔ کار بہ خود آساں کردہ ام و ہرچہ می باید نشست۔ در اردو می نویسم گوئی گفتار در نامہ فرو می پیچم و بہ دوست میفرستم حاشا کہ در اردو زبان نیز سخن آرائی و خود نمائی آئین باشد۔ آنچہ بانزدیکاں تواں گفت۔ بہ دوراں نوشتہ میشود۔"

ہرچہ در گفتار فخرِ تست آں ننگِ من است

سر بسخن فرو نیاوردم و قطع نظر را دلیل قطعی امتیاز شمردم"

اس کے بعد نہایت متاسفانہ انداز سے اپنی ناکامیوں پر آنسو بہاتے ہیں "آہ از من کہ مرا زبان زدہ و سوختہ غم آفریدند نہ بآئین نیاگان خویش سلطان سنجر دارائے کلاہ و کمرے و نہ بفرہنگ فرزانگان پیش بو علی آسا علم و ہنرے - گفتم درویش باشم و آزادانہ رہ سپرم - ذوقِ سخن کہ ازل آوردہ بود - رہزنی کرد و مرا بداں فریفت - کہ آئینہ زدودن و صورت معنی نمودن نیز کاریہ نمایان است سرِ لشکری و دانشوری خود نیست - صوفیگری بگذار و سخن گستری روئے آر - ناگزیر ہمچناں کردم و سفینہ در بحر شعر کہ سراب است رواں کردم - قلم علم شد و تیرہائے شکستہ آیا قلم - باخود برونگار دیدہ ورے نبود یا بود و دل بمن نپرداخت ہمانا در تیرگئے روزگار من اندازہ شگرفئے کار من کس نشناخت فرجام کار اکنوں کہ دنداں فرو ریخت و گوش گراں گشت موی سپید است و رُوئے پُر از ژنگ دست بلکہ زہ اندر دست و پائے در رکاب از آں ہمہ سودا کہ در سر بودن جاں کندنی و نان خوردنی بمن ماند و بس - تا از آنچہ امروز کاشتہ ام فردا چہ دروم"

بہادر شاہ کے آخری سال بھی بہت اطمینان کے نہ تھے۔[1] نواب زینت محل شہزادہ جواں بخت کی ولیعہدی کے لئے کوشاں تھیں۔ لیکن اس میں کامیابی کی کوئی امید نہ تھی - اس کے علاوہ اس کی اپنی صحت بھی خراب تھی - چنانچہ دسمبر ۱۸۵۱ء کو ریذیڈنٹ دہلی نے رپورٹ بھیجی کہ بادشاہ بیمار اور زندگی سے بیزار ہے - اور حج کے لئے مکہ معظمہ جانے کا ارادہ رکھتا ہے"

مہر نیمروز یعنی تاریخ شاہان تیموری کا پہلا حصہ مارچ ۱۸۵۲ء سے کچھ پہلے مکمل ہو گیا اور ۱۸۵۴ء میں بادشاہ کے ایماء سے مطبع فخر المطابع میں چھپ کر شائع ہوا - لیکن دوسرا حصہ لکھنے کی نوبت نہیں آئی -

---

[1] بادشاہ نے اوائل ۱۸۵۴ء میں جو فارسی مثنوی غالب سے لکھوا کر اپنے نام سے لکھنؤ اور دوسری جگہوں میں شائع کروائی - اس کے دو دردناک اشعار ہیں ؎

دیدہ باشد کہ شہر یار نہ ایم - کار فرمائے بندہ دار نہ ایم

شاہیٔ من بجز ریاست نیست - بہر من پایۂ سیاست نیست

اس کی وجہ معلوم نہیں۔ کیونکہ بادشاہی سلسلہ اس تصنیف کے پانچ چھ سال بعد تک قائم رہا۔ ممکن ہے کہ بہادر شاہ جو سادہ اور موثر طرز تحریر پسند کرتا تھا۔ اُسے مرزا کی ٹیڑھی ترکیبیں اور استعاروں اور تشبیہوں کے انبار میں اصل مطلب خبط کر دینا ناپسند ہوا ہو۔ اس نے اس کتاب کی تکمیل غیر ضروری سمجھی ہو یہ صحیح ہے کہ مرزا کی فارسی نثر غلط ہندوستانی محاوروں سے پاک ہے۔ لیکن جہاں تک معنی کا تعلق ہے۔ اس پر ان کی پیانہ کی مثال صادق آتی ہے۔ کہ چھلکے ہی چھلکے ہیں۔ مغز کا نام نہیں۔ اور یہی وجہ ہے کہ باوجودیکہ مہر نیمروز جو مغلیہ بادشاہوں کی تاریخ ہے اور جس کی تاریخی اہمیت اس وجہ سے کہ آخری مغلیہ بادشاہ کے زیر فرمان درباری مؤرخ نے لکھی۔ بہت ہونی چاہئے۔ کچھ بھی نہیں ؛

۱۸۵۲ء میں یعنی جس سال مہر نیمروز مکمل ہوئی۔ مومن کا انتقال ہو گیا۔ مومن خود ایک بہت بلند مرتبہ شاعر تھا۔ اور مرزا کی طرح فارسی کا شائق۔ مرزا کو اس کی موت کا بہت افسوس ہوا۔ جس کا اظہار انہوں نے ایک فارسی رباعی میں بھی کیا ہے ؎

ثمر غلت کہ روئے دل خراشم ہمہ عمر — خوں نابہ برخ زدیدہ پاشم ہمہ عمر
کافر باشم اگر بہ مرگ مومن — چوں کعبہ سیہ پوش نہ باشم ہمہ عمر

لیکن اس سال کے جس سانحہ کا انہیں "مرگ مومن" سے بھی زیادہ رنج ہوا۔ وہ نواب زین العابدین عارف کی وفات تھی۔ جو اپریل ۱۸۵۲ء میں واقع ہوئی۔ عارف غالب کی بیوی کے بھانجے تھے۔ اور چھوٹی عمر ہی میں خوب شعر کہتے تھے۔ مرزا کو وہ بہت عزیز تھے۔ اور ان کی نسبت انہوں نے ایک فارسی قطعہ بھی لکھا ہے ؎

آں پسندیدہ خوئے عارف نام — کہ زخشش شمع دودمان منست
از نشاط نگارش نامش — خامہ رقاص در بنان منست
آنکہ در بزم قرب و خلوت انس — غمگسار مزاج دان منست
زور بازوئے کامرانی من — راحت روح ناتوان منست

ان کے مرنے کا مرزا کو بہت افسوس ہوا۔ جس کا اظہار انہوں نے ایک نہایت درد ناک

مرثیے میں کیا ہے۔ مرحوم کے دو بیٹے تھے حسین علی خاں اور باقر علی خاں۔ مرزا پہلے حسین علی خاں اور پھر باقر علی خاں ہر دو کو اپنے پاس لے آئے۔ اور انہیں اپنے بچوں کی طرح بڑے لاڈ پیار سے پالا۔

معلوم ہوتا ہے کہ اگرچہ مرزا نے اودھ کے تین یا چار بادشاہوں کی تعریف میں قصیدے لکھے انہیں اس مدح کا صلہ پہلی مرتبہ ۱۸۵۲ء میں واجد علی شاہ کی طرف سے ملا۔ چنانچہ وہ مجتہد العصر مولانا سید محمد صاحب کو ایک خط میں لکھتے ہیں: "سہ شنبہ یازدھم ماہ صفر توقیع خدا آگاہی و پنجشنبہ سیزدھم ماہ عطیہ سلطانی تشریف ورود ارزانی داشت . . . چنیں ناخوش ہنگام کہ دیدہ بماتم مردم دیدہ سیاہ پوش و شہر از آشوب ستیز کفر و اسلام پُر خروش باشد۔ بندہ پروردن و بدیں خوبی کہ در حوصلہ امکاں نگنجد۔ کار را سرہ کردن اگر معجزۂ امامت و نیروئے ولایت نیست دگر چیست"۔ اس خط پر تاریخ تحریر تو درج نہیں لیکن اس میں ہنومان گڑھی کے واقعہ کی طرف اشارہ معلوم ہوتا ہے۔ جو ۱۸۵۲ء میں رو پذیر ہوا۔ مجتہد العصر جن کے ایما پر غالب نے اردو مرثیہ کے تین بند بھی لکھے تھے۔ غالب کے بڑے قدر دان اور مربی تھے وہ غالب کے قصائد دربار میں پیش کرتے۔ اور ایک مرتبہ جب واجد علی شاہ مرزا سے دفع الباطل کی تصنیف کی وجہ سے ناخوش تھا۔ تو انہی نے مرزا کی وکالت کی۔ اور عتاب شاہی سے بچایا۔ غالب کے خطوط سے پتہ چلتا ہے کہ اودھ سے پانچسو سالیانہ مقرر بھی ہوا تھا۔ لیکن یہ بہت دیر تک ملنے نہیں پایا کہ اودھ کی سلطنت جاتی رہی۔ اور ۱۸۵۶ء میں اودھ کے آخری تاجدار واجد علی شاہ کلکتے بطور اسیر سلطانی بھیجدیئے گئے۔

ویسے مرزا کی زندگی اب نسبتاً آرام سے گزرتی تھی۔ مالی حالت قدرے بہتر تھی۔ قلعہ سے تعلق بھی پیدا ہو گیا تھا۔ شاہزادوں میں کوئی نہ کوئی ہر ہفتے مشاعرہ منعقد کراتا۔ وہ ان میں اردو غزلیں پڑھتے اور چونکہ ان کا موجودہ رنگ مقبول عام تھا۔ تعریفیں ہوتیں۔ ذوق سے بھی اب ان کے تعلقات نسبتاً خوشگوار تھے۔ لیکن آہستہ آہستہ یہ مجلس برہم ہونی شروع ہوئی۔ مومن کا انتقال ۱۸۵۲ء میں ہوا۔ اور اس کے دو سال بعد ۱۶ اکتوبر ۱۸۵۴ء کو ذوق بھی چل بسے[1]۔ مشہور شعرا میں اس وقت غالب کے سوا کوئی نہ تھا۔ چنانچہ

---

[1] ۔ مرزا نے تاریخ لکھی ہے

تاریخ وفات ذوق غالب   باخاطر دردمند و مایوس
خوں شد دل زار تا نوشتم   خاقانی ہند مُرد افسوس

۱۸۵۴ء

بادشاہ کے اشعار کی اصلاح ان کے سپرد ہوئی۔ لیکن اس اعزاز سے اور بھی اہم واقع دربار رام پور سے تعلق تھا۔ جس کا آغاز ۱۸۵۷ء کے شروع میں ہوا۔ معلوم ہوتا ہے۔ کہ یہ تعلق مولوی فضل حق صاحب کی وجہ سے پیدا ہوا۔ جنہیں نواب یوسف علی خاں کی علم پروری رام پور کھینچ لے گئی تھی۔ اُن کے ایما پہ مرزا نے اپنا دیوان اور ایک فارسی قصیدہ جس کا مطلع ہے ؎

ہمانا اگر گوہرِ جاں فرستم به نواب یوسف علیخاں فرستم

نواب کی خدمت میں بھیجے نواب صاحب اس سے پہلے دہلی میں مرزا سے فارسی پڑھ چکے تھے۔ اب فن شعر میں بھی ان کے شاگرد ہوئے۔ اور گاہے گاہے ان کی مالی امداد کرتے رہے۔ اس مالی مدد کے علاوہ اردوئے معلےٰ کے پڑھنے والے جانتے ہیں کہ اگر غدر کے بعد نواب مرزا کی دستگیری نہ کرتے تو جہاں اتنے اور خاندانی لوگوں کی دریوزہ گری اور فاقہ کشی تک نوبت آئی تھی۔ وہاں مرزا کا بھی شاید یہی حال ہوتا اور اگر وہ غدر سے پہلے اپنا اردو دیوان رام پور نہ بھیج دیتے۔ تو (ان کا اپنا مجموعہ نواب ضیاء الدین اور نواب حسین مرزا کے کتب خانوں کی تباہی کی وجہ سے تلف ہو گیا تھا) ممکن تھا کہ جس طرح ذوق اور آزاد اور نیرّ درخشاں کا بہت سا کلام اس ہنگامے میں جاتا رہا۔ دیوان غالب بھی اُسی آگ کی نذر ہو جاتا۔

بادشاہ کے اشعار کی اصلاح مرزا نے دو تین سال کی ہو گی۔ اس سلسلہ میں انہیں بادشاہ کی طرف سے ملک الشعرا یا اس طرح کا کوئی اور خطاب نہیں ملا۔ اور ممکن ہے کہ بادشاہ ان کی طرزِ شاعری کا بہت مداح نہ ہو۔ حالی نے بھی ناظر حسین مرزا کی شہادت سے آزاد کے اس نظریے کی تائید کی ہے کہ بادشاہ کے اُستادوں کو ایک پھُول اور ایک کلی سے پورا گلدستہ بنا کر دینا ہوتا تھا۔ ظفر کی نسبت یہ بات بہت مشہور ہے۔ لیکن ظفر اور غالب کا کلام آج بھی موجود ہے۔ کلیات ظفر میں غالب کے صحیح رنگ کی ایک غزل نہیں۔ اور جب ہم کلیات ظفر کا عام معیار دیکھتے ہیں۔ تو یہ خیال کہ اس میں غالب کے نتائج فکر بھی شامل ہیں۔ غالب کی شاعرانہ شہرت کے لئے بہت مفید معلوم نہیں ہوتا۔

مرزا بادشاہ کے اُستاد تو ہو گئے تھے۔ لیکن اب سلطنت کا شیرازہ ہی بکھر رہا تھا۔ جب

بہادر شاہ ۱۸۳۷ء میں بادشاہ ہُوا تو اس سے کہا گیا کہ ایسٹ انڈیا کمپنی پر بادشاہ کے جو حقوق ہیں۔ ان سے وہ دستبردار ہو جائے۔ لیکن بہادر شاہ اپنی بیدست وپائی اور ضعیف العمری کے باوجود اپنے حقوق پر اڑا رہنے کا عادی تھا۔ وہ نہ مانا۔ لیکن اب اس کا انجام قریب نظر آ رہا تھا۔ چنانچہ ۱۸۵۶ء میں فیصلہ ہُوا کہ بہادر شاہ کے بعد شاہی خاندان کو قطب جانا ہوگا۔ اس فیصلہ پر ریذیڈنٹ سے نواب زینت محل کی بڑی جھڑپ ہوئی تھی۔ لیکن یہ فیصلہ برقرار رہا۔ اور اس کے دو سال بعد جب نئے ولیعہد کا تقرر ہُوا۔ تو طے پایا۔ کہ ایک تو بہادر شاہ کے جانشین کو بہادر شاہ سے پنشن کم ملیگی۔ دوسرے اس کا خطاب شاہ نہیں بلکہ شاہزادہ ہوگا۔ یعنی شاہی سلسلہ بہادر شاہ کی ذات کے ساتھ[1] ختم ہو جائیگا:

مرزا حکام رس تھے اور ان باتوں سے بیخبر یا غافل نہ تھے۔ ۱۸۵۲ء ہی میں جب بادشاہ بیمار تھے۔ تو وہ اپنے مستقبل کی نسبت متردد تھے۔ چنانچہ اس زمانے میں منشی ہیرا سنگھ کو لکھا تھا۔ "از شب عہد خاقان رنجور است۔ حالا دیگر چہ رو نماید و من کہ در سایۂ دیوارش غنودہ ام چہ رود"۔ اب جو بہادر شاہ کی جانشینی کے متعلق آخری فیصلہ ہُوا۔ تو انہوں نے سوچا کہ بہادر شاہ کے بعد شاہی سلسلہ تو ختم ہو جائیگا۔ اپنا مستقبل انگریزی حکام سے وابستہ کرنا چاہئے۔ چنانچہ انہوں نے فرمانروائے انگلستان ملکہ وکٹوریا کی تعریف میں ایک فارسی قصیدہ لکھ کر لارڈ کیننگ کی معرفت ولایت بھجوایا۔ اس کے ساتھ ایک عرضداشت تھی۔ کہ روم و ایران کے بادشاہ شعرا پر بڑی بڑی عنایتیں کرتے ہیں اگر شہنشاہ انگلستان مجھے خطاب اور خلعت اور پنشن سے سرفراز کرے تو کوئی تعجب کی بات نہیں۔ یہ تفصیلات مرزا کی اپنی زبان سے سُنئے "در آں پژوہشنامہ از آرزو بدیں انداز نشاں دادہ آمد کہ خسروان روم و ایران و دیگر کشورگیراں را با سخن گستراں و ستائشگراں در بخشائش و بخشش رنگارنگ شمار رفتہ و دہن بہ گہر انباشتن و پیکر بزر ساختن و دہ دادن و گنج فشاندن بکار رفتہ ایں سخن گستر ستائشگر مہرخوانی از زبانِ شہنشاہ و سراپائے بفرمانِ شہنشاہ و نانِ ریزہ از خوانِ شہنشاہ میخواہد۔ ہمانا پانچواں مہرخواں و سراپا و نان ریزی

۱۔ غالباً اسی موقع پر ظفر نے لکھا تھا ؏ "اے ظفر اب ہے تجھی تک انتظامِ سلطنت — بعد تیرے نے ولیعہدی نہ نامِ سلطنت

گفتار خطاب و خلعت و چم نان ریزہ در انگریزی زبان بنیش تواند بود۔" غالب کو لندن سے اس خط کا جواب اخیر جنوری ۱۸۵۷ء میں مسٹر رسل برک کی طرف سے ملا۔ کہ درخواست پر تحقیق کے بعد خطاب اور خلعت وغیرہ کے متعلق حکم صادر ہو گا۔ مرزا کے لئے یہ جواب بہت حوصلہ افزا تھا۔ اور وہ معلوم نہیں امیدوں کے کیسے کیسے قلعے باندھ رہے تھے۔ کہ ۱۱ رمئی ۱۸۵۷ء کو غدر ہو گیا۔"

بابِ ہفتم

غدر

غدر کے دوران میں غالب کے حالات زندگی تلاش کرنے کے لئے ہمیں ان کے خطوط اور قصائد میں بہت کرید کی ضرورت نہیں۔ اس زمانے کے مفصل حالات اُن کی کتاب دستنبو میں درج ہیں۔ سوانحی دلچسپی کے علاوہ اس کتاب کی تاریخی اہمیت بھی بہت ہے۔ کیونکہ یہ کتاب ایسے شخص کی لکھی ہوئی ہے۔ جو شروع سے اخیر تک اس ہنگامے میں شریک رہا۔ اور جس کی راست گوئی کے دوست دشمن سب معترف ہیں لیکن یہ خیال کہ اس کتاب میں تمام حالات صاف صاف اور آزادی سے لکھ دیئے گئے ہونگے۔ صحیح نہیں۔ مرزا خود ایک اردو خط میں منشی ہرگوپال تفتہ کو جو کتاب کی اشاعت کے متعلق متامل تھے۔ لکھتے ہیں "ایک جلد نواب گورنر جنرل بہادر کی نذر بھیجونگا۔ اور ایک بذریعہ ان کے جناب ملکہ معظمہ انگلستان کی نذر کر دوں گا۔ اب سمجھ لو کہ طرزِ تحریر کیا ہوگی۔ اور صاحبانِ مطبع کو اس کا انطباع کیوں نامطبوع ہوگا"۔ اس کتاب کی زبان مہر نیمروز سے نسبتاً صاف ہے۔ اور اگرچہ عربی الفاظ ترک کرنے سے جا بجا غیر متعارف الفاظ استعمال کرنے پڑے ہیں۔ تاہم شاعرانہ رنگ آرائیوں سے مطلب خبط نہیں ہوتا۔ اس میں بیشتر تو ان حادثات کی تفصیل ہے۔ جو مرزا پر گذرے۔ لیکن اس کے علاوہ

عام حالات کا تذکرہ بھی مفصل ہے۔ شروع میں ابتدائی عبارت اور اپنے تذکرہ کے بعد ۱۱ رمئی ۱۸۵۷ء کے واقعات لکھے ہیں۔ جب میرٹھ سے باغی فوج دہلی آئی اور یہاں قتل و غارت کا بازار گرم کیا۔ اس میں موثر ترین حصہ انگریز بچوں اور عورتوں کے قتل کے متعلق ہے۔ جس کا مرزا کو بیحد قلق تھا "ہیچ مشت خاکے نماند کہ از خونِ گل اندامان ارغوان زار نشد و ہیچ کنج باغے نبود کہ از بے برگی مانا بزخمہ نوبہار نشد ہائے آں جہانداران دادآموزش دانش اندوز نکوخوے نکونام وآہ ازاں خاتونانِ پریچہرہ نازک اندام بارخے چوں ماہ و تنے چوں سیم خام و دریغ آں کودکانِ جہاں نادیدہ کہ در شگفتہ روئی بہ لالہ و گل خندید و در خوشخرامی بہ کبک و تدرو و آہو میگرفتند کہ ہمہ یکبارہ بہ گرداب خوں فرو رفتند"۔ مرزا کو انگریز بیگناہوں کے قتل کا ہمیشہ افسوس رہا۔ چنانچہ غدر سے کئی سال بعد ایک اُردو خط میں لکھا ہے "انگریز قوم میں سے جو ان روسیاہ کالوں کے ہاتھ قتل ہوئے۔ ان میں کوئی میرا امیدگاہ تھا۔ اور کوئی میرا دوست اور کوئی میرا یار اور کوئی میرا شاگرد"۔

اس قتل عام کے بعد جو لوٹ مار روا ہوئی۔ اس کی تفصیل دی ہے۔ "خسانیکہ بروز از بہر فروختن خاک زمین می کافتند در خاک خردہ زر یافتند و کسانیکہ بشب در بزم مے از آتشِ گل چراغ می افروختند در کلبۂ تار بداغ ناکامی سوختند زیور و پیرایہ لولیانِ شہر جز آنما یہ کہ در گردن و گوشِ زن و دختر تسگیہ دست ہمہ در بغبۂ شہروانِ سیہ کار ناجوانمرد ست"۔ اس قتل و غارت کے بعد باغیوں نے قلعہ کا رُخ کیا اور مرزا نے جو کچھ لکھا ہے۔ اس سے بہادرشاہ کے اُس دعویٰ کی تائید ہوتی ہے۔ کہ وہ غدر کے دوران میں مجبور تھا۔ اور سپاہ کا حاکم نہیں بلکہ محکوم تھا۔ مرزا لکھتے ہیں "چوں شاہ سپاہ را نتوانست راند۔ سپاہ فرود آمد و شاہ فرو ماند ؎

شاہ را در میاں گرفت سپاہ　　　　دیں گرفتن بود گرفتن ماہ
شاہ ماہِ گرفتہ را ماند　　　　نہ کہ ماہ دو ہفتہ را ماند

دہلی سے انگریزوں کا انتظام اُٹھنے اور دوبارہ دہلی فتح ہونے تک جو حالات رُو پذیر ہوئے ان کی تفصیل نہایت مختصر ہے۔ اور فقط پانچ چھ صفحوں میں اس چار مہینے چار دن کی سرگذشت

ختم کر دی ہے۔ کتاب کا زیادہ حصہ ان تکالیف کا بیان ہے۔ جو فتح دہلی کے بعد مرزا اور ان کے عزیزوں کو پیش آئیں۔ اور جنہیں انہوں نے نہایت درد ناک طریقے سے قلمبند کیا ہے۔[1]

۱۸ ستمبر ۱۸۵۷ء کو دہلی پر انگریزوں کا دوبارہ قبضہ ہو گیا۔ مرزا اس دن کی سرگذشت لکھتے ہیں۔

"کشور گیراں شہر وارک سر نا سر گرفتند غوغائے زد و گشت و گیرو دار تا بدیں کوچہ نیز رسید۔ دہمہ ما از ہم دل دو نیم شد باید دانست کہ ایں کوچہ جز یک راہ وبیش از دہ دوازدہ خانہ ندارد۔ از دو چاہ دریں کوئے بست۔ بیشتر از زن و مرد بدیں بود کہ زن را بچہ در آغوش است و مرد را پشتوارہ بر دوش بدر زدند تنے چند کہ بجا ماندہ بہمدستانئے من کہ از سخن پذیری گریزند اشتم در از دروں بستند و پیرامن آں سنگ بسنگ بہم پیوستند تا کوچہ چنانکہ سر بستہ بود در بستہ نیز شد۔"

اس قید خانے سے باہر شہر کی جو حالت تھی اس کی نسبت لکھتے ہیں "در ہمہ شہر از پانزدہم ستمبر ہر خانہ دہر کلبہ را در فراز ست۔ دفروشندگاں وخرندگاں ناپید۔ گندم فروش کجا۔ کہ دانہ خرندگاز کو کہ جامہ بہر شستن بوے سپرند۔ گرا کجا جویند کہ موئے سر سترد۔ پاکار را کجا یابند کہ پلیدی ببرد"

غالب اور اُن کے ساتھیوں کا باہر سے تعلق منقطع ہوا تو پانی وغیرہ کا سلسلہ بھی بالکل بند ہو گیا۔ "خوش و ناخوش از خورش ہر چہ لختے بود۔ خوردہ شد۔ دآب بداں کوشش کہ پنداری چاہ بناخن کندہ اند آشامیدہ آمد۔ دیگر در کوزہ وسبو آب و در مرد و زن تاب نماند۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ و دو شبانہ روز در تشنگی و گرسنگی گزشت"

جب دو دن اس طرح بے آب و نان گزر گئے۔ تو تیسرے روز خوش قسمتی سے مہاراجہ پٹیالہ نے حکیم محمود خاں اور ان کے عزیزوں کے مکانوں کی حفاظت کے لئے جو سپاہی بھیجے تھے۔ وہ آپہنچے۔ لوگوں کو جان کا ڈر تھا۔ وہ کچھ کم ہوا۔ تو انہوں نے سپاہیوں سے پانی کے لئے استمداد کیا۔ چنانچہ انہیں بازار کے سرے تک جانے کی اجازت ملی۔ اور ہر گھر سے ایک ایک دو دو آدمی خُم وسبو اٹھائے پانی کی تلاش میں نکلے۔ لیکن میٹھے پانی کے کوئیں دُور تھے۔ اور وہاں تک جانا موت کو دعوت دینا تھا۔ ناچار ایک ایک نمکین کوئیں سے ہی پانی بھر لائے۔ اور اس سے پیاس کی آگ بجھائی۔ لیکن نمکین پانی سے کہاں تسکین

[1] ممکن ہے۔ کہ مرزا نے ان ایام کے حالات بھی تفصیل سے لکھے ہوں۔ لیکن فتح دہلی کے بعد ان کی اشاعت نامناسب خیال کی ہو۔

ہوتی ہے۔ لوگ نڈھال ہو رہے تھے۔ اور مرزا تسکین دیتے تھے۔ کہ جو ہمارا روزی رساں ہے وہ ہمیں بھلائے گا نہیں۔ چنانچہ مرزا لکھتے ہیں کہ ان کی دعائیں قبول ہوئیں۔ ایک روز بادل آئے اور خوب مینہ برسا۔ لوگوں نے چادر باندھی۔ اور اس کے نیچے گھڑا رکھ کر پانی جمع کیا۔ اور اپنی پیاس بجھائی۔ مرزا لکھتے ہیں "گویند ابر آب از دریا بردارد۔ و بر روئے زمین فرو بارد۔ و این بار ابر گراں مایہ ہما سایہ آب از چشمۂ زندگی آورد۔ ہر آنچہ سکندر در پادشاہی جست۔ این تلخ کام شورابہ آشام در تباہی یافت"۔

معلوم ہوتا ہے کہ مہاراجہ پٹیالہ کے سپاہیوں کی وجہ سے مرزا کا گھر لوٹ سے تو محفوظ رہا لیکن جو زیورات اور قیمتی چیزیں مرزا کے گھر سے کالے شاہ صاحب کے تہ خانے میں بھجوا دی گئیں تھیں۔ وہ فتح مند فوج نے کھود نکالیں۔ علاوہ ازیں دستنبو سے پتہ چلتا ہے۔ کہ سپاہیوں کی روک ٹوک کے باوجود چند گورے ۵ اکتوبر کو دیوار پھاند کر اس محلے میں آداخل ہوئے۔ اور انہوں نے دوسرے چھوٹے گھروں کو چھوڑ کر مرزا کے گھر کا رُخ کیا۔ مرزا کا بیان ہے۔ کہ انہوں نے مال اسباب کو نہیں اُٹھایا۔ البتہ مرزا عارف کے دو بچوں اور چند ہمسایوں کو قطب الدین سوداگر کی حویلی میں کرنیل براؤن کے سامنے لے گئے۔ جہاں چند سوال وجواب ہوئے۔ اور مرزا کو اسی روز گھر جانے کی اجازت مل گئی۔ اس واقعہ کی نسبت مرزا نے تو بہت کچھ صراحتاً نہیں لکھا۔ لیکن نواب غلام حسین خاں[1] نے غدر کے متعلق جو حالات لکھے ہیں۔ اس میں مرزا کے متعلق ذیل کا اندراج ہے "مرزا اسد اللہ خاں عرف مرزا نوشہ صاحب کے گھر میں چند گورے گھس کر ان کو گرفتار کرکے لے گئے اور کرنیل براؤن صاحب کے سامنے لے جاکر ان کو پیش کیا۔ مرزا صاحب کی کچھ زندگی ابھی باقی تھی۔ اُن کے ایک دوست اتفاق سے اس وقت وہاں بیٹھے ہوئے تھے۔ انہوں نے انکی سفارش کرکے رہائی دلوائی"۔

---

[1] نواب غلام حسین خاں عارف کے والد اور مرزا کے ہمزلف تھے۔

مرزا تو سخت جان تھے۔ ساٹھ برس کی عمر میں یہ مصیبتیں دیکھیں اور بچ نکلے۔ لیکن ان کے بھائی مرزا یوسف اس قدر خوش قسمت نہ تھے۔ ان کا تیس برس کی عمر سے دماغ خراب تھا۔ اور غالب کے مکان سے دُور وہ علیحدہ مکان میں رہتے تھے۔ جس قدر موروثی پنشن مرزا کو سرکاری خزانے سے ملتی تھی۔ اسی قدر مرزا یوسف کو ملتی تھی۔ ان کی بیوی اور بچے بھی ان کے ساتھ رہتے تھے۔ لیکن معلوم ہوتا ہے۔ جب دہلی کی فتح ہوئی۔ تو قیامت کی طرح نفسی نفسی کا عالم تھا۔ ان کی بیوی اور بچے انہیں چھوڑ کر بھاگ نکلے۔ گھر پر ان کے پاس ایک بوڑھی نوکرانی اور ایک بوڑھا دربان رہ گئے۔ مرزا کو بھی یہ اطلاع ملی۔ لیکن بے بس تھے۔ ایسی حالت میں کچھ نہ کر سکتے تھے "کہ فرستادن وآں سو تن و کالا را بدینجا آوردن اگر جادو دانستمے نتوانستمے"۔ اس میں کوئی شک نہیں۔ کہ بھائی کا فکر ان کے دل پر بھاری بوجھ تھا۔ چنانچہ لکھتے ہیں "من ہمہ در بند آنم کہ برادر بشب چوں خفت و بروز چہ خورد۔ و ناآگہی بداں پایہ کہ نمیتوانم گفت کہ زندہ است یا بسختی مُرد"۔ ۲۰ ستمبر کو جب انہیں اپنا دروازہ بند کئے ہوئے پندرہ سولہ دن ہو رہے تھے۔ انہیں اطلاع ملی۔ کہ فوجی مرزا یوسف کے گھر آئے۔ اور سب کچھ لے گئے۔ لیکن انہیں اور بوڑھے نوکروں کو زندہ چھوڑ گئے ؛

نواب معین الدین جو مرزا کے قریبی رشتہ دار تھے۔ غدر کے حالات میں لکھتے ہیں۔ کہ مرزا اسد اللہ خاں کا بھائی مرزا یوسف خاں جو عرصے سے مخبوط الحواس تھا۔ گولی کی آواز سن کر یہ دیکھنے کہ کیا ہو رہا ہے۔ گھر سے باہر آیا اور مارا گیا۔ لیکن مرزا کا بیان اس سے مختلف ہے۔ وہ لکھتے ہیں۔ کہ ۱۹ اکتوبر کو صبح کے وقت مرزا یوسف کا بوڑھا دربان آیا اور خبر لایا کہ مرزا یوسف پانچ دن کے مسلسل بخار کے بعد رات کو گزر گئے۔ مرزا کی حالت اس وقت بہت خراب تھی۔ ایک تو بھائی کی موت کا صدمہ۔ پھر میت کا انتظام بہت مشکل تھا۔ نہ کفن کے لئے کپڑا۔ نہ مردہ نہلانے کے لئے مُردہ شو۔ اور نہ قبر کھودنے کے لئے گورکن۔ اس کے علاوہ اگرچہ فتح دہلی کو ایک مہینے سے زیادہ عرصہ گزر گیا تھا۔ شہر میں دو تین آدمیوں کا دوش بدوش چلنا ہی ناممکن تھا۔ شہر سے باہر میت لے جانے کی ہمت کسے پڑتی۔ لیکن مرزا کے ہمسایوں نے مرزا کی بیکسی پر رحم کیا۔ اور تجہیز و تکفین کی طرف متوجہ

ہوئے ۔ چنانچہ پٹیالے کے سپاہیوں میں سے ایک آدمی آگے آگے چلا ۔ اور مرزا کے دو نوکروں کو ساتھ لے کر میت کو نہلایا ۔ اور گھر سے جو دو تین چادریں لے گئے تھے ۔ ان میں لپیٹ کر قریب کی ایک مسجد میں مرزا یوسف کو دفن کیا ۔ دستنبو سے یہ امر واضح نہیں ہوتا ۔ کہ بھائی کی تدفین کے وقت مرزا موجود تھے ۔ لیکن اگر وہ تھے بھی اور نمازِ جنازہ کا بھی کسی طرح انتظام ہو گیا ۔ تب بھی مرزا یوسف کا انجام ان کی زندگی سے کم حسرتناک نہیں معلوم ہوتا ۔

دریغ آنکہ اندر درنگِ سہ بیست [۶۰]   سہ دہ [۳۰] شاد و سی سال ناشاد زیست
نہ خاکِ بالیں نہ خشتش نبود   بجز خاک در سر نوشتش نبود
خدایا بریں مردہ بخشائشے   کہ نادیدہ در زیست آسائشے

معلوم ہوتا ہے ۔ فتح دہلی کے بعد جو افراتفری مچی ۔ وہ ایک دو مہینے میں ختم نہیں ہو گئی ۔ جنوری ۱۸۵۸ء میں ہندوؤں کی آبادی کا حکم ہو گیا تھا ۔ لیکن مرزا فروری ۱۸۵۸ء میں لکھتے ہیں ۔ کہ ابھی تک وہی حالت ہے دن کو بیقرار رہنا اور رات کو اطمینان سے نہ سونا باقی ہے ۔ اور اطمینان بھی کیسے ہوتا ۔ جبکہ مخبریوں اور گرفتاریوں کا سلسلہ ابھی جاری تھا ۔ چنانچہ دوم فروری کو حاکم شہر چند سپاہیوں کیساتھ غالب کے محلہ میں آیا اور حکیم محمود خاں کو جن کی موجودگی سے غالب اور دوسرے لوگوں کو بڑا سہارا تھا ۔ دوسرے ساٹھ آدمیوں سمیت اپنے ساتھ لے گیا ۔ وہ غالباً زیر حراست رہے ۔ لیکن بقول غالب آبرو والوں کی آبرو کا بھی خیال رکھا گیا ۔ حکیم محمود خاں اور چند دوسرے معززین کو تو تین روز کے بعد واپس جانے کی اجازت مل گئی ۔ اور چند آدمی ایک ہفتہ کے بعد رہا ہوئے ۔ لیکن نصف سے زیادہ لوگ وہیں رہے ۔ معلوم ہوتا ہے کہ جس طرح اس زمانے میں غالب کی جائے پناہ حکیم محمود خاں کا دروازہ تھا ۔ شہر کے اور کئی معززین نے بھی حکیم صاحب کے ہاں پناہ لی تھی ۔ اور حاکم شہر کے پاس کسی نے ان لوگوں کے خلاف مخبری کی تھی ۔ لیکن حکیم صاحب ان لوگوں کی بیگناہی کے قائل تھے اور مہاراجہ پٹیالہ سے تعلقات کی وجہ سے جو کچھ ان کا اثر تھا ۔ وہ اُنھوں نے بے گناہوں کو بچانے کے لئے صرف کیا ۔ چنانچہ اپریل ۱۸۵۸ء میں باقی لوگ بھی رہا ہو گئے ۔ حکیم محمود خاں کی یہی عالی ہمتی

تھی۔ جس کے متعلق حالی نے مرثیۂ محمود خاں میں لکھا ہے ۔

وہ زمانہ جبکہ تھا دلی میں اک محشر بپا — نفسی نفسی کا تھا جب چاروں طرف غل پڑ رہا
اپنے اپنے حال میں چھوٹا بڑا تھا مبتلا — باپ سے فرزند اور بھائی سے بھائی تھا جدا
موجزن تھا جبکہ دریائے عتاب ذو الجلال
باغیوں کے ظلم کا دنیا پہ نازل تھا وبال

دیکھکر یاروں کو جب آنکھیں چرا جاتے تھے یار — ساتھ دینا تھا کسی کا موت سے ہونا دو چار
یار سے یار آشنا سے آشنا تھے شرمسار — شہر میں تھی چارسو گویا قیامت آشکار
آگ تھی اک مشتعل ایسی کہ تھا جس سے خطر
جل نہ جائیں اس کے شعلے سے کہیں سب خشک و تر

مجرم و بے جرم میں تھا حاکموں کو اشتباہ — عدل تھا مجرم کا دشمن اور بری کا عذر خواہ
مجرموں کے جرم پر دیوار و در تھے سب گواہ — پر نہ تھا کوئی شفیع اُن کا کہ جو تھے بے گناہ
ایسے نازک وقت میں مردانگی اُس نے جو کی
اہل انصاف اُس کو بھولے ہیں نہ بھولینگے کبھی

بالیقیں جن ملزموں کو اُس نے سمجھا بے خطا — مارشل لا میں ثبوت اُن کی صفائی کا دیا
چین سے بیٹھا نہ جب تک ہو گیا اک اک رہا — جو کہ تھے نادار کی اُن کی اعانت بر ملا
زر دیا کھانا دیا کپڑا دیا بستر دیا
بے ٹھکانوں کو ٹھکانا بے گھروں کو گھر دیا

مرزا نے دستنبو میں اپنے دوسرے دوستوں کی سرگذشت لکھی ہے۔ نواب ضیاء الدین اور نواب امین الدین جس ہفتے شہر فتح ہوا تھا۔ اسی ہفتے اہل و عیال اور چند آدمیوں کے ساتھ اپنی جاگیر لوہارو جانے کے لئے روانہ ہوئے۔ لیکن ابھی مہرولی ہی تھے۔ کہ لٹیرے سپاہیوں نے آگھیرا۔ اور بدن پر جو کپڑے تھے اُن کے سوا سب کچھ لے گئے۔ دہلی میں جو اُن کے گھر پر گذری۔ وہ اس سے بڑھکر تھی۔

"اینجا در خانہ و کاشانہ و کاخ و کلوخ ہر چہ بود بتاراج رفت۔ نہ از سیمینہ و زرینہ نام و نشاں ماند و نہ از گستردنی و پوشیدنی باندازۂ تار موئے درمیاں ماند"۔ مظفر الدین حیدر خاں اور ذو الفقار الدین حیدر خاں۔ (حسین مرزا) پر جو گزری وہ اس سے بھی دردناک تھی۔ وہ شہر کے باقی معزز لوگوں کی طرح اپنے شاندار اور پُر شکوہ مکان چھوڑ کر جان کر بھاگ نکلے تھے۔ جس طرح شہر میں اور گھر لوٹے گئے۔ ان کے گھر میں بھی جھاڑو دی گئی۔ لیکن اوروں کے ہاں مکان تو سلامت رہے۔ یہاں کسی نے مکان کے پردوں اور سائبانوں میں آگ لگا دی۔ چنانچہ لکڑی اور پتھر اور در و دیوار سب جل کر راکھ ہو گئے۔ نواب ضیاء الدین اور حسین مرزا کو جو مصیبتیں پیش آئیں۔ بہت دردناک تھیں۔ لیکن ایک خاص طور پر قابلِ افسوس بات یہ ہے۔ کہ اُن کی تباہی کی وجہ سے مرزا کا کلام ضائع ہو گیا۔ جو ان کے ہاں جمع ہوتا تھا۔ چنانچہ مرزا غدر کے بعد ایک اُردو خط میں لکھتے ہیں "بھائی ضیاء الدین خاں صاحب اور ناظر حسین مرزا صاحب ہندی فارسی نظم و نثر کے مسودات مجھ سے لیکر اپنے پاس جمع کر لیا کرتے تھے۔ سو ان دونوں گھروں پر جھاڑو پھر گئی۔ نہ کتاب رہی نہ اسباب رہا"۔ ہم لکھ چکے ہیں کہ ۱۸۵۷ء میں مرزا نے اپنے اُردو کلام کا ایک نسخہ رامپور بھیجا تھا۔ وہ تو سلامت رہا۔ اور اس کی نقلوں سے ۱۸۶۱ء میں موجودہ اردو دیوان تیار ہوا۔ لیکن ظاہر ہے۔ کہ اگر مرزا نے اس کی نقل بھیجنے کے بعد کوئی اردو اشعار لکھے[1] تو وہ اس میں موجود نہ ہونگے۔ اسی طرح کئی فارسی خطوط اور شاید اشعار بھی ضائع ہوئے ہونگے۔ مرزا ایک اردو خط میں لکھتے ہیں "پنج آہنگ" نا مکمل ہے۔ اور اُس کے مکمل ہونے کا کوئی امکان نہیں"۔

مندرجہ بالا واقعات تو تمامتر "دستنبو" سے ماخوذ ہیں۔ لیکن مرزا نے اردو رقعات میں اپنے باقی دوستوں پر اس پُر آشوب زمانے میں جو کچھ گزری اس کی داستان قدرے تفصیل سے لکھی ہے۔ اور چونکہ مرزا کے یہ دوست ایوانِ ادب کے شاندار ستون بھی تھے۔ ہم اُن کے حالات مرزا کے خطوط

[1] دیوان کے آخر میں نواب ضیاء الدین کی جو تقریظ ہے۔ اس میں دیوان کا سال ترتیب ۱۸۵۵ء دیا ہے۔ اور اشعار کی تعداد ۱۷۹۰۔ لیکن فی الواقع قلمی نسخہ رامپور میں اشعار کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ اور غالباً اس کی وجہ یہ ہے۔ کہ ترتیب دیوان کے بعد مرزا نے جو اشعار لکھے۔ وہ قلمی نسخہ میں شامل کر لئے گئے۔ لیکن تقریظ کی عبارت نہ بدلی گئی۔

سے انتخاب کر کے ذیل میں درج کرتے ہیں :

نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ کو غدر کے بعد سات سال قید کا حکم ہوُا تھا۔ وہ ایک معزز جاگیردار اور اردو فارسی کے باکمال شاعر تھے۔ اور اردو شعرا کا جو تذکرہ فارسی زبان میں انہوں نے "گلشن بے خار" کے نام سے لکھا تھا۔ اس کے صفحے صفحے سے اُن کا پاکیزہ ادبی مذاق ظاہر ہوتا ہے۔ انہوں نے آزاد کی طرح واقعات کو نمک مرچ لگا کے پیش نہیں کیا تھا۔ اس لئے ان کا تذکرہ خواص کی آنکھ کی عینک ہے۔ آب حیات کی شہرتِ عامہ اسے حاصل نہیں ہوئی۔ لیکن اُن کے مختصر فقرے بلاغت کی جان ہیں۔ اور جب اس تذکرہ میں اُن کی میانہ روی اور انصاف پسندی۔ جس کا گارسَن دتاسی بہت مداح تھا۔ دیکھتے ہیں۔ تو یہ بات بھی سمجھ میں آتی ہے۔ کہ حالی کیوں کہتا تھا۔ کہ میں نے غالب سے بہت کم سیکھا ہے۔ اور میری تحریر کی سادگی اور سچائی اور صحیح ادبی مذاق کچھ تو طبعی تھا اور بیشتر شیفتہ کے فیضِ صحبت کا نتیجہ۔ مرزا نواب کی نثر اور شاعری اور مذاقِ شعر کے مداح تھے۔ اس کے علاوہ جو مہربانیاں ان پر قید کے دوران میں نواب نے کی تھیں۔ وہ بھی بھولی نہ ہونگیں۔ چنانچہ ان کی مصیبت دل پر ایک گہرا زخم تھا۔ ایک خط میں لکھتے ہیں "مصطفےٰ خاں کا حال سُنا ہوگا۔ خدا کرے مرافعہ میں چھوٹ جائے۔ ورنہ حبس ہفت سالہ کی تاب اس نازپروردہ میں کہاں"۔ چنانچہ جب نواب کی اپیل کامیاب ہوئی۔ اور وہ رہا ہوگئے تو مرزا اس بے دست و پائی کے باوجود "بمجرد استماع اس خبر کے ڈاک میں بیٹھ کر" میرٹھ گئے۔ اُن سے ملے۔ اور چار دن قیام کے بعد واپس آئے :

مولانا مفتی صدرالدین آزردہ جو فارسی کے بلند پایہ شاعر اور عربی کے زبردست عالم تھے۔ غدر سے پہلے دہلی میں صدرالصدور تھے۔ لیکن اس کے باوجود محفوظ نہیں رہے۔ مرزا ۱۸۶۲ء کے ایک خط میں لکھتے ہیں "حضرت جناب مولوی صدرالدین صاحب بہت دیر حوالات میں رہے کورٹ میں مقدمہ پیش ہوُا۔ روبکاریاں ہوئیں۔ آخر صاحبان کورٹ نے جاں بخشی کا حکم دیا۔ نوکری موقوف۔ جائداد ضبط۔ ناچار خستہ و تباہ لاہور گئے۔ فنانشل کمشنر اور لفٹنٹ گورنر نے ازرہِ ترحم نصف جائداد واگذاشت کی۔ اب نصف جائداد پر قابض ہیں"۔

سب سے زیادہ حسرت ناک انجام مولوی فضل حق خیر آبادی کا ہوا۔ جو علاوہ اپنی علمی اور دینی قابلیت کے اس لئے بھی یاد کے مستحق ہیں۔ کہ انہوں نے غالب کو بیدل کی تقلید سے روکا اور اس کی شاعری کے لئے ایک "استادِ کامل" ثابت ہوئے۔ جو بقول میر تقی میر مرزا کی شاعری کی نشوونما کے لئے ضروری تھا۔ غالباً انہیں کی نسبت یوسف مرزا کے نام ایک اردو خط میں لکھا ہے "مولانا کا حال کچھ تم سے مجھ کو معلوم ہوا۔ کچھ تم مجھ سے معلوم کرو۔ مرافعہ میں حکم دوام حبس بحال رہا بلکہ تاکید ہوئی۔ کہ جلد دریائے شور کی طرف روانہ کرو۔ . . . . . . ان کا بیٹا ولایت میں اپیل کیا چاہتا ہے۔ کیا ہونا ہے۔ جو ہونا تھا۔ سو ہو لیا۔ انا للّٰہ و انا الیہ راجعون" مولینا دہلی سے جلا وطن ہو گئے۔ لیکن مرزا کے دل سے فراموش نہیں ہوئے۔ چنانچہ اکتوبر ۱۸۶۱ء کے ایک خط میں منشی داد خاں سیاح کو لکھتے ہیں "ہاں خانصاحب۔ آپ جو کلکتے پہنچے اور سب صاحبوں سے ملے ہو۔ تو مولوی فضل حق کا حال اچھی طرح دریافت کر کے مجھ کو لکھو۔ کہ اس نے رہائی کیوں نہ پائی اور وہاں جزیرہ میں اس کا کیا حال ہے۔ کس طرح گذارا ہوتا ہے"

مرزا خود تو ان مصائب سے محفوظ رہے۔ لیکن ان کے لئے بھی یہ وقت قیامت کی گھڑی سے کم نہ تھا۔ ایک تو اپنا مستقبل تیرہ و تاریک پھر اتنے دوستوں کا غم۔ بھائی کی موت کا صدمہ۔ اس کے علاوہ اگرچہ وہ لکھتے ہیں۔ کہ ان کے گھر کی کوئی چیز چھوئی نہ گئی۔ لیکن ان کی تمام قیمتی چیزیں جو ان کی بیوی نے حفاظت کے لئے کالے شاہ صاحب کے تہ خانے میں بھجوا دی تھیں۔ وہاں سے نکال لی گئیں۔ مرزا لکھتے ہیں۔ کہ "قسمیہ کہہ سکتا ہوں۔ کہ پہننے اور بچھونے کے علاوہ اور کوئی چیز گھر میں نہ رہی چنانچہ وہ یہی اوڑھنے پہننے کے کپڑے بیچ بیچ کر پیٹ بھرتے رہے۔ "بفروختن آں گستردنی و پوشیدنی جان و تن ہمی پرورم۔ گوئی کہ دیگراں نان می خورند۔ و من جامہ ہمی خورم" لیکن یکم جنوری ۱۸۵۸ء سے شہر میں ہندوؤں کی آبادی کا حکم ہو چکا تھا۔ اور مرزا کے ہندو شاگردوں اور دوستوں نے ان کی اس مصیبت کے وقت میں ان کی بڑی مدد کی۔ منشی ہرگوپال تفتہ آگرے سے روپے اور کپڑے بھیجتے رہے۔ شراب جو ان کے لئے نانِ خوردنی سے بھی زیادہ ضروری تھی۔ مہیش داس مہیا کرتے

رہے۔ اور ان کی تنہائی میں ہیرا سنگھ، شوجی رام اور بالمکند غمگساری اور خدمت گاری کے لئے حاضر رہتے تھے۔ لیکن مرزا کا ہاتھ خرچ کے معاملے میں ہمیشہ آزاد رہا تھا۔ مالی حالت اُن کی تسلی بخش نہ تھی اور چونکہ مستقبل کی نسبت ابھی کچھ بھی معلوم نہ تھا۔ اس لئے دستنبو کا آخری حصہ جسے انہوں نے یکم اگست ۱۸۵۸ء کو ختم کیا نہایت مایوسانہ ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ سابق پنشن اگر مل گئی تب بھی کچھ نہیں بنے گا اور نہ ملی تو قصہ ہی پاک ہے۔ ”کہن پنشن اگر بدست آید۔ نیز ننگ از آئینہ نمی زدائد و اگر فراچنگ نیامد بہ آبگینہ جز سنگ نیامد۔“

باب ہشتم

دستنبو میں اخیر جولائی ۱۸۵۸ء تک کے حالات ملتے ہیں۔ لیکن چونکہ ڈاک کا سلسلہ اس سے بہت پہلے شروع ہو گیا تھا۔ اور مرزا کے غدر کے بعد کے اُردو خطوط بیشتر محفوظ ہیں۔ اس لئے غالب کے حالات فراہم کرنے میں بہت دقت نہیں ہوتی۔ سوانحی نقطۂ نظر سے یہ خطوط بہت کار آمد ہیں۔ لیکن مرزا کے خطوط کے متعلق یہ خیال غلط ہے کہ وہ بے تکلف دوستانہ خطوط ہیں۔ اور انہیں لکھتے وقت مرزا کو ان کی اشاعت کا خیال نہ تھا۔ نومبر ۱۸۵۸ء سے پہلے جو خطوط مرزا نے لکھے ان کی نسبت تو یہ خیال صحیح ہے۔ لیکن بعد کے خطوط کے متعلق نہیں۔ چنانچہ جب منشی شیو نرائن نے انہیں اردو رقعات چھپوانے کے لئے کہا۔ تو انہوں نے ۱۶ نومبر ۱۸۵۸ء کے ایک خط میں اس کی مخالفت کی۔ وہ لکھتے ہیں "اردو کے رقعات بھی جو آپ چھپایا چاہتے ہیں۔ یہ بھی زائد بات ہے۔ کوئی رقعہ ایسا ہوگا۔ جو میں نے قلم سنبھال کر اور دل لگا کر لکھا ہوگا۔ ورنہ صرف تحریر سرسری ہے۔ ان کی شہرت میری سخنوری کے شکوہ کے منافی ہے"۔ اسی سلسلے میں انہوں نے منشی ہرگوپال تفتہ کو بھی لکھا "رقعات کے چھاپے جانے میں [illegible]ی خوشی نہیں ہے۔ لڑکوں کی سی ضد نہ کرو۔ اور اگر تمہاری

اسی میں خوشی ہے۔ تو مجھ سے نہ پوچھو۔ تم کو اختیار ہے"۔ ظاہر ہے کہ اس کے بعد جو رقعات انہوں نے لکھے ہونگے وہ ان کی اشاعت سے غافل نہیں ہونگے۔ اور اس وقت سے پہلے اور بعد کے خطوط میں جو واضح فرق ہے۔ اس سے بھی ظاہر ہوتا ہے۔ کہ بعد کے رقعات انہوں نے قلم سنبھال کر اور دل لگا کر لکھے +

غالب کے رقعات خواہ کن حالات کے ماتحت لکھے گئے ہوں۔ اُن کی اہمیت بہت ہے۔ تاریخی نقطۂ نظر سے غدر کے بعد دہلی میں جو سناٹا ہُوا تھا۔ اُس کی صحیح اور موثر داستاں انہی خطوط میں ملتی ہے۔ مکتوب نویسی میں بھی ان خطوط نے ایک نیا معیار قایم کر دیا۔ ورنہ ممکن تھا کہ اگر اس طرح کے خطوط لوگوں کی نظر کے سامنے نہ آتے تو اردو نظم نے جہاں فارسی نظم کی پیروی کی ہے۔ وہاں اُردو خطوط بھی رقعات بیدل اور انشائے مادھو رام کی طرز پر لکھے جاتے۔ علاوہ ازیں اُردو نثر کی تاریخ میں ان رقعات کا مرتبہ بہت بلند ہے۔ بیشک اس سے پہلے کلکتہ کالج میں کئی ایک کتب مقفیٰ اور مسجع عبارت سے عاری شایع ہو چکی تھیں۔ لیکن اُردو نثر کا مستقبل فورٹ ولیم سے نہیں بلکہ قلعہ دہلی سے وابستہ تھا۔ یہاں بھی دہلی کالج کے سلسلے میں صاف اُردو میں چند کتابیں شایع ہوئی تھیں۔ لیکن وہ محض ترجمے تھے۔ اور ادبی نقطۂ نظر سے بے وقعت یہاں جو رنگ مقبول تھا۔ اس کا نمونہ مولوی غلام امام شہید کے مضامین میں یا آثار الصنادید کے باب چہارم میں ملتا ہے۔ بیشک اس طرز تحریر کو اختیار کرتے وقت عبارت آرائی اور قافیوں اور تشبیہوں کی تلاش میں انشا پرداز کو بہت محنت کرنی پڑتی۔ لیکن نتیجہ فقط یہی کہ اصل مطلب پہ نور پر تو پردے پڑ جاتے۔ غالب نے دہلی کی زبان کو تحریر کا جامہ پہنایا۔ اور اس میں اپنی ظرافت اور موثر طرز بیان سے وُہ گل کاریاں کیں کہ اردوئے معلےٰ خواص و عوام کو پسند آئی۔ اور اردو نثر کے لئے ایک ایسی طرز تحریر قایم ہوگئی۔ جس کی پیروی دوسروں کے لئے لازم تھی +

حالی نے یادگار غالب میں مرزا کے رقعات کا نہایت نفیس انتخاب کر کے ان پہ دلچسپ تبصرہ کیا ہے۔ اس کے علاوہ دو مستقل کتابیں غالب کے خطوط کے متعلق شایع ہو چکی ہیں اسلئے اس جگہ

اُن پر کوئی تبصرہ کرنا تحصیل حاصل سے زیادہ نہیں۔ البتہ اُن کے اس زمانے کے حالات سمجھنے کے لئے جس قدر انتخاب ضروری ہے۔ ہم درج ذیل کرتے ہیں۔

غالب کو جب جان کی سلامتی کا یقین ہؤا تو اُنہیں پنشن کی فکر ہوئی۔ چنانچہ انہوں نے ملکہ وکٹوریہ اور حکام عالیشان کی تعریف میں قصائد لکھ کر حکام دہلی کی معرفت ارسال کئے۔ لیکن ۱۷ مارچ ۱۸۵۸ء کو کمشنر دہلی نے یہ لکھ کر انہیں واپس بھیج دیا کہ ان میں سوائے ستائش ومدح کے کچھ نہیں۔ جب اس سے کچھ پہلے بعد اکتوبر میں دستنبو چھپی۔ تو مرزا نے چند جلدیں نہایت محنت سے مجلد کروا کے دو ولایت اور چار ہندوستان میں حکام اعلیٰ کی نذر کیں۔ معلوم ہوتا ہے۔ یہ کتاب حکام کی نظر میں مقبول ہوئی۔ چنانچہ ڈائرکٹر محکمہ تعلیم یوپی نے بہت تعریف لکھی۔ اور مسٹر میکلوڈ فنانشل کمشنر نے خود لکھ کر کمشنر دہلی کی معرفت یہ کتاب اُن سے منگائی۔ لیکن اس قدر دانی کے باوجود حکام کا دل مرزا سے صاف نہیں ہؤا۔ اور جب جنوری ۱۸۶۰ء میں میرٹھ میں بڑا دربار ہؤا۔ اور سب درباری وہاں بلائے گئے تو مرزا کو وہاں جانے کی اجازت نہ ملی۔ جب گورنر جنرل کا کیمپ میرٹھ سے دہلی آیا۔ اور مرزا نے چیف سیکرٹری کے خیمہ میں ملاقات کے لئے اپنا ٹکٹ بھجوایا۔ تو وہاں سے جواب ملا۔ کہ ایام غدر میں تم باغیوں سے اخلاص رکھتے تھے[1]۔ اب گورنمنٹ سے کیوں ملنا چاہتے ہو۔ چنانچہ مرزا نے لارڈ کیننگ کی تعریف میں جو قصیدہ لکھا تھا ؎

زسالِ نود گہ آبے بروئے کار آمد
ہزار وہشتصد وشصت در شمار آمد

وہ بھی معہ اس حکم کے واپس آیا۔ کہ اب یہ چیزیں ہمارے پاس نہ بھیجا کرو[2]۔

---

[1] معلوم ہوتا ہے۔ کہ مرزا کے متعلق خیال تھا کہ غدر میں انہوں نے بہادر شاہ کی تخت نشینی پر سکہ لکھا تھا۔ یہ خیال غالباً غلط تھا۔ لیکن یہ صحیح ہے کہ غدر کے دوران میں غالب کے تعلقات بہادر شاہ سے منقطع نہیں ہوئے تھے۔ اور آگرہ کے اخبار آفتاب عالمتاب میں بھی لکھا ہے۔ کہ مرزا نوشہ اور مکرم علیخاں نے ۱۳ جولائی ۱۸۵۷ء کے دن بہادر شاہ کی تعریف میں قصیدے پڑھے۔

[2] یہ تمام واقعات مرزا کے اپنے خطوں سے ماخوذ ہیں۔ لطف یہ ہے۔ ان کے باوجود مولینا ابو الکلام آزاد فرماتے ہیں۔ "ان (مرزا) کی غیرت وحمیت نے گوارا نہ کیا۔ کہ فتح دہلی کے بعد فاتح حکام کے سامنے عاجزی وخوشامد کریں" اور "ان کی طبیعت کچھ اس طرح پیدا ہوئی کہ فتح کے بعد قلعہ میں وفاداران سرکاری جمع ہوئے۔ انعامات اور اسنادیں ملیں۔ ۔ ۔ مگر مرزا غالب اپنے بیت الحزن سے نہ نکلے اور کسی حاکم کے آگے جا کر اس کا منتقم وقاہر چہرہ نہ دیکھا" (الہلال ۱۷ جون ۱۹۱۴ء)

مرزا کی پنشن کے متعلق شروع ۱۸۵۹ء میں حوصلہ افزا تحقیقات ہوئی تھی۔ اور انہیں ایک سو روپیہ بطریق امداد بھی ملا تھا۔ لیکن اب جو انہیں دربار کے متعلق یہ جواب ملا۔ وہ پنشن سے بھی مایوس ہو گئے۔ اس زمانے میں انہوں نے مہاراجگانِ الور و پٹیالہ کی تعریف میں قصائد لکھے اور مدد چاہی۔ لیکن جب ادھر سے کچھ نہ حاصل ہوا۔ تو انہوں نے رام پور کا رُخ کیا۔ نواب ۱۸۵۷ء سے اُن کے شاگرد تھے اور گاہے گاہے کچھ بھیجدیا کرتے تھے۔ غدر کے بعد مرزا کی حالت بہت خراب ہوئی۔ تو انہوں نے نواب سے مدد کی درخواست کی۔ چنانچہ نواب کی طرف سے ایک سو روپیہ ماہانہ اُن کی مدد کے لئے جولائی ۱۸۵۹ء کے وسط سے مقرر ہو گیا تھا۔ اب جنوری ۱۸۶۰ء میں مرزا کو حکام انگریزی کی طرف سے مندرجہ بالا جواب ملا۔ تو وہ رام پور گئے۔ وہاں نواب نے ان کی بہت توقیر کی۔ "ملاقات بھی دوستانہ رہی۔ معانقہ و تعظیم جس طرح احباب میں رسم ہے۔ وہ صورتِ ملاقات۔" علاوہ ازیں نواب نے وعدہ کیا۔ کہ اگر مرزا رام پور میں۔ تو دو سو روپے پائیں اور اگر دہلی رہیں تو سو۔ لیکن مرزا عارف کے دو بچوں کو ساتھ لے گئے تھے۔ وہاں وہ گھبرا گئے۔ اسلئے مرزا ڈیڑھ دو مہینے رام پور رہنے کے بعد اخیر مارچ میں دہلی واپس لوٹے۔

مرزا کو خیال تھا۔ کہ نواب کی وساطت سے حکام سے صفائی[1] ہو جائیگی۔ اگرچہ اسمیں کامیابی حاصل نہ ہوئی۔ لیکن نواب کا مرزا سے جو نیم مربیانہ تعلق تھا۔ وہ اور مستحکم ہو گیا۔ اس کے علاوہ اگرچہ مرزا کا دربار و خلعت موقوف ہو گیا تھا۔ اور پنشن کے بارے میں بھی حاکم دہلی نے ان کے خلاف رپورٹ کی تھی۔ حکام بالا کی طرف سے اُن کی پنشن کے اجرا کا حکم ہو گیا۔ اور مرزا جب دہلی واپس پہنچے۔ تو انہیں پنشن کی جو پائی پائی باقی تھی۔ سب ملی۔ چنانچہ ۱۰ مئی ۱۸۶۰ء کو جو خط انہوں نے

---

[1] معلوم نہیں۔ مولانا ابوالکلام آزاد نے کس شہادت کی بنا پر لکھا ہے کہ سرسید نے پنشن کی بحالی کے لئے بہت کوشش کی۔ (الہلال مورخہ ۱۷ جون ۱۹۱۴ء) لیکن یہ بیان غیر اغلب نہیں۔ حیات جاوید کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے۔ کہ ۱۸۶۰ء میں نواب رام پور سے ملنے کے بعد جب مرزا واپسی پر مراد آباد ٹھہرے۔ تو سرسید انہیں سرائے سے اپنے مکان پر لے گئے۔ قرین قیاس ہے کہ مرزا نے اس قیام کے دوران میں اپنے مصائب کا بیان کیا ہو۔ اور سرسید نے انہیں دور کرنے کیلئے اپنا اثر و رسوخ استعمال کیا ہو۔

منشی ہرگوپال تفتہ کو لکھا ہے۔ اس میں تین برس کا زرِ مجتمعہ دو ہزار دو سو پچاس روپیہ پانے اور اس کے ادا ہو گئے قرضے میں خرچ ہو جانے کی تفصیل درج ہے۔ مرزا کی پنشن موروثی تھی۔ اس لئے وہ اب باقاعدہ ملنی شروع ہو گئی تھی۔ لیکن چونکہ ان کی وفاداری کی نسبت حکام کے دل میں شبہات تھے۔ اُن کا درباری اعزاز اور خلعت جو گورنر جنرل کا عطیہ تھے۔ بحال نہ ہوئے۔ مرزا کو اس کا بہت رنج تھا لیکن خوش قسمتی سے مارچ ۱۸۶۳ء میں حکام نے یہ شکایت خود بخود رفع کر دی۔ چنانچہ مرزا غالب بہادر منشی غلام غوث بیخبر کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں " دو شنبہ دوم مارچ کو سوادِ شہر خیمہ خیام گورنری ہُوا۔ آخر روز میں اپنے شفیق قدیم جناب مولوی اظہر حسین خاں بہادر کے پاس گیا۔ اثنائے گفتگو میں فرمایا۔ کہ " تمہارا دربار و خلعت بدستور بحال و برقرار رہا ہے۔ متحیرانہ میں نے پوچھا۔ کہ حضرت کیونکر۔ حضرت نے کہا کہ " حاکم حال نے ولایت سے واپس آکر تمہارے علاقے کے سب کاغذ انگریزی و فارسی دیکھے ہیں۔ اور باجلاس کونسل حکم لکھوایا۔ کہ اسد اللہ خاں کا دربار اور نمبر اور خلعت بدستور بحال و برقرار رہے"۔ چنانچہ رابرٹ منٹگمری لیفٹننٹ گورنر پنجاب نے، جن کی تعریف میں مرزا نے فارسی قصیدہ بھی لکھا تھا۔ ۲۳ مارچ ۱۸۶۳ء کو مرزا کو بلا کر اُنہیں خلعت عطا کیا۔

یکم نومبر ۱۸۵۸ء کو ملکہ معظمہ کا اعلان معافی ہو چکا تھا۔ اور ہندوستان کی عنانِ حکومت کمپنی کے ہاتھ سے نکل گئی تھی۔ لیکن معلوم ہوتا ہے۔ کہ مرزا کا مشہور قصیدہ سہ

در روزگار ما نتواند شمار یافت

خود روزگار آنچه درین روزگار یافت

جس کی نسبت حالی کا خیال ہے کہ اعلانِ معافی کی تقریب پر لکھا گیا اس سے پہلے کہ یہ اعلان معافی یکم نومبر ۱۸۵۸ء کو ہُوا۔ اور یہ قصیدہ اس سے پہلے ستمبر ۱۸۵۸ء میں دستنبو کے ساتھ چھپ بھی چکا تھا۔ جب مرزا اس اعلان سے قطعاً بیخبر تھے۔ اس قصیدے کے کئی اشعار پیچیدہ اور ذومعنی ہیں۔ لیکن غالباً یہ فتح دہلی کی مبارکباد ہے۔ نہ کہ اعلانِ معافی کا شکریہ۔

اعلانِ معافی یکم نومبر ۱۸۵۸ء کو ہُوا۔ اور اس سے ہندوستان کی تاریخ میں ایک نئے باب

کا آغاز ہوا۔ لیکن اگرچہ سوائے ان لوگوں کے جنکے خلاف خاص ثبوت تھے۔ عوام کی جاں بخشی کا حکم ہو گیا۔ معلوم ہوتا ہے۔ دہلی کا شیرازہ جو بکھرا ہوا تھا۔ اُسے بندھتے بہت دیر لگی۔ ہندوؤں کی آبادی کا حکم جنوری ۱۸۵۸ء ہی میں ہو گیا تھا۔ بعد میں کچھ مسلمانوں کو شہر میں آنے جانے کے لئے ٹکٹ ملنے شروع ہوئے۔ اور پھر بعض کو شہر میں چند شرطوں کے ماتحت رہنے کی اجازت ملی۔ تعزیری ٹیکس نومبر ۱۸۵۹ء میں عائد ہوا۔ چنانچہ مرزا ۹ر نومبر کے ایک خط میں لکھتے ہیں "پون ڈیوٹی (Town Duty) کے باب میں کونسل ہوئی۔ پرسوں ۷ر نومبر سے جاری ہو گئی۔ سالگ رام خزانچی، چھنا مل، مہیش داس ان تینوں شخصوں کو یہ کام بطور امانی سپرد ہوا ہے۔ غلہ اور اُپلے کے سوا کوئی جنس ایسی نہیں ہے۔ کہ جس پہ محصول نہ ہو۔ آبادی کا حکم عام ہے۔ خلق کا اژدحام ہے۔ آگے حکم تھا کہ مالکان مکان رہیں۔ کرایہ دار نہ رہیں۔ پرسوں سے حکم ہو گیا ہے۔ کہ کرایہ دار بھی رہیں کہیں یہ نہ سمجھنا کہ تم یا ہم کوئی اپنے مکان میں کرایہ دار کو آباد کرے۔ وہ لوگ جو گھر کا نشان نہ رکھتے تھے۔ اور ہمیشہ سے کرایہ کے مکان میں رہتے تھے۔ وہ بھی آ رہیں۔ مگر کرایہ سرکار کو دیں"۔ لیکن اسی سال دسمبر میں جب گورنر جنرل نے میرٹھ میں دربار کیا۔ تو "مسلمانوں کی املاک کے واگذاشت کا حکم عام ہو گیا۔ جن کو کرایہ پہ ملی تھیں۔ ان کو کرایہ معاف ہو گیا"۔ علاوہ ازیں مرزا ۱۳ر دسمبر ۱۸۵۹ء کے ایک خط میں لکھتے ہیں "اتنا مسموع ہوا ہے۔ کہ ایک محکمہ لاہور میں معاوضہ نقصان رعایا کے واسطے تجویز ہوا ہے۔ اور حکم یہ ہے۔ کہ جو رعیت کا مال کالوں نے لوٹا ہے۔ البتہ اُس کا معاوضہ وہ یک سرکار سے ہوگا"۔ دہلی کو چونکہ پنجاب کے حکام نے فتح کیا تھا۔ اس کا نظم و نسق بھی اب انہی کے ہاتھوں میں تھا۔ اور نئے انتظامات کے ماتحت دہلی صوبۂ پنجاب کا حصہ تھی۔ لیکن معلوم ہوتا ہے۔ اکثر اہالیانِ دہلی اس انتظام سے خوش نہ تھے۔ مرزا ایک خط میں لکھتے ہیں "زنہار کبھی یہ گمان نہ کیجیے گا۔ کہ دہلی کی عملداری میرٹھ اور آگرہ اور بلادِ شرقیہ کی مثل ہے۔ یہ پنجاب احاطہ میں شامل ہے۔ نہ قانون نہ آئین۔ جس حاکم کی جو رائے میں آئے وہ ویسا ہی کرے"۔ یوسف مرزا کو ایک لطیفہ لکھا ہے "سنو حافظ ممّو بے گناہ ثابت ہو چکے۔ رہائی پا چکے۔ حاکم کے سامنے حاضر ہوا کرتے ہیں۔ املاک اپنی مانگتے ہیں قبض و تصرف ان کا ثابت ہو چکا

ہے۔ صرف حکم کی دیر ہے۔ پرسوں وہ حاضر ہوئے۔ مثل پیش ہوئی۔ حاکم نے پوچھا "حافظ محمد بخش کون؟" عرض کیا کہ "میں"۔ پھر پوچھا کہ "حافظ ممّو کون؟" عرض کیا کہ "میں۔ اصل نام میرا محمد بخش ہے ممّو ممّو مشہور ہوں"۔ فرمایا یہ کچھ بات نہیں۔ حافظ محمد بخش بھی تم۔ حافظ ممّو بھی تم۔ سارا جہاں بھی تم۔ جو دنیا میں ہے وہ بھی تم۔ ہم مکان کس کو دیں"۔ مثل داخل دفتر ہوئی۔ میاں ممّو اپنے گھر چلے آئے!

میر مہدی جو دہلی کے حالات بار بار پوچھتے تھے۔ انہیں غدر کے بعد دہلی کا جو نقشہ بدلا تھا۔ اس کی تفصیل ایک خط میں لکھتے ہیں:۔ "پرسوں میں سوار ہو کر کنوؤں کا حال دریافت کرنے گیا تھا۔ مسجد جامع سے راج گھاٹ دروازہ تک بلا مبالغہ ایک صحرا لق و دق ہے۔ اینٹوں کے ڈھیر جو پڑے ہیں۔ وہ اگر اٹھ جائیں۔ تو ہُو کا مکان ہو جائے۔ یاد کرو۔ مرزا گوہر کے باغیچہ کے اُس جانب کوئی بانس نشیب تھا۔ اب وہ باغیچہ کے صحن کے برابر ہو گیا۔ یہاں تک کہ راج گھاٹ کا دروازہ بند ہو گیا۔ فصیل کے کنگورے کھلے رہے ہیں۔ باقی سب اٹ گیا۔ کشمیری دروازہ کا حال تم دیکھ گئے ہو اب آہنی سڑک کے واسطے کلکتہ دروازہ سے کابلی دروازہ تک میدان ہو گیا۔ پنجابی کٹڑہ۔ دھوبی واڑہ۔ رامجی گنج۔ سعادت خاں کٹڑہ۔ جرنیل کی بی بی کی حویلی۔ رامجی داس گودام والے کے مکانات۔ صاحب رام کا باغ حویلی ان میں سے کسی کا پتہ نہیں ملتا +

"قصہ مختصر شہر صحرا ہو گیا۔ اور اب جو کوئیں جاتے رہے اور پانی گوہر نایاب ہو گیا۔ تو یہ صحرا صحرائے کربلا ہو جائے گا۔ اللہ اللہ دِلّی والے اب تک یہاں کی زبان کو اچھا کہتے ہیں۔ واہ رے حسنِ اعتقاد بندۂ خدا۔ اُردو بازار نہ رہا۔ اردو کہاں دِلّی کہاں۔ واللہ اب شہر نہیں ہے کیمپ ہے چھاؤنی ہے۔ نہ قلعہ نہ شہر نہ بازار نہ نہر"۔ ایک اور خط میں لکھا ہے "بھائی کیا پُوچھتے ہو کیا لکھوں۔ دِلّی کی ہستی منحصر کئی ہنگاموں پہ ہے۔ قلعہ۔ چاندنی چوک۔ ہر روز مجمع جامع مسجد کا۔ ہر ہفتہ سیر جمنا کے پُل کی۔ ہر سال میلہ پھول والوں کا۔ یہ پانچوں باتیں اب نہیں۔ پھر کہو دِلّی کہاں"۔ یہ خط اخیر ۱۸۶۱ء میں لکھا گیا۔ جامع مسجد جسے گرا دینے کے مشورے دیئے جا رہے تھے۔ ابھی تک واگذاشت نہیں ہوئی۔ چنانچہ فتح دہلی کے پانچ سال بعد ۱۶ر دسمبر ۱۸۶۲ء کو مرزا ایک خط

ہیں لکھتے ہیں "جو ہائے حالِ دہلی والو۔ سلام لو۔ مسجد جامع واگذاشت ہوگئی۔ چتلی قبر کی طرف سیڑھیوں پہ کبابیوں نے دکانیں بنالیں۔ انڈا مرغی کبوتر بکنے لگا۔ دس آدمی مہتمم ٹھہرے۔ مرزا الٰہی بخش۔ مولوی صدرالدین۔ تفضل حسین خاں۔ تین یہ سات اور ۔۷ نومبر ۱۴ جمادی الاول سال حال جمعہ کے دن ابوالظفر سراج الدین بہادر شاہ قیدِ فرنگ و قیدِ جسم سے رہا ہوئے۔ انا للہ و انا الیہ راجعون "

باب نہم

چراغِ سحری

غدر کا ہنگامہ فرو ہوئے اب کئی سال ہو چکے تھے۔ دہلی جہاں تک تبدیل حالات کیساتھ ممکن تھا۔ اپنی پرانی حالت پہ آ رہی تھی۔ بظاہر تو غالب کو اس وقت ہر طرح مطمئن ہونا چاہیئے تھا۔ رام پور سے باقاعدہ سو روپیہ ماہوار آتے تھے۔ پنشن جاری تھی۔ دربار اور خلعت بھی بحال ہو چکے تھے۔ لیکن "قاطع برہان" کی اشاعت سے انہوں نے جو مخالفت عامہ مول لی۔ اُس نے یہ زمانہ اُن کے لئے بہت تلخ کر دیا۔ قاطع برہان اوائل ۱۸۵۹ء میں لکھی گئی۔ اور اکتوبر ۱۸۶۱ء کے بعد شایع ہوئی۔ ہمارے خیال میں اس کتاب کو دستنبو کا ثمر ثانوی سمجھنا چاہیئے۔ دستنبو کی تحریر میں مرزا نے عربی الفاظ استعمال نہ کرنے کا التزام کیا تھا۔ اب انہیں الفاظ کے اصل اور معانی پر زیادہ غور کرنے کی ضرورت پڑی۔ جس کے لئے انہوں نے مشہور فارسی لغت برہان قاطع[1] کا غائر مطالعہ کیا۔ علاوہ ازیں اس وقت ان کے پاس پارسیوں کی کتاب دساتیر بھی تھی۔ اور چونکہ عربی الفاظ ترک کرنے کی وجہ سے قدیم فارسی کے کئی الفاظ انہیں استعمال کرنے پڑے۔ انہوں نے دیکھا ہو گا کہ "برہان قاطع" میں جو معنی دیئے ہیں وہ دساتیر کی عبارت پر نہیں پھبتے۔ چنانچہ جب دستنبو ختم ہو گئی

[1] جو برہان' مرزا کے زیر مطالعہ تھی اور جس کے حاشیہ پر انہوں نے جا بجا مصنف اور کتاب کے خلاف فقرے لکھے ہیں وہ اب نواب سر امیر الدین کے پاس ہے

اور انہیں برہان کو بغور پڑھنے کی فرصت ملی۔ تو انہیں کئی بے قاعدگیاں نظر آئیں۔ انہیں اکٹھا کر کے انہوں نے دس جزو کا ایک رسالہ قاطع برہان کے نام سے شائع کیا۔ یہ رسالہ تو اب کمیاب ہے لیکن اس کی اشاعت کے تین چار سال بعد مرزا نے دوسرا ایڈیشن "درفش کاویانی" کے نام سے شائع کرایا تھا۔ جس کی ایک جلد برٹش میوزیم لائبریری میں موجود ہے۔ اس کتاب کی سب سے بڑی خصوصیت جو ایک سرسری مطالعہ سے بھی واضح ہوتی ہے۔ مرزا کی آزادی قوت فیصلہ ہے۔ ہم نے اس کتاب کے شروع میں اشارہ کیا ہے۔ کہ جس طرح مولانا اسمٰعیل نے کورانہ تقلید کے خلاف لوگوں کو ابھارا تھا۔ مرزا بھی رائے عامہ کے پابند نہ تھے۔ اور ہر ایک مسئلہ پہ آزادانہ تنقید جائز بلکہ ضروری سمجھتے تھے۔ چنانچہ وہ درفش کاویانی کے دیباچہ میں لکھتے ہیں "مرا نیسز خردے وروانے دادہ اند۔ فرازآوردہ (یعنی نتائج) اندیشہ بیگانگاں را چوں پذیرم واز نیرو ئے خرد خداداد کار چہ انگیرم" وہ نہ صرف اپنے معاصرین کی رائے کو بہ نظر تنقید دیکھتے تھے بلکہ مولینا اسمٰعیل کی طرح اگلوں کے فیصلہ کے سامنے اندھا دھند سر نہ جھکاتے تھے۔ چنانچہ وہ تفتہ کو اسی زمانے میں ایک خط میں لکھتے ہیں "یہ نہ سمجھا کرو۔ کہ اگلے جو لکھ گئے ہیں۔ وہ حق ہے۔ کیا آگے احمق نہیں پیدا ہوتے تھے"!

لیکن ظاہر ہے کہ جس طرح یہ نقطۂ نظر کہ جو اگلے کہتے تھے۔ سب درست ہے۔ صحیح نہیں۔ اسی طرح کورانہ تقلید کو چھوڑ کر اندھا دھند مخالفت اختیار کرنے میں بھی کوئی مصلحت نہیں۔ ہر ایک مسئلہ کا فیصلہ اس کے اپنے حسن و قبح سے ہو سکتا ہے۔ لیکن اس بارے میں بھی ہم دیکھتے ہیں۔ کہ عام اغلاط اور الفاظ کے معانی سے قطع نظر فن لغت میں مرزا نے جو اصول وضع کئے ہیں۔ اور ان کے لحاظ سے برہان قاطع پہ نکتہ چینی کی ہے۔ وہ بیشتر صحیح ہیں۔ مثلاً مرزا کا یہ خیال کہ اگر لغت میں مصدر کے معنی دیئے جائیں۔ تو مشتق کے معنی دینے کی ضرورت نہیں رہتی۔ درست ہے۔ اور اس اصول کو نظر انداز کر کے مصنف برہان نے الفاظ کا ذخیرہ بہت بڑھا دیا تھا۔ اسی طرح شعرا نے الفاظ سے جو معانی استعارے کے طور پہ کسی خاص نظم میں مراد لئے تھے۔ انہیں بھی مصنف نے علیحدہ لغت کے طور پہ درج

کیا تھا۔ چنانچہ مرزا لکھتے ہیں "افزودن شمارۂ لغات بہر صورت پیش نہاد ۔ ۔ ۔ ۔ چنانکہ کمال اسمعیل را خلاق المعانی لقب است ۔ اگر ایں بزرگوار را خلاق الالفاظ خوانند چہ عجب است ۔"

ان اصولی اعتراضوں کے علاوہ مرزا کو بعض الفاظ کے معانی سے بھی اختلاف تھا۔ اور یہ اختلاف انہیں اکثر فرہنگ نویسوں سے تھا۔ وہ وجہ اس کی یہ دیتے تھے "جتنی فرہنگیں اب موجود ہیں۔ مشہور و غیر مشہور۔ کچھ کم سو رسالے ہونگے۔ ان سب رسالوں کے جامع ہندی ہیں۔ کوئی اہل زبان نہیں ہے۔ اشعار اساتذہ ایران کو ماخذ ٹھہرا کر جو لغات ان کی نظم میں دیکھے۔ بلحاظ سبت مقام ان لغات کے معنی لکھ دیئے۔ استنباط معنی مدار قیاس پر" مرزا کہتے تھے۔ کہ ایسی فرہنگیں بے وقعت ہیں۔ جو اہلِ زبان کہیں۔ صحیح ہے۔ حقیقتاً یہ ایک نہایت پیچیدہ مسئلہ ہے۔ جس پر آج بھی اہل الرائے متفق نہیں۔ اور اگرچہ مرزا کی رائے بہت حد تک صحیح ہے۔ یہ امر بھی غور طلب ہے۔ کہ آخر اساتذہ شعرا بھی تو بیشتر اہل زبان ہیں۔ اور اہل زبان اپنے الفاظ کے جو معنی بتائینگے۔ انہیں اساتذہ کے کلام پر ٹھیک بٹھانا بھی ضروری ہوگا۔ اور اس طرح ان کے معانی اور فرہنگ نویسوں کے دیئے ہوئے معانی میں بہت فرق نہ ہوگا۔

اگرچہ جیسا کہ اس تفصیل سے ظاہر ہوگیا ہوگا۔ اس مسئلہ میں اختلاف رائے کی بہت گنجائش ہے۔ بدقسمتی سے بحث نے نہایت تلخ رنگ اختیار کر لیا تھا۔ اور اس کی وجہ مرزا کی طرز تحریر تھی۔ ان کی یہ کتاب صاف اور موثر زبان میں لکھی ہوئی ہے۔ لیکن طرزِ تحریر بہت شوخ ہے۔ ہندوستانی فرہنگ نویسوں کی نسبت انھوں نے مرزا تفتہ کے نام اردو خطوط میں جو فقرات لکھے ہیں۔ وہ تو اس قابل نہیں کہ انہیں کہیں دُہرایا جائے۔ قاطع برہان میں بھی انہوں نے صاحب برہان کی نسبت بہت نالائم الفاظ استعمال کئے تھے۔ مرزا نے ایک فارسی قطعے میں ان الفاظ کی درستی کو تسلیم کیا ہے۔ لیکن حالی نے مرزا کی مخالفت کی عجیب توجیہ کی ہے۔ وہ لکھتے ہیں "اگر مرزا صاحب برہان کی نسبت ایسا نہ لکھتے تو بھی مخالفت ضرور ہوتی۔ کیونکہ ہندوستانی کے پرانے تعلیم یافتہ جو آجکل ایک نہایت کس مپرسی حالت میں ہیں۔ ان کے لئے کنج خمول و گمنامی سے نکلنے کا کوئی موقع اس کے سوا باقی نہیں رہا۔ کہ کسی سر برآوردہ

اور ممتاز آدمی کی کتاب کا رد لکھیں۔ اور لوگوں پر ظاہر کریں۔ کہ ہم بھی کوئی چیز ہیں" حالی نے سرسید کی مخالفت کی بھی یہی وجہ دی ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ طرزِ استدلال کسی اعتراض کا جواب نہیں آخر اگر سرسید رسول کریم کے متعلق الفنسٹن کے ناشائستہ الفاظ اپنی کتاب میں نہ درج کرتے یا اپنے عجیب و غریب مذہبی عقائد کا، جن کا آج بھی کوئی قائل نہیں، پرچار نہ کرتے۔ تو ان کی کیوں اتنی مخالفت ہوتی۔ اسی طرح اگر مرزا اس علمی بحث میں ذاتیات کو نہ لے آتے تو مخالفین بھی اینٹ کا جواب پتھر سے نہ دیتے۔ علاوہ ازیں اگر بفرضِ محال یہ مان بھی لیا جائے۔ کہ یہ اپنے تعلیم یافتہ اپنی شہرت کے لئے مشہور آدمیوں کی مخالفت کرتے ہیں۔ تب بھی نا ملائم الفاظ کے استعمال میں جو عیب ہے۔ وہ کم نہیں ہو جاتا۔ حقیقت یہ ہے اور مرزا کے سوانح نگار کو اس امر کا اقرار کرنا پڑتا ہے۔ کہ مباحثہ کرتے وقت وہ اپنے ترکش کے سارے تیر استعمال کرتے تھے۔ اس سے پہلے جب ان کے کلام پر قتیل کے اصولوں کی وجہ سے اعتراض ہوئے تھے تو وہ اُس کا سارا شجرۂ نسب ڈھونڈ لائے تھے۔ اور اب جو انہوں نے برہان قاطع کے مصنف سے اختلاف کیا تو دلائل و براہین پر اکتفا نہیں کی۔ بلکہ اپنے قلم سے تیر اور نشتر کا کام بھی لیا؛

قاطع برہان غالباً ۱۸۶۱ء میں شایع ہوئی۔ اس کا دوسرا ایڈیشن مارچ ۱۸۶۵ء میں رئیس سورت نواب میر غلام بابا خاں کی مالی امداد سے شائع ہوا۔ اس امر سے یہ اندازہ ہو سکتا ہے۔ کہ مرزا کے مداح اس وقت سارے ہندوستان میں موجود تھے۔ بنگال میں میسور کے شاہی خاندان کے رُکن شاہزادہ بشیر الدین۔ اور خان بہادر عبدالغفور نساخ۔ سُورت میں نواب میر غلام بابا خاں۔ لوہارو میں نواب لوہارو کے صاحبزادے مرزا علاء الدین اور بھائی نواب ضیاء الدین غالب کے شاگرد تھے۔ بڑودہ کے رئیس نواب میر ابراہیم علی خاں غزلیں اصلاح کے لئے بھیجتے تھے۔ اور الور کے مہاراجہ غالب کے مداح تھے۔ الہ آباد میں خان بہادر منشی غلام غوث بیخبر اگرچہ قاطع برہان کی بحث میں مرزا سے متفق نہ تھے۔ لیکن اُن کے کمال شاعری کے معترف تھے۔ اسی طرح پنجاب میں ان کی دستنبو بہت مقبول ہوئی۔ اور وہاں ان کے اردو رقعات کی بہت مانگ تھی۔ یہ صحیح ہے۔ کہ حیدر آباد میں

ان کی کوئی قدر نہ ہوئی۔ اور انہوں نے نواب مختار الملک کی تعریف میں جو نفیس قصیدہ ۱۸۶۱ء میں لکھ کر بھیجا تھا اس کا انہیں جواب بھی نہ ملا۔ لیکن اس کے علاوہ تمام ہندوستان میں اُن کے قدردان اور مداح موجود تھے۔ مرزا کے خطوط سے ظاہر ہوتا ہے۔ کہ یہ لوگ کچھ نہ کچھ بھیجتے رہتے تھے۔ لیکن بڑھاپے میں انہیں فکرِ معیشت سے آزاد رکھنے کی سعادت دربار رامپور کے حصے میں آئی۔ نواب یوسف علی خاں ناظم سو روپیہ ماہوار بھیجتے تھے۔ خاص ضرورت کے وقت (مثلاً "قاطع برہان" کی اشاعت کے لئے) جو کچھ ملتا وہ اس پر مستزاد۔ ان کی وفات اپریل ۱۸۶۵ء میں ہوئی۔ اور نواب کلب علی خاں جانشین ہوئے۔ مرزا نے تہنیت جلوس کا قصیدہ لکھ کر بھیجا تھا۔ اور جب نواب نے مسند نشینی کا جشن کیا تو مرزا بھی رامپور بلائے گئے۔ چنانچہ بارہ اکتوبر ۱۸۶۵ء کو وہ مرزا باقر علی خاں اور مرزا حسین علی خاں کیساتھ وہاں پہنچے۔ اور جشن میں شریک ہوئے۔ معلوم ہوتا ہے جشن بڑا شاندار تھا۔ مرزا نے بھی ایک خط میں ذکر کیا ہے۔ "روشنی آتشبازی کی وہ افراط کہ رات دن کا سامنا کہے۔ طوائف کا وہ ہجوم۔ حکام کا وہ مجمع کہ اس مجلس کو طوائف الملوک کہنا چاہئے۔ مرزا قریباً تین مہینے رامپور رہے۔ واپسی پر مراد آباد راہ میں تھا۔ وہاں پہنچ کر بیمار ہوگئے۔ اتفاق سے وہاں کے صدر الصدور مرزا کے شناسا تھے۔ انہوں نے پوری طرح تیمارداری اور غمخواری کی۔ پانچ سات دن کے بعد صحت ہوئی۔ تو وہ دہلی پہنچے لیکن معلوم ہوتا ہے کہ اگرچہ انہیں عارضی طور پر افاقہ ہو گیا۔ طبیعت اس کے بعد اکثر خراب ہی رہی۔ وہ ۱۲ مئی ۱۸۶۶ء کے ایک خط میں لکھتے ہیں "آگے ناتوان تھا۔ اب نیم جان ہوں۔ آگے بہرا تھا۔ اب اندھا ہوا چاہتا ہوں۔ رامپور کے سفر کا رہ آورد ہے"۔ اس سے تین چار سال پہلے بھی وہ فسادِ خون کی وجہ سے قریباً ایک سال بیمار رہے تھے۔ اب ان کی عمر بھی ستر برس کے لگ بھگ ہو رہی تھی۔ اور ضعفِ پیری روز بروز غالب آرہا تھا۔ "جلوۂ خضر" کے مؤلف سید فرزند احمد صفیر بلگرامی اسی زمانے میں اُن سے ملنے دہلی آئے تھے۔ اور ان سے ملاقات کا حال اپنی کتاب میں یادگار چھوڑ گئے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں "حضرت کا لباس اُس وقت یہ تھا۔ پاجامہ سیاہ بوٹے دار دریس کا۔ کلی دار نیفہ سُرخ ٹول کا۔ بدن میں مرزائی۔ سر کھلا ہُوا۔ رنگ سُرخ سفید۔ مُنہ پر ڈاڑھی دو انگل کی۔ آنکھیں

بڑی۔ کان بڑے۔ قد لمبا۔ ولایتی صورت۔ پاؤں کی انگلیاں بسبب کثرتِ شراب کے موٹی ہو کر اینٹھ گئی تھیں۔ اور یہی سبب تھا۔ کہ اُٹھنے میں دقت ہوتی تھی۔ آنکھوں میں نور موجود تھا۔ کان کے سماعت میں کچھ ثقل آچلا تھا" سید فرزند احمد کئی روز دہلی مقیم رہے۔ اس دوران میں مرزا اور ان کے درمیان جو ادبی گفتگو ہوئی۔ اُسے بھی انہوں نے درج کتاب کیا ہے۔ اور مرزا کے کھانے کی تفصیل لکھی ہے۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ابھی تک وہ اچھی غذا کھاتے تھے ؛

مرزا سے مؤلف جلوۂ خضر کی ملاقات ۱۲۸۲ھ میں ہوئی۔ شعر و شاعری اس وقت بہت حد تک ترک ہو چکی تھی۔ انہوں نے آخری فارسی غزل ۱۸۶۵ء میں نواب امین الدین کے ایما پر اور آخری اُردو غزل نواب کے صاحبزادے مرزا علاء الدین کے اصرار پر ۱۸۶۶ء میں لکھی لیکن نواب رامپور کی تعریف میں شعر گوئی اس کے بعد بھی جاری رہی۔ مرزا کے ان اشعار سے پتہ چلتا ہے۔ کہ ان کے قلم میں ابھی بہت جان باقی تھی۔ لیکن بدقسمتی سے غدر کے بعد اُن کا بہت سا وقت برہان قاطع کے متعلق مباحثہ میں تلف ہوا۔ ہاں اُردو خطوط کا بیشتر حصہ اس زمانے کی یادگار ہے۔ اور وہ مرزا کے تاج شہرت کے آبدار موتی ہیں۔ مرزا بھی اب ان کی قدر جانتے تھے۔ چنانچہ منشی غلام غوث بیخبر کو ایک خط میں لکھتے ہیں "میر ممتاز علی کیا کہتے ہیں رقعے جمع کئے۔ اور چھپوائے نہیں۔ پنجاب احاطہ میں ان کی بڑی مانگ ہے"۔ عود ہندی بقول پروفیسر مہیش پرشاد مرزا کی وفات سے چار مہینے پہلے ۲۷ اکتوبر ۱۸۶۸ء کو شایع ہوا۔ لیکن معلوم ہوتا ہے۔ اُردوئے معلیٰ مکمل دیکھنا غالب کو نصیب نہیں ہوا۔ کیونکہ ۶ مارچ ۱۸۶۹ء کو رقعات کا یہ مجموعہ مرزا کے دوست حکیم غلام رضا خاں کے مطبع اکمل المطابع میں چھپ کر شایع ہوا۔ اور پندرہ فروری کو ان کا انتقال ہو چکا تھا۔ اس مجموعہ کی تیاری میں مرزا نے بھی مدد دی۔ اور اپنے دوستوں سے خطوط اور ان کی نقلیں منگائیں۔ لیکن معلوم ہوتا ہے۔ کہ بیماری کی وجہ سے مرزا اس پر نگہِ تنقید نہیں ڈال سکے۔ کیونکہ اس میں کئی ایسے خطوط جن کا نظر انداز ہونا ہی بہتر تھا۔ شائع ہو گئے ہیں۔ کتاب سے پتہ چلتا ہے۔ کہ یہ مجموعہ منشی جواہر سنگھ کی تحریک سے شروع ہوا۔ میر فخر الدین مہتمم مطبع اور منشی بہاری لال مشتاق نے خطوط جمع کئے۔ دیباچہ میر مہدی اور خاتمہ مرزا قربان علی بیگ سالک نے لکھا۔ دوسرا مجموعہ

جو عودِ ہندی کے نام سے شایع ہوُا - اردوئے معلیٰ سے مختصر ہے - اس کے جمع کرنے کا خیال منشی ممتاز علی خاں رئیس میرٹھ کو ہوُا - اور انہوں نے خواجہ غلام غوث بیخبر اور چودھری عبد الغفور سرور کی مدد سے غالب کے اردو خطوط جمع کئے - اور قریباً سات آٹھ سال کی محنت کے بعد اسے سنہ ۱۸۶۸ء میں شایع کر دیا - اس کے ابتک بارہ ہزار نسخے چھپے ہیں - غالب کے خطوط کے اب تک کئی ایڈیشن شایع ہو چکے ہیں - جو نسخہ لاہور میں شیخ مبارک علی نے طبع کرایا ہے - وہ بہترین ہے - لیکن اب بھی کئی اصحاب کے پاس غالب کے غیر مطبوعہ خطوط بتائے جاتے ہیں اور کوئی ایڈیشن بھی مکمل نہیں کہلا سکتا

جب سید فرزند احمدؐ سے مرزا کی ملاقات ہوئی - اسوقت مرزا کی عُمر قریباً ستّر سال کی تھی - معلوم ہوتا ہے - اس کے بعد صحت تیزی سے بگڑنی شروع ہوگئی کیونکہ مرزا کی وفات تہتّر برس کی عُمر میں ہوئی - اور حالی لکھتے ہیں "مرنے سے کئی برس پہلے چلنا پھرنا موقوف ہو گیا تھا - اکثر اوقات پلنگ پہ پڑے رہتے تھے - غذا کچھ نہ رہی تھی" - ان کی اس حالت کا ذکر کئی خطوں میں ہے - لیکن اس کی موثر ترین تصویر خواجہ عزیز الدین عزیز لکھنوئی نے کھینچی ہے - جو لکھنؤ سے کشمیر جاتے وقت راستے میں غالب سے ملے تھے - وُہ لکھتے ہیں :-

"مرزا صاحب کا مکان پختہ تھا - ایک بڑا پھاٹک تھا - جس کی بغل میں ایک کمرہ اور کمرے میں ایک چارپائی بچھی ہوئی تھی - اس پر ایک نحیف البجثہ آدمی ، گندمی رنگ ، اسّی بیاسی سال کا ضعیف العمر لیٹا ہوا ، ایک مجلد کتاب سینے پر رکھے آنکھیں گڑائے ہوئے پڑھ رہے تھے - یہ مرزا غالب دہلوی ہیں - جو بگمانِ غالب دیوانِ قاآنی ملاحظہ فرما رہے ہیں

ہُم نے سلام کیا - لیکن بہرے اس قدر تھے - کہ ان کے کان تک آواز نہ گئی - آخر کھڑے کھڑے واپس آنے کا قصد کیا - کہ غالب نے چارپائی کی پٹّی کے سہارے سے کروٹ بدلی - اور ہماری طرف دیکھا - ہم نے سلام کیا - بمشکل چارپائی سے اُٹھ کر فرش پر بیٹھے - ہم کو اپنے پاس بٹھایا - قلمدان اور کاغذ سامنے رکھ دیا - اور کہا آنکھوں سے کسی قدر سوجھتا بھی ہے - لیکن کانوں سے بالکل سنائی نہیں دیتا - جو کچھ میں پوچھوں اس کا جواب لکھ کر دو نام ونشاں پوچھا - ہمارے ساتھ جو صاحب گئے تھے - ہر چند انہوں نے تعارف کرانے کی کوشش کی مگر بے سُود ہوئی - جب ہم نے نام و پتہ لکھا

تو کہا "مجھ سے ملنے کے لئے آئے ہو۔ تو ضرور کچھ نہ کچھ کہتے ہو گے۔ کچھ اپنا کلام بھی سناؤ"۔ ہم نے کہا ہم تو آپ کا کلام زبانِ مبارک سے سُننے کی غرض سے آئے تھے۔ بہت دیر تک اپنا کلام سُناتے گئے۔ پھر اصرار کیا کہ تم بھی کچھ سُناؤ۔ ہم نے یہ مطلع سُنایا ؎

مہ مصراست داغ از رشکِ مہتابے کہ من دارم
زلیخا کور شد از حسرتِ خوابے کہ من دارم

عجیب لطف اور مزے سے اس مطلع کو دہرایا۔ اور حد سے زیادہ تعریف کی۔ پھر آدمی سے کہا "کھانا لاؤ"۔ ہم سمجھے بہ خیال مہمان نوازی تکلیف کر رہے ہیں۔ مکرّر کہا کہ ہم صرف تھوڑی دیر کیلئے دہلی اُتر پڑے تھے۔ ریل کا وقت بالکل قریب ہے۔ اور بگھی سرائے میں کھڑی ہے۔ اسباب بندھا ہُوا رکھا ہے۔ بار بر کاب آپ سے ملنے آئے تھے۔ اب اجازت چاہتے ہیں۔ کہنے لگے۔ آپ کی عنایت اس تکلیف سے یہ تھی۔ کہ میری صورت اور کیفیت ملاحظہ فرمائیں۔ ضعف کی حالت دیکھی کہ اُٹھنا بیٹھنا دشوار ہے۔ بصارت کی حالت دیکھی کہ آدمی کو پہچانتا نہیں ہوں۔ سماعت کی کیفیت ملاحظہ کی کہ کوئی کتنا چیخے مجھے خبر نہیں ہوتی۔ غزل پڑھنے کا انداز ملاحظہ کیا۔ کلام سُنا۔ اب ایک بات باقی رہ گئی ہے۔ کہ میں کیا کھاتا ہوں۔ اور کتنا کھاتا ہوں۔ اس کو بھی ملاحظہ کرتے جائیے"۔ اتنے میں کھانا آیا۔ دو پھلکے اور ایک طشتری میں بھُنا ہُوا گوشت جس میں کچھ میوہ بھی پڑا ہُوا تھا۔ پھلکے کا باریک پرت لے کر دو چار نوالے بمشکل کھائے۔ اور کھانا بڑھا دیا۔ تعجب ہوتا ہے کہ اس مقدارِ خوراک پہ کیوں کر بسر کرتے ہیں"۔

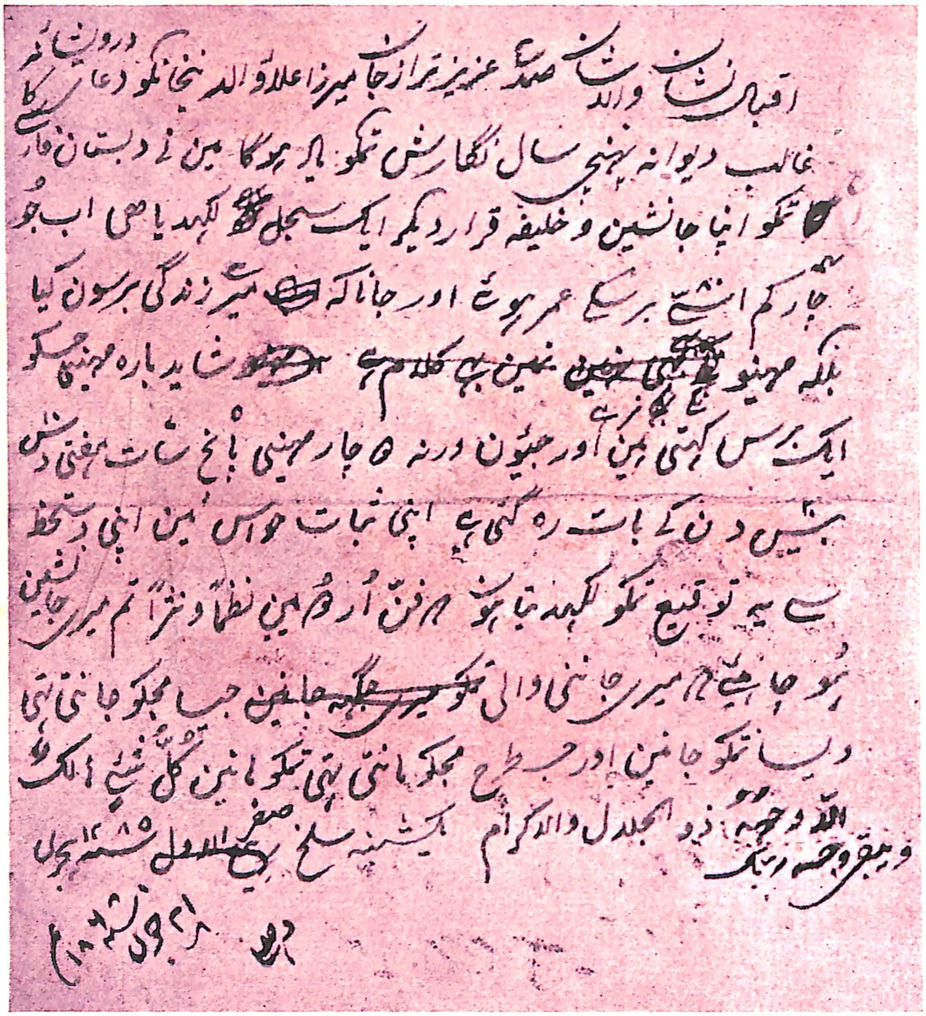
اخیر عمر میں کمزوری اور ضعفِ قویٰ کی وجہ سے مرزا کی یہ حالت ہو گئی تھی۔ تو جائے حیرت نہیں کہ وہ موت کی بہت آرزو کیا کرتے تھے۔ اور ہر سال اپنی وفات کی تاریخ نکالتے۔ لیکن اس بے بسی کی حالت میں بھی شعر و ادب سے دلچسپی باقی تھی۔ اور خطوط لکھنے یا لکھوانے کا سلسلہ موت سے ایک روز پہلے تک جاری رہا۔ حالی لکھتے ہیں "مرنے سے چند روز پہلے بیہوشی طاری ہو گئی تھی۔ پہر پہر دو دو پہر کے بعد چند منٹ کے لئے افاقہ ہو جاتا تھا۔ پھر بیہوش ہو جاتے تھے۔ جس روز

انتقال ہُوا۔ اس سے شاید ایک دن پہلے میں ان کی عیادت کو گیا تھا۔ اس وقت کئی پہر کے بعد افاقہ ہُوا تھا۔ اور نواب علاؤ الدین احمدؔ خاں کے خط کا جواب لکھوا رہے تھے۔ انھوں نے لوہارو سے حال پوچھا تھا۔ اس کے جواب میں ایک فقرہ اور ایک فارسی شعر جو غالباً شیخ سعدی کا تھا لکھوایا۔ فقرہ یہ تھا: "کہ میرا حال مجھ سے کیا پوچھتے ہو۔ ایک آدھ روز میں ہمسایوں سے پُوچھنا"۔ اور شعر کا پہلا مصرع مجھے یاد نہیں رہا۔ دُوسرا مصرع یہ تھا: "نکمد ہجر مدار امن سر تو سلامت"۔ مرنے سے پہلے اکثر یہ شعر وردِ زبان رہتا تھا ؎

دم واپسیں بر سر راہ ہے
عزیزو اب اللہ ہی اللہ ہے

آخر مرزا کی مصیبتوں کے خاتمہ کا وقت آگیا۔ اور ذیقعد ۱۲۸۵ھ کی دوسری (فروری ۱۸۶۹ء کی پندرھویں) کو تہتر برس اور چار مہینے کی عمر میں رہگرائے عالم جاودانی ہوئے تجہیز و تکفین نواب ضیاء الدین احمدؔ خاں کی طرف سے ہوئی۔ اور حضرت سلطان نظام الدین قدس سرہ کی درگاہ میں جہاں مشہور شاعر امیر خسرو کا مزار بھی ہے۔ اپنے خسر نواب الٰہی بخش خاں معروف کے پائین مزار دفن ہوئے۔

إِنَّا لِلّٰہِ وَإِنَّا إِلَیْہِ رَاجِعُوْن



اقبال نشان والا شان سعادت عزیز تر از جان میرزا علاؤالدین خانکو (دعا) درویش نم
غالب دیوانہ پہنچے سال گزشتہ تمکو یاد ہوگا میں نے دبستان فارسی کا
تمکو اپنا جانشین و خلیفہ قرار دیکر ایک سجل لکھدیا تھا اب جو
چار کم اسی برس کی عمر ہوئی اور جانا کہ میری زندگی برسوں کیا
بلکہ مہینوں کی بھی نہیں ہے کلام ہے شاید بارہ مہینے جسکو
ایک برس کہتے ہیں اور جیئوں ورنہ چار مہینے پانچ سات ہفتے دس
بیس دن کی بات رہ گئی ہے اپنی ثبات حواس میں اپنے دستخط
سے یہ توقیع تمکو لکھدیتا ہوں کہ فن اردو میں نظماً و نثراً تم میرے جانشین
ہو چاہیئے کہ میرے جاننے والے تمکو میری جگہ جانیں جب مجکو جانتے تھے
ویسے تمکو جانیں اور جس طرح مجکو مانتے تھے تمکو مانیں کل شیء ہالک
ویبقی وجہ ربک ذو الجلال والاکرام یکشنبہ سلخ صفر سنہ ۱۲۸۵ ہجری
۲۱ جون سنہ ۱۸۶۸ء [illegible]

تبصرہ

اگرچہ شاعرانِ نغزگفتار   زیک جام اند در بزمِ سخن مست
ولے با بادۂ بعضے حریفاں   خمارِ چشمِ ساقی نیز پیوست

مشو منکر کہ در اشعارِ ایں قوم
ورائے شاعری چیزے دگر ہست

تبصرہ

غالب کے تذکرہ نویس

ہم یہ تو ذکر کر چکے ہیں کہ شعرا کے تذکروں میں غالب کو اس وقت سے جگہ ملنی شروع ہوگئی تھی۔ جب ابھی وہ آگرہ چھوڑ کر دہلی نہ آئے تھے۔ لیکن ان تذکروں میں کئی خامیاں تھیں۔ ایک تو ان میں اتنے شعرا کا تذکرہ ہوتا تھا کہ کسی ایک کے متعلق تفصیلی حالات کی گنجائش نہ رہتی۔ دوسرے ترتیب ابجد وار ہوتی تھی۔ اس لئے بیان میں تاریخی تسلسل نہ رہتا جب مولینا آزاد نے ان نقائص کو محسوس کر کے اردو شاعری کی نئی طرز سے تاریخ لکھی۔ تو انہوں نے غالب کو بھی اپنی کتاب میں باعزت جگہ دی۔ اور یادگارِ غالب سے پہلے غالب کا مفصل ترین تذکرہ آبِ حیات ہی میں تھا۔ لیکن آزاد ذوق کے شاگرد تھے۔ اور اردو کے بہترین انشا پرداز۔ جہاں کہیں اُنہیں اپنے استاد کا پلہ ہلکا نظر آتا۔ وہ دلائل کی کمی انشا پردازی سے پوری کر دیتے۔ چنانچہ غالب کے حالات سے غالب کے مداح مطمئن نہ ہوئے۔ اور ۱۸۹۷ء میں حالی نے اپنی مشہور کتاب یادگارِ غالب لکھی۔

حالی۔ بجنوری۔ لطیف

اُس وقت سے غالب کے متعلق مضامین اور کتب کا سلسلہ ابتک برابر جاری ہے۔ بیشتر یہ کتابیں اردو دیوان کی شرحیں ہیں جن میں ضمناً مرزا کے حالات درج ہیں۔ اور ان کی شاعری پہ تبصرہ کیا ہے۔ حقیقتاً غالب کے متعلق مستقل کتابیں تین ہیں۔ یادگارِ غالب۔ محاسنِ کلامِ غالب۔ اور ڈاکٹر لطیف کی کتاب۔ جہاں تک سوانحی حالات کا تعلق ہے۔ ابھی تک حالی سے آگے کوئی نہیں بڑھا۔ اور اگرچہ ڈاکٹر لطیف کی کتاب میں اخذ حالات کے بہت سے قیمتی اصول درج ہیں۔ ان اصولوں پہ عمل کرنے کی زحمت کسی نے گوارا نہیں کی۔ تنقیدی نقطۂ نظر سے بھی غالب کی اُردو نثر اور فارسی نظم و نثر پر کوئی تبصرہ یادگار سے بہتر آج تک شایع نہیں ہوا۔ البتہ ان کے اُردو کلام کے متعلق بہت کچھ لکھا جا چکا ہے۔ یادگار کے بعد دوسری کتاب ڈاکٹر بجنوری کا مقدمہ ہے۔ بد قسمتی سے ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری اس میں کئی فقرے ایسے لکھ گئے ہیں۔ جو حقیقت سے زیادہ عقیدت پر مبنی ہیں اور انہوں نے کئی اشعار کو بھی ایسے معنی پہنائے ہیں۔ جو شاعر کے خیال میں نہیں ہو سکتے۔ لیکن ان کا مقدمہ اُردو کی ایک قابلِ ذکر تصنیف ہے۔ ایک تو طرزِ تحریر اور زورِ عبارت کے نقطۂ نظر سے۔ اور دوسرے کلامِ غالب کے کئی پہلوؤں پہ جو تبصرہ انہوں نے کیا ہے۔ وہ وسیع مطالعہ پہ مبنی معلوم ہوتا ہے۔ ڈاکٹر لطیف کی تصنیف کو محاسنِ کلامِ غالب کا جواب سمجھنا چاہیئے۔ ان کی کتاب میں جنوبی ہندوستان کی باقاعدگی اور منطق ہے۔ اور کلامِ غالب کا مطالعہ جن اصولوں پہ انہوں نے کیا ہے۔ وہ شاید ضرورت سے زیادہ کڑے ہیں۔ لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ انہوں نے یہ کتاب لکھ کر اُردو ادب پہ بڑا احسان کیا ہے۔ ایک تو غالب کے متعلق اندھی خوش اعتقادی کا جو سیلاب بہا آتا تھا۔ اُسے اُنہوں نے روکا اور الہلال کے اجرا کے بعد جو جذباتی طرزِ تحریر اور طرزِ تنقید اردو میں عام ہو گیا تھا۔ اُس کی اصلاح کی کوشش کی۔ دوسرے غالب اور کلامِ غالب کے متعلق کئی اہم باتیں تھیں۔ جن کی طرف سب سے پہلے انہوں نے توجہ دلائی۔ لیکن شاید انگریزی تعلیم اور مغربی طرزِ تنقید کے پرستار بھی اس امر سے متفق ہونگے۔ کہ تنقیدی نقطۂ نظر سے بھی

غالب کے متعلق بہترین کتاب ایسے شخص کی لکھی ہوئی ہے۔ جو انگریزی سے قریب قریب نابلد تھا۔ یعنی حالی۔ یہ صحیح ہے کہ یادگار غالب پرانے اصولوں پہ لکھی گئی ہے۔ اور جیسا کہ ڈاکٹر لطیف نے بتایا ہے۔ اس میں کئی خامیاں ہیں۔ لیکن ابھی تک کوئی اور تبصرہ ایسا نہیں شایع ہوا جس میں اس سے کم خامیاں ہوں۔ اور پھر یادگار کے مطالعہ سے وہ یکطرفہ اور غیر معتدلانہ رائے قایم ہونے کا کوئی احتمال نہیں۔ جو اور کتابوں کے مطالعہ سے قائم کی جاسکتی ہے ٭

کلام غالب کی خصوصیات

حالی نے مرزا کے اردو کلام کی چار خصوصیتیں بیان کی ہیں۔ ایک تو جدت مضامین اور طرفگیٔ خیالات کے علاوہ ایسی تشبیہوں کا استعمال جو نہ صرف نئی تھیں۔ بلکہ اظہار مطالب کے لئے بھی بہت موزوں تھیں۔ دوسرے استعارہ وکنایہ کا استعمال۔ تیسرے شوخی اور ظرافت۔ چوتھے ایسے اشعار کی بہتات جن کے ایک سے زیادہ معنی لئے جاسکتے ہیں۔ ان میں سے چوتھی خصوصیت جسے ڈاکٹر بجنوری نے بہت سراہا ہے۔ بعض لوگوں کو بہت پسند ہے۔ اور ہندوستان میں اکثر ایسے اشعار پسند کئے جاتے ہیں۔ جن کے لکھنے اور سمجھنے کے لئے ذہن پہ زور دینا پڑے۔ چنانچہ سنسکرت میں کئی ایسی نظمیں مشہور ہیں۔ جنہیں دائیں سے بائیں پڑھا جائے تو رام کی تعریف ہوتی ہے۔ اور اُوپر سے نیچے تو لکشمن کی لیکن ظاہر ہے۔ کہ ایسے اشعار کا تعلق دل سے نہیں دماغ سے ہوتا ہے۔ اور اگر انہیں کو کمال شعر گوئی سمجھا جائے تو شاعری جسے دلی جذبات کا اظہار ہونا چاہئے معموں کا مجموعہ بن جاتی ہے ٭

باقی تین خصوصیتیں ایسی ہیں۔ جو بادی النظر میں بھی دیوان غالب کے متعلق صحیح معلوم ہوتی ہیں۔ اور حالی نے مناسب مثالوں سے انہیں بہت واضح کر دیا ہے۔ ڈاکٹر بجنوری نے ان مثالوں میں اضافہ کیا ہے۔ اور اپنی کتاب کے باب نہم میں ان تشبیہوں کی مثالیں دی ہیں۔ جو غائر مشاہدہ فطرت پہ مبنی ہیں۔ لیکن جن ترکیبوں کو انہوں نے مرزا کی الفاظ سازی اور خوش نگاری کا نمونہ بتایا ہے (صفحہ ۳۳۸) ان کا جزو غالب بھی استعارے ہی ہیں۔ جن سے دو لفظوں میں غالب نے ایک مکمل تصویر کھینچ دی ہے۔ مثلاً موجِ نگاہ، وادیٔ خیال، فردوسِ گوش، دام تمنا وغیرہ وغیرہ

حقیقتاً مرزا تشبیہہ اور استعارہ کے بادشاہ تھے۔ اور دُنیا کے شاید ہی کسی شاعر کے کلام میں نئی اور موزوں تشبیہوں اور استعاروں کی وہ افراط ہو۔ جو ان کے کلام میں ہے +

ان کا بہت سا ابتدائی اردو کلام صائب کے رنگ میں تھا۔ اور اکثر غزلوں میں مصرعہ ثانی تمثیلاً ہوتا تھا۔ جو تشبیہوں کی افراط اس زمانے کے اشعار میں تھی۔ وہ بعد کے اشعار میں نہیں۔ یہ صحیح ہے کہ وہ تشبیہیں نئی تھیں۔ لیکن انہیں سے کئی انگریز شاعر "جان ڈنن" کی تشبیہوں کی طرح غرابت سے خالی نہ تھیں۔ مثلاً جہاں انہوں نے اپنے "نیئں" "طائرِ رنگ پریدہ" کا گھونسلا بنایا ہے "یا گلِ دستار" کو سوا نیزے پر آئے ہوئے "آفتابِ صبحِ محشر" سے مانا قرار دیا ہے لیکن بعد کی تشبیہیں اس طرح شاعرانہ حُسن یا موزونیت سے عاری نہیں۔ وہ نئی ہیں۔ لیکن اس لئے کہ جن مضامین کی توضیح کے لئے انہیں استعمال کیا ہے۔ وہ بھی نئے تھے۔ مثلاً

سراپا رہنِ عشق و ناگزیرِ الفتِ ہستی — عبادت برق کی کرتا ہوں اور افسوس حاصل کا

بشرع آویزہ وحق ہیجو مجنوں کم نہ آرے — یا — کہ دل با محمل است اما زبان با ساربان دارد

تھی وطن میں شان کیا غالب کہ ہو غربت میں قدر — یا — بے تکلف ہوں وہ مُشتِ خس کہ گلخن میں نہیں

غم چو بہم در افگند رو کہ مُراد میدہد — یا — دانہ ذخیرہ می کند کاہ بباد میدہد

تشبیہہ اور استعارہ کا استعمال فقط مضمون کی وضاحت کے لئے ہی نہیں ہوتا۔ بلکہ ایک کامیاب شاعر کے استعارے اس کے مضامین سے بھی زیادہ دلآویز ہوتے ہیں۔ حافظ کا ایک مشہور شعر ہے ؎

بیا تا گل بیفشانیم و مے در ساغر اندازیم
فلک را سقف بشگافیم و طرحِ دیگر اندازیم

اور ایڈورڈ فٹز جیرالڈ نے بھی عمر خیام کی ایک رُباعی کا ترجمہ کیا ہے :-

Ah, Love! could you and I with Fate conspire
To grasp this sorry Scheme of Things entire,
Would not we shatter it to bits—and then
Remould it nearer to the Heart's Desire!

غالب اس انتہائی شاعرانہ بلندی پر تو کبھی نہیں پہنچے۔ لیکن تخیل کی بیباکی جو ان اشعار کو ممتاز کرتی ہے۔ ان میں بھی بدرجۂ اتم موجود تھی۔ اور تشبیہوں اور استعاروں کی شکل میں ظاہر ہوتی تھی۔ مثلاً حمد میں کہا ہے ع اے فلک ہا حبابِ قلزم تو

یا ایک فارسی مصرع ہے ع خوشا کہ گنبدِ چرخِ کہن فرو ریزد

یا ے
از مہرِ جہانتاب اُمید نظر نیست
این تشنتِ پُر از آتشِ سوزاں بسرم ریز

قدیم یونانی ڈرامہ میں ٹریجیڈی کا ہیرو ایک غیر معمولی اوصاف کا آدمی ہوتا تھا۔ جن مشکلوں سے اُسے واسطہ پڑتا۔ وہ انسانی بس کی نہ ہوتیں۔ مگر وہ پھر بھی ہمت نہ ہارتا۔ غالب نے اپنی زندگی کے متعلق یہی خیال تشبیہوں کی مدد سے ظاہر کیا ہے۔ اور ان میں سے ایک دو تو اس قدر موزوں ہیں۔ کہ ان سے بہتر خیال میں نہیں آسکتیں ے

بوادئے کہ دراں خضر را عصا خُفتست
بسینہ می سپرم راہ گرچہ پا خُفتست

یعنی زندگی کی ایسی دشوار گزار وادی ہیں جہاں خضر کی راہنمائی بھی کام نہیں دیتی اور جہاں میرے پاؤں چلنے سے عاجز ہیں وہاں بھی سینے کے بل چل رہا ہوں!

غالب نے ایک اور جگہ اپنی اس جسارت اور انسانی بے بسی کی تصویر نہایت واضح اور موثر تشبیہوں کی مدد سے پیش کی ہے۔ فرماتے ہیں ے

می ستیزم با قضا از دیر باز
خویش را بر تیغِ عریاں میزنم

لعب با شمشیر و خنجر میکنم
بوسہ بر ساطور و پیکاں میزنم

اشعار کی شرح غالب نے اپنی ایک خصوصیت شاعری کی طرف ایک اردو غزل میں اشارہ کیا ہے ے

مقصد ہے ناز و غمزہ ولے گفتگو میں کام
چلتا نہیں ہے دشنہ و خنجر کہے بغیر

ہر چند ہو مشاہدۂ حق کی گفتگو
بنتی نہیں ہے بادہ و ساغر کہے بغیر

مطلب یہ ہے کہ ایک شاعر جو الفاظ اور استعارے اپنے اشعار میں استعمال کرتا ہے۔ اُن کا شاعرانہ مفہوم اُن کے لفظی معنوں سے مختلف اور کہیں وسیع ہوتا ہے۔ اور ان الفاظ اور استعاروں کی قیمت کاغذی نوٹوں کی طرح ان کی ظاہری حیثیت پر موقوف نہیں ہوتی۔ بلکہ ان کی قیمت وہی ہے۔ جو قلمرو شعر و تخیل میں ان کے لئے قرار دی گئی ہو۔ یہ مرزا کے کلام کی خصوصیت ہی نہیں بلکہ ایک عام حقیقت ہے۔ شعر کا صحیح حظ انہیں لوگوں کا حصّہ ہے۔ جو خود بھی قوتِ متخیلہ سے بہرہ ور ہیں۔ اور جو شعر کے لغوی معنوں میں پھنس کر نہیں رہ جاتے۔ بلکہ اپنی قوتِ متخیلہ کی مدد سے اس وجدانی کیفیت کو محسوس کر سکتے ہیں۔ جسے شاعر نے محسوس کیا۔ اور جس کے اظہار کے لئے الفاظ آخر ایک ناتمام ذریعہ ہیں۔ دیوان غالب کی بہت سی شرحیں لکھی گئی ہیں۔ لیکن بالعموم وہ ان عالم فاضل لوگوں کی لکھی ہوئی ہیں۔ جو لسانیات کے بڑے ماہر ہیں۔ اور جنہوں نے الفاظ کی خاطر کئی جگہ شعریت کو قربان کر دیا ہے۔ اور یہ امر واقعی ہے کہ اگر ایک شاعر کی ترجمانی کے لئے بہترین طریقہ وہی ہے۔ جو شاعر اپنے اشعار کی وضاحت کے لئے خود استعمال کرے۔ تو دیوان غالب کی اکثر شرحیں اس نقطۂ نظر سے غیر تسلی بخش ہیں۔

ہم بتا چکے ہیں۔ کہ پنج آہنگ کے تیسرے حصّے میں غالب نے اپنے فارسی اشعار کا انتخاب کیا ہے۔ اور ان کا محل استعمال بتایا ہے۔ ان سے بھی پتہ چلتا ہے کہ بادی النظر میں جو معانی ان کے اشعار سے لئے جا سکتے ہیں۔ ان کے علاوہ بھی کئی مطالب ان کے خیال میں ہوتے تھے۔ مثلاً ان کا ایک مشہور شعر ہے ؎

خوش است کوثر و پاکست بادۂ کہ درو ست
ازاں رحیقِ مقدس دریں خُمار چہ حظ

حالی نے تو یادگار غالب میں اس شعر کو فقط "رندانہ" بتایا ہے۔ لیکن معلوم ہوتا ہے۔ کہ مرزا کا مفہوم عام اور وسیع تھا۔ انہوں نے اس کا محل استعمال لکھا ہے "گزارش ایمعنی کہ وعدۂ لطف در مستقبل چارۂ ناکامیٔ حال نمی تواند بود"

اسی طرح ایک فارسی شعر کا دوسرا مصرعہ ہے :-

آمیختن بباده صافی گلاب را

اس پر وہ لکھتے ہیں "شرح ماجرائے خوئے دوست عتاب آمیختہ بناز" یعنی گلاب اور شراب سے ناز اور عتاب مراد لئے ہیں - حالی نے بھی کلام غالب کی دوسری خصوصیت کے ضمن میں کئی ایسے اشعار لکھے ہیں - جن میں مرزا نے استعارے اور تمثیلیں استعمال کی ہیں - اور اگر ان کے لفظی معنی لئے جائیں تو مطلب خبط یا شعر کا مرتبہ پست ہو جاتا ہے مثلاً"

دام ہر موج میں ہے حلقۂ صد کام نہنگ
دیکھیں کیا گزرے ہے قطرے پہ گہر ہونے تک

یعنی اس شعر میں قطرے کو گہر ہونے تک جن حالتوں سے گزرنا پڑتا ہے - ان کی بحث نہیں - بلکہ "جو مطلب اس شعر میں ادا کیا گیا ہے - وہ صرف اس قدر ہے - کہ انسان کو درجۂ کمال تک پہنچنے میں سخت مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے"

لیکن غالب اور حالی کی اس ترجمانی کے باوجود عام شارحین نے اپنی شرحوں میں فقط مشکل الفاظ کی وضاحت کر دی ہے اور شاعر کا اصل مفہوم سمجھنے کی کوشش نہیں کی - نتیجہ یہ ہے کہ اکثر حالتوں میں اگرچہ لفظی مشکلات دور ہو گئی ہیں - شعر کے معنی صاف نہیں ہوئے مثلاً غالب کا مشہور مطلع ہے -

دوست غمخواری میں میری سعی فرمائینگے کیا ؟ زخم کے بھرنے تک ناخن نہ بڑھ آئینگے کیا ؟

اگر اس شعر کی شرح فقط یہی کر دی جائے کہ "...جب تک یہ زخم بھرے گا - میرے ناخن بھی بڑھ جائینگے - اور میں پھر اس زخم کو نوچ ڈالوں گا" اور یہ کہہ دیا جائے کہ "ایسے شعر اردو کے لئے مایۂ ناز ہیں اور غالب کو ان ہی اشعار نے غالب بنا دیا ہے" تو ظاہر ہے کہ اگرچہ شارح نے شعر کا مضمون سادہ نثر میں لکھ دیا ہے لیکن شعر کے معنی واضح نہیں ہوئے - ہمارا خیال ہے کہ ایسی صورتوں میں الفاظ سے گزر کر شاعر کے اصل مطلب کی طرف بھی اشارہ کر دیا جائے - تو زیادہ آسانی ہو -

مثلاً تشبیہ اور استعارہ سے قطع نظر صاف لفظوں میں اس شعر کا مطلب فقط یہی ہے کہ دوست احباب کی غمخواری سے مجھے کوئی فائدہ نہ ہوگا۔ کیونکہ جتنی دیر میں یہ غم غلط ہوگا "طبع الم خیز" کی "درد آفرینی" ایک نیا غم پیدا کر دیگی۔

غالب کا ایک اور شعر ہے ؎

ڈرے کیا میرا قاتل کیا رہے گا اُس کی گردن پر
وہ خوں جو چشم تر سے عمر بھر یوں دمبدم نکلے

جہاں تک مغرب زدہ حضرات کا تعلق ہے۔ وہ تو شعر میں لفظ "قاتل" دیکھ کر ہی مُنہ پھیر لیں گے۔ اور ہمیں اُن سے بحث نہیں۔ لیکن دقّت یہ ہے کہ غالب کے مداح بھی جو الفاظ سے اس طرح بدک نہیں جاتے اور جانتے ہیں کہ شاعری کی ایک اصطلاح استعمال کرنے سے کلام کی اصل شعریت تباہ نہیں ہو جاتی۔ وہ بھی جب شرحیں لکھتے ہیں تو "دشنہ و خنجر" سے عام ہتھیار اور "بادہ و ساغر" سے پینے کی چیزیں مراد لیتے ہیں۔ مثلاً دیوان غالب کی سب سے مکمل شرح میں مندرجہ بالا شعر کے معنی یہ دیئے ہیں "میرا قاتل اس سے ڈرتا ہے کہ میرا خون اُس کی گردن پر رہے گا۔ مگر اس کا یہ ڈر فضول اور عبث ہے۔ کیونکہ میرا خون ایک جگہ رہتا ہی نہیں۔ تو اس کی گردن پر کیا ٹھہرے گا۔ غالباً یہ مضمون مُصنف نے نیا کہا ہے۔" اب ممکن ہے شارح نے آسان عبارت میں شعر کی نثر کر دی ہو۔ لیکن اس کے باوجود شاعر کا مفہوم واضح نہیں ہوتا۔ ہمارا اپنا خیال ہے کہ شاعر کا مطلب یہ ہے کہ معشوق کی وجہ سے مجھ پر جو مصیبتیں آئی ہیں۔ ان کے مواخذہ کے خیال سے اُسے ڈرنا نہیں چاہئے۔ کیونکہ مصیبتیں تو مجھ پر ویسے ہی آتیں۔ یعنی ع

غم عشق اگر نہ ہوتا غم روزگار ہوتا

یا ع تیرے سوا بھی ہم پہ بہت سے ستم ہوئے

ایک فارسی شعر میں بھی بالکل یہی مضمون نظم کیا ہے ؎

ندواند ثانِ شہیداں ہراس یعنی چہ

تو لیست دستِ قضا کشتۂ ادائے تو کیست

اسی طرح غالب کا ایک اُردو شعر ہے ؎

منظر اک بلندی پر اور ہم بنا سکتے
عرش سے پرے ہوتا کاشکے مکاں اپنا

اس شعر میں ایک لطیف کنائے سے بتایا ہے کہ ہمارا مکان تو عرش پر ہے۔ اور خواہش ظاہر کی ہے کہ اگر اپنا مکان عرش سے بھی اوپر ہوتا۔ تو ہم اپنے موجودہ منظر سے بھی ایک اور بلند منظر بنا سکتے۔ یہ شعر غالب کے بہتر نشتروں میں سے نہیں۔ اور نہ اس میں کوئی عمیق فلسفہ ہے۔ لیکن ہمارا خیال ہے کہ یہ ذیل کی تنقید کا بھی مستحق نہیں۔

"اگر حیدرآباد سے کسی شخص کو لندن جانے کے وسائل حاصل ہو جائیں۔ اور وہاں پہنچ کر سب سے اونچی چوٹی (؟) پر جا بیٹھے۔ تو وہ یقیناً قدیم لندن کی سرزمین پر ایک طائرانہ نظر ڈال سکے گا۔ لیکن اصل مرحلہ تو یہ ہے۔ کہ پہلے وہ لندن جائے اور پھر اس کو وہاں کے مشہور و معروف گرجا پر چڑھنے کا موقع حاصل ہو! کیا غالب کو اپنی اس زندگی میں کبھی عرش کے آستانے تک بھی رسائی ہوئی؟"

اس شعر میں کوئی دور از کار استعارہ تو نہیں۔ لیکن ہمارا خیال ہے کہ اگر فاضل نقاد شاعر کے الفاظ سے گزر کر اُس جذبے (خواہ وہ شاعرانہ تعلّی کیوں نہ ہو) کو خیال میں لاتے جس سے متاثر ہو کر شاعر نے یہ مضمون نظم کیا ہے۔ تو وہ شعر کو ہی انوکھی تنقید کا مستحق نہ سمجھتے۔ اور شاعر سے ثبوت نہ مانگتے کہ اُسے عرش پہ کب رسائی ہوئی!

یہ صحیح ہے کہ استعارۃً معنی مراد لینے میں اختلاف کا بہت موقع ہے۔ اور جب ہم دیکھتے ہیں۔ کہ خوش اعتقادوں نے دیوان حافظ کی کیا گت بنائی ہے۔ تو دیوان غالب پر اس نقطۂ نظر سے کہ ظاہر معنوں کے علاوہ بھی کوئی معنی ڈھونڈے جائیں، بحث کی بڑی گنجائش معلوم ہوتی ہے۔ لیکن آخر جو حضرات دیوان حافظ کی شرح لکھتے وقت آنکھیں بند کر کے "ساقی" کی بجائے "مرشد" اور "شراب" کی بجائے "علم معرفت" لکھ دیتے ہیں۔ اُن کی شعر فہمی بھی تو انہی حضرات کی سی ہے۔

جو شعر کو سمجھتے وقت اپنی قوتِ متخیلہ کو بالکل کام میں نہیں لاتے۔ اور شعر کے لفظی معنوں سے آگے نہیں بڑھتے۔ اس بحث سے ہمارا مدعا فقط اس امر کا اظہار ہے کہ جب غالب نے اپنے اشعار کو ظاہری مفہوم سے زیادہ وسیع معنی پہنائے ہیں۔ اور جب حالی نے بھی کلام غالب کی دوسری خصوصیت کے ذیل میں واضح کیا ہے۔ کہ غالب نے استعارہ کنایہ اور تمثیل کا استعمال زیادہ کیا ہے اور کئی اشعار کے کنائتاً معنی لینے سے اُن کا لطف زیادہ ہو جاتا ہے۔ تو دیوان غالب کے فاضل شارحین کو بھی چاہیئے۔ کہ وہ اشعار کے لفظی معنی سمجھتے وقت اپنی قوتِ متخیلہ سے بھی کام لیں۔ اور شاعر کا اصل مفہوم سمجھنے کی کوشش کریں۔ ورنہ آجکل مشکل الفاظ کی بجائے سہل الفاظ تو لکھ دیئے جاتے ہیں۔ لیکن شعر کا مطلب خبط ہو جاتا ہے۔

غالب کی شاعری کے پانچ دَور

ہم نے کلام غالب کو ردیف وار نہیں بلکہ سنِ تصنیف کی ترتیب سے شائع کیا ہے۔ ہمارے خیال میں ان کی شاعری کے پانچ دَور قرار دیئے جا سکتے ہیں (۱) پہلے دور میں وہ اشعار ہیں۔ جو پچیس برس کی عمر سے پہلے لکھے گئے۔ اور قلمی نسخہ بھوپال کے متن میں درج ہیں۔ (۲) دوسرے دَور میں وہ اشعار ہیں۔ جو قلمی نسخہ بھوپال کے متن میں موجود نہیں۔ لیکن دیوان غالب کے پہلے مطبوعہ ایڈیشن میں موجود ہیں۔ چونکہ ان اشعار کے جزو غالب کے متعلق قلمی نسخہ مملوکہ حافظ محمود خاں صاحب شیرانی کی بنا پر کہا جا سکتا ہے۔ کہ وہ ۱۸۲۷ء سے پہلے لکھے گئے۔ اس لئے ہم نے اس دَور کو ۱۸۲۷ء پر ختم کیا ہے۔ اور جو اشعار ۱۸۲۷ء کے بعد لکھے گئے انہیں علامت م سے ممتاز کر دیا ہے۔ (۳) تیسرے دور میں اس زمانے کے اشعار کا انتخاب ہے۔ جب مرزا کی توجہ بیشتر فارسی شعر گوئی کی طرف تھی۔ ان اشعار کی تدوین کے لئے سب سے مفید چیز دیوان غالب کا وہ قلمی نسخہ ہے۔ جو رائے چھجمل کے ہاتھ کا لکھا ہُوا (۱۸۳۸ء) بانکی پور لائبریری میں موجود ہے۔ جو اشعار اس دیوان میں موجود ہیں۔ اُن کا انتخاب ہم نے لالۂ صحرا اور گلِ رعنا کے تحت میں دیا ہے۔ بادۂ شیراز کے ضمن میں ان فارسی اشعار کا انتخاب ہے۔ جو ۱۸۳۸ء کے بعد اور ۱۸۲۷ء سے پہلے لکھے گئے (۴) چوتھا دَور مرزا کا درباری دَور ہے۔ اس میں ہم نے وہ اردو اشعار درج کئے ہیں۔

جو ماسوا چار غزلوں اور ایک قطعے کے ۱۸۴۷ء کے بعد اور ۱۸۵۷ء سے پہلے لکھے گئے۔ ان غزلوں اور قطعے کو ہم نے علیحدہ علامتوں سے ممتاز کر دیا ہے +

۱۸۴۷ء سے ۱۸۵۵ء تک کے فارسی اشعار کا انتخاب بھی اسی دور میں شامل ہے۔ (۵) پانچویں دور میں ان اردو فارسی اشعار کا انتخاب ہے۔ جو ۱۸۵۵ء کے بعد لکھے گئے +

کلام غالب کی اس تدوین سے ہم نے مرزا کی شاعرانہ شخصیت کو نئے طریقے سے پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ اور ہمیں امید ہے۔ کہ جب اس نقطۂ نظر سے ان کے کلام کا غائر مطالعہ ہوگا۔ تو مرزا کی شاعری کا ارتقا زیادہ وضاحت اور صحت سے لوگوں کے سامنے آجائیگا۔ اس تدوین کے دوران میں ہمیں جو قابل ذکر باتیں معلوم ہوئیں۔ ان کا ملخص نذر ناظرین ہے +

ابتدائی دور

ابتدائی دور کی نسبت عام طور پر معلوم ہے۔ کہ فارسی الفاظ اور تراکیب کی کثرت سے زبان بہت ثقیل ہو گئی تھی۔ اور چونکہ مضامین بھی عجیب وغریب اور عام مشاہدے یا دنیائے شاعری سے بہت دور تھے اس لئے ان اشعار کا سمجھنا آسان کام نہیں۔ اس کے علاوہ یہ اشعار شاعرانہ حسن سے بھی عاری ہیں۔ ان میں آمد کم ہے۔ آورد اور تصنع زیادہ۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مرزا کی تمام محنت عجیب وغریب خیالات اور دور از کار تشبیہیں ڈھونڈنے میں صرف ہوتی تھی۔ شعریت کی طرف وہ توجہ نہ کر سکتے تھے۔ مرزا کی اہم ترین خصوصیت انسانی فطرت سے واقفیت ہے۔ جو ان کے بعد کے کلام کے ہر صفحے سے ظاہر ہوتی ہے۔ لیکن ابتدائی دور میں اس کا وجود قریب قریب عنقا ہے۔ اس زمانے میں نہ صرف اشعار بعید از فہم تھے۔ بلکہ جیسا کہ انہوں نے خود کہا ہے "مضامین میں بیشتر خیالی" تھے۔ یہ اشعار کسی طبعی یا نفسیاتی حقیقت کا بیان نہ تھے۔ بلکہ ان کا وجود فقط شاعر کے بے پروا دماغ میں تھا۔ کئی جگہ ان کی بنیاد محض رعایت لفظی پر ہے اور وہ معنوی حسن سے بالکل عاری ہیں مثلاً

پاؤں میں جب وہ حنا باندھتے ہیں — میرے ہاتھوں کو جدا باندھتے ہیں

یا — اسد قربانِ لطفِ جورِ بیدل — خبر لیتے ہیں لیکن بیدلی سے

یا — شاید کہ مرگیا ترا رخسار دیکھ کر — پیمانہ رات ماہ کا لبریز نور تھا

کئی اشعار ایسے ہیں۔ جن میں کتابی اور مروجہ تشبیہوں پہ زور دماغ صرف کر کے انہی سے ایک نیا خیال پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔ لیکن اس طرح یہ اشعار حقیقت سے بہت دُور ہو گئے ہیں۔ مثلاً شعرا شانہ کو یا ہاتھ سے اکثر تشبیہہ دیتے ہیں۔ مرزا نے اس تشبیہہ کو کسی نفسیاتی حقیقت کی وضاحت یا طرز ادا کی دلکشی کے لئے تو غالباً کہیں استعمال نہیں کیا۔ لیکن تشبیہہ کے مختلف پہلوؤں پہ نظر کر کے اور نئے پہلو سوچ کر انہی پہلوؤں کو مضمون شعر قرار دیا ہے۔ مثلاً

کس کا دل زلف سے بھاگا کہ اسدؔ　　دستِ شانہ بہ قفا باندھتے ہیں

ایک شعر میں اس تشبیہہ کو بطور تشبیہہ کے استعمال کیا ہے۔ لیکن اس میں بھی اس کے اتنے دور از کار اور غیر طبعی پہلو پہ توجہ کی ہے۔ کہ اس سے نفسِ مضمون میں الٹا پیچیدگیاں جاتی ہیں۔ اور کوئی شاعرانہ خوبی بھی پیدا نہیں ہوتی ؎

ظاہر ہیں میری شکل سے افسوس کے نشاں　　جُوں شانہ پشتِ دست بدنداں گزیدہ ہوں

ناصر علی سرہندی اور غنی کے زمانے میں تو ان اشعار کو "ندرتِ خیال" اور "مضمون آفرینی" کا بہترین نمونہ سمجھا جاتا۔ لیکن مرزا متاخرین فارسی شعرا سے بہتر مذاقِ شعر رکھتے تھے۔ اور وُہ آہستہ آہستہ سمجھ گئے۔ کہ یہ خیالی قلا بازیاں "کمالِ شاعری نہیں +

ان خصوصیات کے علاوہ ظرافت جو مرزا کی شاعری کا طرۂ امتیاز ہے۔ اس کا بھی اس زمانے میں نشان نہیں ملتا۔ تصوف کے اشعار بھی ایک دو ہیں اور وہ بھی محض رسمی۔ چنانچہ یہ ایک دلچسپ حقیقت ہے کہ ان کا مشہور اُردو قصیدۂ منقبت تو ۲۵ سال کی عُمر سے پہلے لکھا جا چکا تھا۔ لیکن اس وقت مطلع یہ تھا ؎

توڑے ہے عجزِ تنگ حوصلہ بر روئے زمیں
سجدہ تمثال وہ آئینہ کہیں جس کو جبیں

جب بعد میں فارسی شعرا کے مطالعہ سے یا دوسرے اثرات سے طبیعت پہ تصوف کا رنگ زیادہ چڑھا۔ تو انہوں نے مندرجہ بالا مطلع کی بجائے ذیل کا صوفیانہ مطلع لکھ دیا جو بہت مشہور ہے ؎

دہر جز جلوۂ یکتائیٔ معشوق نہیں
ہم کہاں ہوتے اگر حُسن نہ ہوتا خود بیں

یہ زمانہ مرزا کے عنفوانِ شباب کا زمانہ تھا۔ اور بظاہر اس میں عشق و محبت کے مضامین کی افراط ہونی چاہئے لیکن اس زمانے میں مضامین محض خیالی تھے۔ قلبی واردات کا اظہار نہ تھا۔ اس لئے عشقیہ اشعار بھی اس دَورِ شاعری میں بہت نہیں +

اس زمانے میں مرزا نے کئی قصیدے منقبت میں لکھے۔ اور بہت سی اردو غزلوں میں بھی حضرت علی سے بہ غلو اظہار عقیدت کیا ہے۔ لیکن بعد میں بالخصوص بعد کی اردو غزلوں میں یہ اظہار اس کثرت سے نہیں۔ مرزا کی اس زمانے کی شاعری کتابی اور دماغی شاعری تھی۔ اور مرزا کی جن خصوصیات پر لوگ مر دھنتے ہیں۔ اُن کا وجود عنقا تھا +

بادۂ نیم رس

یقین سے تو نہیں کہا جا سکتا کہ مرزا نے یہ طرز شاعری کب ترک کیا۔ لیکن چونکہ نسخۂ حمیدیہ میں صاف اور اعلےٰ درجے کے اشعار کی تعداد بہت کافی ہے اسلئے قرین قیاس ہے کہ ۲۰-۲۲ سال کی عمر تک یعنی دہلی آنے کے پانچ چھ سال بعد وہ ابتدائی طرز بالکل ترک کر چکے ہونگے۔ مرزا نے جس طریقے سے اپنا اسلوب شاعری بدلا۔ اس کا اندازہ اس امر سے ہو سکتا ہے۔ کہ ذیل کے مطلعوں والی غزلیں اور اپنا اردو کا بہترین قصیدہ وہ ۲۵ برس کی عمر سے پہلے لکھ چکے تھے:

حُسن غمزے کی کشاکش سے چھٹا میرے بعد
بارے آرام سے ہیں اہلِ جفا میرے بعد

آہ کو چاہیے اک عُمر اثر ہونے تک
کون جیتا ہے تری زلف کے سر ہونے تک

بساطِ عجز میں تھا ایکدل ایک قطرہ خوں وہ بھی
سو رہتا ہے باندازِ چکیدن سرنگوں وہ بھی

درد سے میرے ہے تجھ کو بیقراری ہائے ہائے
کیا ہوئی ظالم تری غفلت شعاری ہائے ہائے

نہ ہوئی گر مرے مرنے سے تسلّی نہ سہی
امتحاں اور بھی باقی ہیں تو یہ بھی نہ سہی

جبتک دہانِ زخم نہ پیدا کرے کوئی
مشکل کہ تجھ سے راہِ سخن وا کرے کوئی

آئینہ کیوں نہ دوں کہ تماشا کہیں جسے　　　ایسا کہاں سے لاؤں کہ تجھ سا کہیں جسے

مندرجہ بالا غزلوں کے علاوہ بھوپالی نسخہ میں کئی صاف اور بلند پایہ اشعار ایسے ہیں۔ جن میں بیدل کا رنگ بہت پھیکا پڑ گیا ہے۔ اور جو دورِ ثانی کے بہترین اشعار کے ہم پایہ اور طرزِ تحریر کے لحاظ سے انہی کے مشابہ ہیں۔ مضمون اور زبان کی خصوصیات کے لحاظ سے تو یہ اشعار دوسرے دَور کے اشعار کے ساتھ ترتیب دیئے جانے چاہئیں۔ لیکن قیاس آرائی کے سوا اُن کی تدوین کا ہمارے پاس کوئی ذریعہ نہیں۔ ہم نے خارجی شہادت کی بنا پر انہیں نسخہ بھوپالی کی باقی غزلوں کے ساتھ مرتّب کیا ہے ویسے یہ ظاہر ہے کہ ۲۰ سے ۲۵ برس کی عمر تک مرزا نے جو اشعار لکھے وہ اس زمانے کی یادگار ہیں۔ جب ان کی زبان آہستہ آہستہ صاف ہو رہی تھی۔ اور خیالات اور مضامین بھی شگفتہ اور سہل الفہم ہوتے جاتے تھے۔ اس دَورِ ارتقا کے کئی اشعار ایسے ہیں۔ جن میں بیدؔل کا رنگ غالب تھا اور کئی نہایت صاف مثلاً

رات کے وقت مے پئے ساتھ رقیب کو لئے　　　آئے وہ یاں خدا کرے پہ نہ خدا کرے۔ کہ یوں

میں نے کہا کہ بزمِ ناز چاہیئے غیر سے تہی　　　سُن کے ستم ظریف نے مجھ کو اُٹھا دیا کہ یوں

دوسرا دَور۔ ۱۸۲۱ء۔۱۸۲۷ء

دوسرے دَور میں ہم نے وہ اردو اشعار درج کئے ہیں۔ جو نسخہ بھوپال کی تاریخ کتابت کے بعد لکھے گئے لیکن غالب کے پہلے مطبوعہ دیوان (۱۸۴۱ء) میں موجود ہیں۔ بظاہر تو اس دَور کو ۱۸۴۱ء پر ختم ہونا چاہیئے تھا۔ لیکن اس دَور کے بیشتر اشعار ۱۸۲۷ء سے پہلے لکھے جا چکے تھے۔ اس لئے ہم نے اس دَور کو ۱۸۲۷ء پر ختم کیا ہے۔ اور جو اشعار ۱۸۲۷ء کے بعد لکھے گئے انہیں خاص علامتوں سے ممتاز کر دیا ہے۔

مرزا کے ابتدائی طرزِ شاعری کے متعلق ہم یہ خیال ظاہر کر چکے ہیں۔ کہ غالباً بیس بائیس سال کی عمر تک (یعنی ۱۸۱۷ء۔۱۸۱۸ء کے قریب) وہ بیدل کی تقلید ترک کر چکے تھے۔ اور زبان و خیال کے لحاظ سے ان کے کلام میں وہ خصوصیات آگئی تھیں۔ جو دوسرے دَور کا مابہ الامتیاز ہیں۔ معنوی نقطۂ نظر سے شاید بہتر ہوتا۔ کہ ہم دوسرے دَور کو ۱۸۲۱ء کی بجائے ۱۸۱۷ء سے شروع کرتے لیکن ۱۸۱۷ء۔۱۸۱۸ء تک کے اشعار معین کرنے کا ذریعہ قیاس کے سوا کوئی نہیں۔ ہم نے خارجی شہادت پر زیادہ اعتماد کیا ہے۔

اور دوسرے دَور کو ۱۸۲۱ء سے شروع کیا ہے۔ تاہم جیسا کہ ہم کہہ چکے ہیں۔ ۱۸۲۱ء سے بہت پہلے مرزا اپنا طرزِ شاعری بدل چکے تھے۔ اور جن اشعار کو ہم نے بادۂ نیم رس کے ضمن میں درج کیا ہے۔ اُن میں کئی اشعار ایسے ہیں۔ جو زبان اور مضمون کی خصوصیات کے لحاظ سے دوسرے دَور کے سمجھے جانے چاہئیں۔

مرزا کا دوسرا دَور شاعری ہم نے ۱۸۲۶ء پر ختم کیا ہے۔ اس کے بعد ہمارا خیال ہے۔ کہ اُن کی توجہ اردو کی بہ نسبت فارسی کی طرف زیادہ ہو گئی۔ اور ۱۸۲۷ء سے ۱۸۵۷ء تک انہوں نے زیادہ تر فارسی زبان میں شعر کہے ہیں۔ لیکن اس سے یہ نہ سمجھنا چاہیے۔ کہ انہوں نے اردو شعر گوئی یک قلم ترک کر دی تھی۔ قیام کلکتہ کے دوران میں جب وہ فارسی غزلیں۔ قصیدے۔ قطعے اور مثنویاں لکھ رہے تھے۔ اس زمانے میں بھی انہوں نے اردو شعر کہے ہیں (مثلاً "چکنی ڈلی کی تعریف میں")۔ اس کے علاوہ جب انہوں نے (۱۲۴۸ ہجری میں؟) منتخب اردو دیوان اشاعت کیلئے مرتب کیا۔ تو اپنی غزلوں کے "تتمے" لکھے۔ اور بعض دوسرے اشعار کا اضافہ بھی کیا۔

نفسیاتی ژرف بینی

دوسرے دَور میں آئینہ طبیعت کا زنگ صاف ہو گیا ہے۔ فارسی ترکیبیں بہت کم ہیں۔ اور خیالات بھی صاف اور خوشگوار ہیں۔ کلام میں بیدلؔ اور صائبؔ کی بجائے عرفیؔ اور نظیریؔ کا رنگ غالب ہے۔ تشبیہیں نیچرل اور موزوں ہیں اور اظہار خیالات میں خلوص بہت نمایاں ہے۔ مضامین کے نقطہ نظر سے اس دور کی اہم ترین خصوصیت نفسیاتِ انسانی کے متعلق شاعر کی معلومات ہیں۔ جو دیوان غالب کے صفحے صفحے پر ظاہر ہوتی ہیں۔ ہم اس سے پہلے مرزا کا بیان نقل کر چکے ہیں۔ کہ جب ہوش آیا۔ تو عرفیؔ اور نظیریؔ کی تقلید نے انہیں اس سراب سے نکالا۔ جس میں بیدل کی تقلید انہیں لے گئی تھی۔ عرفی اور نظیری کی مقبول ترین خصوصیت معاملہ بندی تھی جس میں عشق و محبت کی کیفیتیں بیان ہوتی تھیں۔ لیکن معاملہ بندی کا دائرہ بہت تنگ تھا۔ محبت کی وسیع اور متفاوت دنیا میں سے فارسی شعرا نے چند حالتیں انتخاب کر لی تھیں اور انہی کو مختلف دلآویز طریقوں سے بیان کر دیا جاتا تھا۔ غالب کے پیش نظر بھی انہی شعرا کے نمونے تھے۔ لیکن اُن کی نظر عہد اکبر کے فارسی شعرائے سے بہت وسیع تھی۔ اور محبت کے تمام پہلوؤں پر حاوی تھی۔ مثلاً پرانے شعرا کے نزدیک فقط عاشق ہی نامراد اور مایوس ہوتا

تھا۔ اور دوسرے سب کامیاب۔ لیکن مرزا کی نظر اپنی ناکامی اور مایوسی کی چٹان سے ٹکرا کر رُک نہ جاتی۔ اور فرطِ جذبات کے باوجود وہ زندگی کی صحیح تصویر ہی دیکھتے۔ چنانچہ اس سلسلے میں ان کے کئی شعر ہیں۔ جو مشرقی عشق کے رسمی نقطۂ نظر سے بہت مختلف ہیں مثلاً ؎

عشق کہتا ہے کہ اس کا غیر سے اخلاص حیف — عقل کہتی ہے کہ وہ بے مہر کس کا آشنا

یا

تمہاری طرز روش جانتے ہیں ہم کیا ہے — رقیب پر ہے اگر لطف تو ستم کیا ہے

ایسے اشعار کئی ہیں۔ لیکن ایک فارسی شعر تو بہت ہی پُر لطف ہے۔ ؎

ماہم بہ لاغ دلا بہ تسلی شویم کاش — ناداں ز بزم دوست چہ خوشنود میرود

اس خصوصیت کے علاوہ کہ مرزا کی نظر محبت کے تمام پہلوؤں پر حاوی ہے۔ ایک توجہ طلب خصوصیت مرزا کی ژرف بینی ہے۔ یعنی ان کی نظر محبت بلکہ انسانی زندگی کے ان حقائق پر پڑتی ہے۔ جن کی طرف عام طور پہ خیال نہیں جاتا۔ اور ان کے کئی اشعار میں ایسے خیالات کا اظہار کیا گیا ہے۔ جو بظاہر غلط یا عجیب اور توقعات کے خلاف نظر آتے ہیں۔ لیکن جب ان پر غور کیا جائے۔ تو اُن کی حقیقت سمجھ میں آتی ہے۔ اور وہ انسانی فطرت اور واقعات کے عین مطابق معلوم ہوتے ہیں غالب نے ۲۶ برس کی عمر سے پیشتر ہی دو شعر ایسے لکھے تھے۔ جو اس خصوصیت کی بہترین مثال ہیں۔ اور جنہیں پڑھکر حیرت ہوتی ہے۔ کہ شاعر کی نگہ خارا شگاف پہ وہ حقیقت عُریاں ہوگئی۔ جس پہ ہماری کم نگہی کی وجہ سے پردے پڑے رہتے ہیں۔ وُہ اشعار یہ ہیں ؎

رہے اس شوخ سے آزردہ ہم چندے تکلف سے — تکلف برطرف تھا ایک انداز جنوں وہ بھی

نہ کرتا کاش نالہ مجھ کو کیا معلوم تھا ہمدم — کہ ہوگا باعثِ افزائشِ دردِ دروں وہ بھی

مرزا اگر اپنا بیان محبت تک ہی محدود رکھتے۔ اور اس کی گوناگوں کیفیتوں کو اس وسعت اور بالغ نظری سے بیان کر دیتے۔ تب بھی مشرقی شعرا میں وہ بے نظیر تھے۔ لیکن مرزا فقط قلمروِ محبت کے راز دار ہی نہ تھے۔ بلکہ محبت کے علاوہ انسان کی باقی کیفیتوں سے بھی خوب واقف تھے۔ دوسرا شعر جو ہم نے نقل کیا ہے۔ حقیقتاً فقط محبت سے متعلق نہیں۔ بلکہ انسان کی عام جذباتی زندگی پہ صادق آتا ہے چنانچہ اس زمانے میں لوگ پروفیسر جیمز کے اس نظریے سے عام طور پہ متفق ہیں۔ کہ جذبات کا اظہار ان کی توسیع بلکہ

تخلیق کا باعث ہوتا ہے[1]۔ لیکن نفسیات کے طالب علم جانتے ہیں کہ جب شروع شروع میں جیمز نے یہ نظریہ پیش کیا۔ تو سائینسدانوں کو بہت عجیب معلوم ہؤا۔ اور آج بھی عام توقعات کے خلاف معلوم ہوتا ہے۔ ہم مانتے ہیں کہ معلم نفسیات کا ایک مسئلے کو دلیلوں اور مثالوں سے ثابت کرنا اور ایک شاعر کا اپنے احساسات کو نظم کر دینا دو مختلف چیزیں ہیں۔ لیکن آخر یہ ایک امر واقعی ہے کہ مرزا نے یہ شعر جیمز کی کتاب سے بہت پہلے لکھا تھا۔ اور شاعر کی چشم بصیرت اس "رازِ نہانِ روزگار" سے "محرم" ہو گئی تھی۔ جس کے لئے سائینسدان کو ابھی برسوں انتظار کرنا تھا۔ یہی وہ اشعار ہیں جن کے متعلق کہا گیا ہے ؎

مشو منکر کہ در اشعار این قوم　　ورائے شاعری چیزے دگر ہست

غالب کے ہاں اس قبیل کے اشعار بہت ہیں جن میں قلب انسانی کی وہ کیفیتیں ہیں۔ جو بظاہر عجیب معلوم ہوتی ہیں۔ ہم ان میں سے چند اشعار درج ذیل کرتے ہیں۔ ہمارا خیال ہے۔ کہ جوں جوں نفسیات کا علم وسیع ہوتا جائے گا۔ غالب کے بیشتر اشعار کی دلچسپی بڑھتی جائیگی مثلاً ؎

ع　شوق کو منفعل نہ کر ناز کو التجا سمجھ

یا　ع　میانۂ من و اُو شوق حائل افتاد است

بے تکلف در بلا بُودن بہ از بیم بلاست　　قعرِ دریا سلسبیل و رُوئے دریا آتش است

مت پُوچھ کہ کیا حال ہے میرا ترے پیچھے　　تو دیکھ کہ کیا رنگ ہے تیرا مرے آگے

---

[1] انسانی جذبات کے دو پہلو ہیں۔ ایک داخلی اور دوسرا خارجی۔ داخلی پہلُو سے مُراد وہ اندرونی کیفیت ہے جو انسان کے دل پر اس وقت وارد ہوتی ہے جب وہ کسی جذبے کے زیر اثر ہوتا ہے۔ خارجی پہلو سے مُراد وہ ظاہری علامات ہیں۔ جن کا تعلق جسمانی حرکات و سکنات بالخصوص چہرے کی حالت سے ہے۔ مثلاً غصّے کے وقت چہرہ تمتما اُٹھتا ہے آنکھیں سُرخ ہو جاتی ہیں اور نتھنے پھول جاتے ہیں جیمز کا نظریہ یہ ہے کہ کسی جذبے کی ظاہری علامات کے باعث اس کا داخلی پہلو تیز تر ہو جاتا ہے۔ یہاں تک کہ اگر مصنوعی طور پر بھی یہ علامات پیدا کر لی جائیں جس طرح ایکٹر کرتے ہیں تو اکثر اوقات انسان کے دل میں سچ مچ وہی جذبہ پیدا ہو جاتا ہے۔

دیکھنا تقریر کی لذت کہ جو اُس نے کہا — میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے ؎۱

لفظی صناعی

دوسرے دَور کے آخر یا تیسرے دَور کے شروع میں مرزا نے اردو دیوان منتخب کیا۔ اور اشعار کی کمی بیشی کے علاوہ الفاظ اور تراکیب میں بھی ترمیم کی۔ یہ حک و اضافہ مرزا کی شاعری کے مطالعہ کے لئے بہت دلچسپ ہے۔ ان میں سے بیشتر اصلاحیں تو زبان کو سادہ بنانے کے لئے کی گئی ہیں۔ اور دقیق فارسی الفاظ یا تراکیب کی جگہ آسان الفاظ لکھ دیئے ہیں۔ یا جن الفاظ میں کوئی سقم تھا۔ اُنہیں بدل دیا ہے۔ مثلاً ؎

گرنگاہِ گرم فرماتی رہی تعلیمِ ضبط — شعلہ خس میں جیسے خوں رگ میں نہاں ہو جائیگا

پہلے یہ شعر یوں تھا ؎

گرنگاہِ گرم فرماتی رہی تعلیمِ ضبط — شعلہ خس میں جیسے خوں در رگ نہاں ہو جائیگا

یا ؎ بوئے گل۔ نالۂ دل دودِ چراغِ محفل — جو تری بزم سے نکلا سو پریشاں نکلا

پہلے یہ شعر یوں تھا ؎

عشرتِ ایجاد چہ بوئے گل و کو دودِ چراغ — جو تری بزم سے نکلا سو پریشاں نکلا

بعض جگہ چند الفاظ بدلنے سے مختلف مضمون پیدا ہو گیا ہے ؎

ہیں زوال آمادہ اجزا آفرینش کے تمام — مہرِ گردوں ہے چراغِ رہگذارِ بادیاں

پہلے یہ شعر اس طرح تھا ؎

ہے مری وحشت عدوئے اعتبارات جہاں — مہرِ گردوں ہے چراغِ رہگذارِ بادیاں

یا ؎ نہ چھوڑی حضرتِ یوسف نے یاں بھی خانہ آرائی — سفیدی دیدۂ یعقوب کی پھرتی ہے زنداں پر

پہلے مضمون اس سے قدرے مختلف تھا ؎

؎۱ یہاں یہ بتا دینا ضروری ہے۔ کہ مرزا کے رشک کے اشعار جو بعض لوگوں کو بہت پسند ہیں۔ نفسیاتی حقیقت پہ مبنی نہیں۔ غالب میں انانیت بہت نمایاں تھی۔ اور یہ قدرتی امر تھا۔ کہ وہ رشک کے بہت سے مضامین نظم کرتے۔ لیکن ان اشعار میں اکثر انہوں نے مبالغے اور شوخی سے اس قدر کام لیا ہے۔ کہ مضمون تو ضرور پُر لطف ہو گیا ہے۔ لیکن نفسیاتی حقیقت نظر سے پنہاں ہو گئی ہے۔

نہیں بندِ زلیخا بے تکلف ماہِ کنعاں پر
سفیدی دیدۂ یعقوب کی پھرتی ہے زنداں پر

شروع میں کئی تشبیہیں یا ترکیبیں کسی مضمون یا لفظ کی رعایت سے لکھی تھیں۔ جس سے مضمون زیادہ دقیق ہوگیا تھا۔ غالب نے انتخاب کے وقت لفظی رعایت کو قائم نہیں رکھا۔ بلکہ زبان کو سہل کرنے کے لئے اسے بدل دیا ہے۔ مثلاً ؎

آتا ہے داغِ حسرتِ دل کا شمار یاد
مجھ سے مرے گنہ کا حساب اے خدا نہ مانگ

پہلے "داغِ حسرتِ دل" کی رعایت سے "گنہ" نہیں بلکہ "بے گنہی" لکھا تھا۔ اور شعر یوں تھا ؎

آتا ہے داغِ حسرتِ دل کا شمار یاد
مجھ سے حسابِ بے گنہی اے خدا نہ مانگ

یا ؎

ضعف سے ہے۔ نے قناعت سے یہ ترکِ جستجو
ہیں وبالِ تکیہ گاہِ ہمتِ مردانہ ہم

پہلے "تکیہ گاہ" کے خیال سے "گراں خوابی" لکھا تھا۔ لیکن لفظی رعایت قائم رکھنے سے مضمون پیچیدہ ہوگیا تھا۔ چنانچہ انہوں نے پہلا مصرع بدل کر مضمون صاف کر دیا۔ نقشِ اوّل ملاحظہ ہو ؎

ضعف نے باندھا ہے پیمانِ گراں خوابی اسدؔ
ہیں وبالِ تکیہ گاہِ ہمتِ مردانہ ہم

زبان کی اس ترمیم اور الفاظ کے تغیر و تبدل کے علاوہ غالب کے کلام میں کئی جگہ ایک خیال مختلف صورتوں میں نظم ہوا ہے۔ یعنی نفسِ مضمون اصولاً تو ایک ہے۔ لیکن خفیف فرق سے مختلف اشعار میں مختلف طریقوں سے ادا ہوا ہے۔ بعض جگہ تو یہ مضامین ایسے ہیں۔ جو خود شاعر کو مرغوب ہیں۔ (مثلاً بہشت کا استہزا۔ قلبِ انسانی کی فطری غمگینی۔ انسان کی بے بسی۔ رشک۔ مذہب کے معاملے میں آزاد خیالی وغیرہ) اور چونکہ شاعر کے دل میں ان کا ہجوم رہتا تھا۔ وہ انہیں بار بار نظم کرنے پر مجبور تھا۔ بعض جگہ ایسا بھی ہوا ہے۔ کہ شاعر کو ایک مضمون سوجھا۔ اس نے یہ نظم تو کر دیا۔ لیکن اس سے مطمئن نہ ہو سکا۔ اور وہ خیال اسے گدگداتا رہا حتےٰ کہ نقشِ ثانی میں وہ بہتر طریقے سے ادا ہوا۔ مثلاً ؎

سر پھوڑنا وہ غالبِ شوریدہ حال کا
یاد آ گیا مجھے تری دیوار دیکھ کر

مضمون بہت بلند پایہ نہیں۔ اور اس میں کسی شاعرانہ رفعت کی گنجائش کم ہے۔ لیکن جہاں تک طرزِ ادا کی لطافت۔ زبان کی تاثیر اور بیساختگی کا تعلق ہے۔ نقشِ ثانی، نقشِ اوّل سے بہتر ہے ؎

مرگیا پھوڑ کے سر غالبِ وحشی ہائے ہائے   بیٹھنا آ کے وہ اُس کا نہ دیوار کے پاس!

یاس   وہ نگاہیں کیوں ہوئی جاتی ہیں یارب دل کے پار   جو مری کوتاہیٔ قسمت سے مژگاں ہوگئیں

خیال نفیس تھا۔ لیکن لفظی رعایت نے شاعر کے مطلب پر خفیف سا پردہ ڈال دیا تھا۔ نقشِ ثانی شاعر کے شاہکاروں میں سے ہے۔ اور اس میں لطفِ بیان نے خیال کو اس طرح چمکا دیا ہے کہ اس سے بہتر طریق اظہار تصور میں نہیں آسکتا ؎

بہت دنوں میں تغافل نے تیرے پیدا کی
وہ اک نگہ کہ بظاہر نگاہ سے کم ہے[1]

مندرجہ بالا مثالوں میں اشعار کی اصلاح و ترمیم سے یہ بات بھی روشن ہو جاتی ہے۔ کہ خیالات سے قطع نظر غالب کو طرزِ بیاں کا بہت خیال رہتا تھا۔ عام طور پر کہا جاتا ہے کہ خیالات غالب کے اعلیٰ ہیں۔ اور زبان ذوق کی۔ اگر زبان سے مطلب روزمرہ اور محاورات کا استعمال ہے۔ جو ایک جگہ مقبول ہیں تو دوسری جگہ ناپسند۔ یا آج مستعمل ہیں تو کل متروک۔ تو یہ خیال بیشک صحیح ہے۔ اگر ہم زبان سے مراد لیں الفاظ کا انتخاب، اُن کی ہم آہنگی اور نشست۔ تو مرزا کا مرتبہ تمام شعرا سے بلند ہے۔ الفاظ ان کے لئے اظہار مطلب ہی کا وسیلہ نہیں۔ بلکہ شاعرانہ حسن پیدا کرنے کا ذریعہ بھی ہیں۔ اُن کا استعمال اور ترتیب ایسی ہے کہ معنی اور مضمون سے قطع نظر ان کا ترنم اور ہم آہنگی ہی بہت پُر لطف ہے۔ مثلاً ؎

دردِ دل لکھوں کب تک جاؤں ان کو دکھلا دوں   اُنگلیاں فگار اپنی خامہ خونچکاں اپنا

ہاں وہ نہیں خدا پرست جاؤ وہ بیوفا سہی   جس کو ہو دین و دل عزیز اس کی گلی میں جائے کیوں

سوداؔ کی غزلوں کے متعلق کہا جاتا ہے کہ ان کی زبان قصیدے کی زبان ہے۔ اور فارسی ترکیبوں سے

---

[1] اس شعر کا لطف خالص وجدانی ہے۔ ہمارے ایک دوست فرمانے لگے۔ کہ "دیکھو واقعی نگہ میں نگاہ سے ایک الف کم ہے۔" ان کا فرمانا بجا۔ لیکن شاعرِ حسن کی انہی فاضلانہ موشگافیوں سے شاعر کے اصل مطلب پر پردے ڈالے جاتے ہیں۔ ہلے
ع شعر مرا بمدرسہ کہ بُرد +

تغزل کا رنگ ماند پڑ جاتا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ بھاشا میں مٹھاس زیادہ ہے۔ اور یاس وحزن کے اظہار میں وہ زیادہ موثر ہوتی ہے۔ لیکن آخر محبت کی دنیا بہت وسیع ہے۔ اس میں طرح طرح کی حسیات سے سابقہ پڑتا ہے۔ اور انہیں نظم کرنے کے لئے ایک کامیاب شاعر الفاظ اور تراکیب بھی مختلف انتخاب کریگا۔ غالبؔ کی ایک مشہور غزل ہے۔ ؎

مدت ہوئی ہے یار کو مہماں کئے ہوئے
جوشِ قدح سے بزم چراغاں کئے ہوئے

اس میں محبت کی اس حالت کا بیان ہے۔ جس میں بجھا ہوا دل جی اٹھتا ہے۔ اور عشق و محبت کے دلولے طبیعت کو پھر بیقرار کرتے ہیں۔ یہ تمام غزل فارسی ترکیبوں سے بھری پڑی ہے لیکن جوش و ولولہ کا بیان ہونے کے باعث یہ ترکیبیں اظہار مضمون کو اور بھی موثر کر دیتی ہیں۔ ہمارے خیال میں اردو شاعری میں اس کیفیت کی اس سے بہتر تصویر اور کہیں نہیں +

اس کے برعکس جب مرزا مایوسی اور غم کا بیان کرتے۔ تو فارسی ترکیبیں بہت کم ہوتی تھیں۔ مثلاً ؎

ابنِ مریم ہوا کرے کوئی — میرے دکھ کی دوا کرے کوئی
کون ہے جو نہیں ہے حاجتمند — کس کی حاجت روا کرے کوئی
کیا کیا خضر نے سکندر سے — اب کسے رہنما کرے کوئی

جب توقع ہی اٹھ گئی غالبؔ
کیوں کسی کا گلہ کرے کوئی

یا ذیل کی غزل لیجئے جو مندرجہ بالا غزل کی طرح شاعر کے دلِ محزوں کی ایک اور دلآویز تصویر ہے ؎

کوئی امید بر نہیں آتی — کوئی صورت نظر نہیں آتی
موت کا ایک دن معین ہے — نیند کیوں رات بھر نہیں آتی
آگے آتی تھی حالِ دل پہ ہنسی — اب کسی بات پہ نہیں آتی
جانتا ہوں ثوابِ طاعت و زہد — پر طبیعت ادھر نہیں آتی
ہم وہاں ہیں جہاں سے ہمکو بھی — کچھ ہماری خبر نہیں آتی

فارسی شاعری
(۱۸۲۷ء تا ۱۸۴۷ء)

یادگارِ غالب کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ مرزا نے فارسی شعرگوئی اسوقت سے شروع کر دی تھی۔ جب وہ آگرہ چھوڑ کر ابھی دہلی نہیں آئے تھے۔ اور جب اُن کی عمر پندرہ سولہ سال سے زیادہ نہ تھی۔ شروع میں اُن کی توجہ زیادہ تر اردو کی طرف تھی۔ اور فارسی کی طرف کم۔ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ سفر کلکتہ سے کچھ عرصہ پہلے انہوں نے فارسی شعرگوئی پہ زیادہ توجہ شروع کر دی تھی۔ اس سفر کے دوران میں انہوں نے کئی فارسی غزلیں ایک بلند پایہ فارسی مثنوی اور کئی ایسے فارسی قصائد لکھے جو ایک نوآموز کا نتیجۂ فکر نہیں معلوم ہوتے۔

قیام کلکتہ کے زمانے میں اور اس کے بعد ایک عرصے تک مرزا نے فارسی اشعار زیادہ لکھے۔ اور اردو اشعار کم۔ اور غالبؔ یہ کہنا بیجا نہیں۔ کہ ۱۸۲۷ء یا اس سے کچھ عرصہ بعد سے لے کر ۱۸۴۷ء تک مرزا کی اصل ادبی زبان فارسی تھی۔ یہ صحیح ہے کہ مرزا اس زمانے میں گاہے گاہے اردو اشعار کہتے رہے۔ اور اس کے بعد بھی جب درباری تعلقات کی وجہ سے انہوں نے اُردو پہ زیادہ توجہ کی تو اس وقت بھی انہوں نے فارسی شعرگوئی کو یک قلم ترک نہیں کر دیا۔ لیکن مرزا کے اپنے بیانات اور اُن کے کلام کے معاصرانہ قلمی نسخوں سے یہ نتیجہ بآسانی اخذ کیا جا سکتا ہے۔ کہ انہوں نے اپنی عمر کے ایک طویل حصے میں اُردو سے دانستہ کنارہ کشی اختیار کر رکھی تھی۔ اور غالباً اس کی ایک وجہ ذوق سے اُن کی چشمک تھی۔ جس کا اظہار انہوں نے ایک ابتدائی فارسی قصیدے میں کیا ہے ؎

ملالِ خاطرِ حاسد زمن بداں ماند
کہ گرد رہ ہوا پیچد از سبکساری
چہ ننگ اگر بہ سخن ہمفن است چوں بہ سخن
زدُودہ ام زورقِ دراغِ ننگ ہم کاری!

مرزا کے اُس زمانے کے فارسی اشعار کو جب فارسی کی طرف اِن کی زیادہ توجہ تھی ہم نے تین زمانوں میں تقسیم کیا ہے۔ لالہ صحرا کے تحت میں ہم نے ان اشعار کا انتخاب درج کیا ہے۔ جو سفر کلکتہ کے دوران میں یا اس سے پہلے کہے گئے۔ گل رعنا کے تحت میں وہ اشعار ہیں۔ جو مرزا کے قلمی دیوان منقولہ ۱۸۳۸ء میں موجود

ہیں۔ لیکن سفر کلکتہ کے بعد کے معلوم ہوتے ہیں تیسرے حصے میں ان اشعار کا انتخاب ہے۔ جو قلمی دیوان منقولہ ۱۸۳۸ء میں تو موجود نہیں۔ لیکن خارجی اور داخلی شہادت کی بنا پر ۱۸۴۷ء سے پہلے کے کہے جا سکتے ہیں +

مرزا کی ان غزلیات کے مطالعہ سے جو انہوں نے سفر کلکتہ کے دوران میں لکھیں یہ خیال پیدا ہوتا ہے۔ کہ جہاں تک اردو غزلگوئی کا تعلق ہے، وہ اس زمانے میں بیدل کا رنگ ترک کر چکے تھے۔ لیکن فارسی غزلیات میں یہ رنگ ابھی نمایاں تھا۔ اور ان غزلوں کے اکثر اشعار دقیق خیالات اور دور از کار تشبیہات سے پُر ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ چونکہ فارسی زبان میں یہ طرز شاعری نئی نہ تھی۔ اس لئے مرزا کی ان فارسی غزلیات میں وہ اجنبیت اور غرابت نہیں معلوم ہوتی جو اُن کی ابتدائی اردو غزلیات کی خصوصیت ہے۔ پھر بھی ان غزلیات اور بعد کی بلند پایہ فارسی غزلیات میں نمایاں فرق ہے۔ یہ بھی ایک دلچسپ حقیقت ہے۔ کہ اگرچہ مرزا کی اس زمانے کی فارسی غزلیں دقیق اور خیالی مضامین سے پُر ہیں۔ لیکن اُن کے اس زمانے کی فارسی مثنوی قصیدے ان نقائص سے بری ہیں۔ تحفۂ دیر اور بادِ مخالف دونوں کی زبان بہت صاف اور شگفتہ ہے اور اُن کے اس زمانے کے قصائد میں بھی خیال اور زبان کی وہ الجھنیں نہیں۔ جو اس زمانے کی فارسی غزلیات میں نمایاں ہیں +

مرزا کی فارسی غزلگوئی کا عہد زریں وہ زمانہ ہے۔ جس کا انتخاب ہم نے گلِ رعنا میں دیا ہے۔ ان کے ضخیم فارسی کلیات میں سوا تین سو سے زیادہ غزلیں ہیں۔ اور ان میں انچاس غزلوں کے سوا باقی تمام غزلیں اس زمانے میں لکھی جا چکی تھیں اور صرف یہی نہیں کہ مرزا کی غزلوں کا بہت بڑا حصہ اس زمانے میں لکھا جا چکا تھا۔ بلکہ ادبی نقطۂ نظر سے بھی مرزا کی اکثر بہترین غزلیں اسی زمانے میں لکھی گئیں۔ قرین قیاس ہے کہ غزلیات کا ایک حصہ سفر کلکتہ سے پہلے لکھا جا چکا ہوگا۔ اور اس دَور کی کئی غزلیں ہیں۔ جو زبان اور خیالات کے لحاظ سے قیام کلکتہ کی غزلوں سے ملتی جُلتی ہے۔ جو انتخاب ہم نے درج کیا ہے۔ اُس کے مطالعہ سے معلوم ہو سکتا ہے کہ اس زمانے میں مرزا کی فارسی شاعری کا رنگ بہت نکھر گیا تھا۔ اور اُن کی اکثر بہترین غزلیں اسی زمانے کی ہیں +

۱۸۳۸ء کے قلمی دیوان میں طویل فارسی قصائد اور ترکیب بند نسبتاً کم ہیں۔ غزلیات کا عنصر بہت زیادہ ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ دیوان مرتب کرنے کے بعد مرزا نے طویل نظموں پہ زیادہ توجہ شروع کی۔ ۱۸۴۳ء کے مشاعروں کے لئے مرزا نے فارسی غزلیں لکھیں۔ اور ان کے علاوہ اور بھی کئی غزلیں ہیں۔ جو قلمی دیوان مرتبہ ۱۸۳۸ء کے بعد

اور مطبوعہ دیوان ۱۸۴۵ء کی ترتیب سے پہلے لکھی گئیں۔ لیکن اُن کی تعداد تھوڑی اور طویل نظموں کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ سب سے اہم فارسی مثنوی ابر گہربار بھی اس زمانے کی یادگار ہے۔

۱۸۴۷ء کے بعد بہادر شاہ سے مرزا کے تعلقات بہت خوشگوار ہو گئے۔ اور اب انہوں نے "انبساط خاطر حضرت" کے لئے اردو کو اپنی زبان بنایا۔ اس زمانے میں انہوں نے کئی فارسی قصائد بہادر شاہ، شاہان اودھ اور انگریزی حکام کی تعریف میں لکھے لیکن اس دور کی بہترین یادگار اُن کا اردو کلام ہے۔ جس پر ہم آئندہ سطور میں مفصل تبصرہ کریں گے۔

مرزا اپنے فارسی کلام کو اردو کلام کے مقابلے میں جس قدر اہم سمجھتے تھے اس کا اظہار انہوں نے اشعار اور خطوط میں جابجا کیا ہے۔ اور حقیقتاً جب ہم یہ دیکھتے ہیں۔ کہ تیس برس کی عمر سے پچاس برس کی عمر تک انہوں نے زیادہ فارسی زبان میں شعر لکھے، تو مرزا کا یہ اظہار خیال کچھ عجیب معلوم نہیں ہوتا۔ لیکن مرزا کے فارسی کلام کی اہمیت محض شخصی نہیں۔ اُن کا فارسی کلام صرف اس لئے اہم نہیں۔ کہ یہ اردو کے بہترین شاعر کا نتیجۂ فکر ہے۔ بلکہ فی نفسہٖ اس کلام کا مرتبہ بہت بلند ہے۔ فارسی قریباً سات آٹھ سو سال تک شمالی ہندوستان کی ادبی زبان رہی ہے۔ اور اس دوران میں بہت سے خوشگو فارسی شعرا اس سرزمین میں پیدا ہوئے ہیں۔ لیکن امیر خسرو اور اقبال کے سوا کوئی ہندوستانی فارسی شاعر ایسا نہیں۔ جس کا مرتبہ غالب سے بلند ہو۔ مرزا کا فارسی کلیات قریباً پانچسو صفحوں پر مشتمل ہے۔ جو قصائد اور غزلیات سبد چین[1] میں ہیں۔ وہ اس پر مستزاد ہیں۔ مرزا نے غزل۔ قصیدہ۔ مثنوی۔ رباعی۔ قطعہ۔ ہر صنف سخن میں طبع آزمائی کی ہے۔ اور کسی میں ہندوستان کے بہترین فارسی شعرا سے پیچھے نہیں رہے۔

---

[1] یہ مجموعہ مدت سے نایاب تھا۔ ۱۹۳۸ء میں مسٹر مالک رام ایم اے نے نواب حبیب الرحمان کے کتب خانے سے حاصل کر کے اضافہ اور تصحیح کے ساتھ دوبارہ شائع کیا ہے۔ دوسرا ایڈیشن پہلے کی بہ نسبت کہیں زیادہ مکمل ہے۔ لیکن اس وقت بھی غالب کے کئی اشعار ایسے ہیں۔ جو نہ کلیات میں ہیں، نہ سبد چین میں۔ مثلاً مثنوی دمغ الباطل (ملاحظہ ہو دستور العمل اودھ قلمی نمبر ۹۰۲ کتب خانہ رام پور) یا مرزا کی پانچ مختصر فارسی مثنویاں جو نسخہ دیوان غالب بانکی پور کے حاشیے پر درج ہیں۔

ہندوستان کے فارسی شعرا کے متعلق مرزا اچھی رائے نہ رکھتے تھے اور یہاں کے فارسی شعرا میں بھی امیر خسرو اور کسی حد تک فیضی کے سوا وہ کسی کو خاطر میں نہ لاتے تھے۔ لیکن یہ عجیب اتفاق ہے کہ انہوں نے خیالات اور طرز بیان کے لحاظ سے بالعموم ان فارسی شعرا کی پیروی کی ہے جو ہندوستان میں پیدا ہوئے یا ایران سے آکر ہندوستان میں ایسے بسے کہ یہیں کی خاک ہو گئے۔ ابتدا بیدلؔ کے رنگ میں کی تھی۔ اس کے بعد انہوں نے جن شعرا کا تتبع کیا۔ ان میں عرفیؔ، نظیریؔ، اور فیضیؔ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ مرزا غالب حقیقتاً فارسی شعرا کی اُس لڑی کے آبدار موتی ہیں۔ جس کا سلسلہ مسعود سعد سلمان سے شروع اور اقبال پر ختم ہُوا۔ آج ایران کے ادبی نقاد اور ان کے ہمنوا یورپین مورخ قومی عصبیت یا مغربی طرز تنقید کی روایات کے زیر اثر ان شعرا کی قدر نہیں کرتے۔ ادھر ہندوستان میں بھی کئی لوگ ایسے پیدا ہو گئے ہیں جو ہندوستان کی فارسی شاعری کو ہندوستانی ادبیات کا حصہ نہیں سمجھتے۔ ان دونوں طبقوں کی سرد مہری کی وجہ سے ہندوستان کی فارسی شاعری سے بے توجہی برتی جا رہی ہے۔ لیکن جو لوگ ملکی اور مذہبی اختلافات سے الگ ہو کر شعر و ادب کا مطالعہ کرتے ہیں۔ وہ اس شاعری کی قدر و قیمت جانتے ہیں۔ اور کلیات غالب میں سے جو طویل فارسی انتخابات ہم نے دوسرے حصے میں درج کئے ہیں۔ اُن کے مطالعہ سے معلوم ہو جائیگا۔ کہ ہندوستان کے فارسی شعرا کے کلام میں بھی ایسی چیزیں موجود ہیں۔ جو زورِ بیان اور رفعتِ تخیل کے لحاظ سے دورِ آخر کی ایرانی شاعری سے بدرجہا بلند ہیں۔

چوتھا دَور چوتھا دَور مرزا کی شاعری کا درباری دَور ہے۔ اس زمانے میں مرزا نے کئی فارسی قصائد لکھے۔ اور ایک آدھ فارسی غزل بھی اس زمانے کی یادگار ہے۔ لیکن دربار سے تعلقات استوار ہونے کی وجہ سے انہیں درباری زبان کو اپنی زبان بنانا پڑا۔ اور اس زمانے کے اکثر اشعار اُردو ہی میں ہیں۔ بیشتر غزلیں ہیں جو مرزا نے بادشاہ کو خوش کرنے یا قلعہ کے مشاعروں میں پڑھنے کے لئے لکھیں۔ لیکن اُن کے علاوہ بادشاہ یا کسی شہزادے کی تعریف میں کئی قصائد اور قطعات بھی ہیں۔ جب مرزا نے پہلی دفعہ دیوان ریختہ مرتب کیا تھا تو اس وقت تک کسی رئیس کا دروازہ کھٹکھٹانے کی نوبت نہ آئی تھی۔ چنانچہ نسخۂ حمیدیہ میں کوئی مدحیہ قصیدہ نہیں۔ اس کے بعد فارسی زبان میں قصائد

لکھے گئے۔ لیکن درباری دور میں مرزا کو اردو زبان میں کئی مدحیہ قصائد لکھنے پڑے۔ جو اُن کے دیوان میں موجود ہیں +

ان قصائد میں سے ایک دو کسی قدر پُرلطف ہیں۔ لیکن اس زمانے کی صحیح یادگار اُردو غزلیں ہیں۔ جہاں تک زبان کا تعلق ہے۔ یہ دور مرزا کی پختگی کا زمانہ ہے۔ انہوں نے بیدلؔ کی پیروی اُنیس بیس برس کی عمر میں ترک کردی تھی۔ لیکن وسیع اور پیچیدہ مضامین سے اُنس باقی تھا اس لئے انہیں شعر میں ادا کرنے کے لئے فارسی ترکیبوں کا استعمال گوارا کرنا پڑتا تھا۔ دورِ ثانی کے کئی اشعار میں لطفِ زبان اور ندرتِ خیال میں ایک طرح کا تصادم ہے۔ لیکن مرزا نے لطفِ زبان کے لئے خیالات کو قربان نہیں کیا۔ درباری دور میں البتہ لطفِ زبان ندرتِ خیال پر غالب آگیا ہے۔ اور اخیر کی چند غزلیات میں تو خیالات شگفتہ الفاظ اور دلپذیر طرزِ اظہار کے لئے محض زنگارِ آئینہ کا کام دیتے ہیں +

مرزا کی شاعری میں اس نمایاں تغیر کی وجہ درباری تعلق تھا۔ بادشاہ اور شہزادے شاہ نصیرؔ کی طرز کے مداح تھے۔ جسے ذوقؔ نے برقرار رکھا تھا۔ چنانچہ مرزا بھی دیکھتے تھے۔ کہ مشاعروں میں وہی غزلیں مقبول ہوتی ہیں۔ جن کی زبان سادہ اور آسان ہو۔ تشبیہیں اور فارسی ترکیبیں اس قدر ہوں۔ جس قدر آٹے میں نمک۔ روزمرہ اور محاورے کی افراط ہو۔ چنانچہ مرزا پر بھی یہی رنگ چڑھ گیا۔ اور اس دور کی کئی غزلوں پر ذوقؔ کا رنگ غالب ہے۔ مثلاً ان کی وہ مشہور غزل جس کے مقطع میں بہادر شاہ کے ارادۂ حج کی طرف اشارہ ہے۔ اس غزل کا کوئی شعر ایسا نہیں جسے ذوقؔ نہ لکھ سکتا ہو۔ مضامین سادہ اور عامیانہ ہیں اور روزمرہ کی افراط ہے ؎

واعظ نہ تم پیو نہ کسی کو پلا سکو — کیا بات ہے تمہاری شرابِ طہور کی
آمد بہار کی ہے جو بلبل ہے نغمہ سنج — اڑتی سی اک خبر ہے زبانی طیور کی

ظرافت

لیکن جس خصوصیت نے اس زمانے کے اشعار کو امتیازی رنگ دے دیا ہے وہ مرزا کی شوخی اور ظرافت ہے۔ ابتدائی دور میں مرزا کے اکثر اشعار متحمل تھے۔ شاعرانہ حسن سے عاری متین اور سنجیدہ۔ لیکن ہم بتا چکے ہیں۔ کہ جب مرزا نے طبیعت کی زود

حسّی کو عقل سلیم کے قابو میں کر لیا۔ تو اُن کے اشعار میں ایک طرح کی شگفتگی آگئی۔ ایک مغربی مُفکّر کا قول ہے۔ کہ جو آدمی احساسات کا دلدادہ ہے۔ اس کے لئے زندگی ایک ٹریجیڈی ہے۔ اور سوچنے سمجھنے والے کے لئے کومیڈی۔ مرزا بے شک قوی احساسات اور جذبات کے مالک تھے۔ لیکن اُن کی فہم و دانش قوی تر تھی۔ اور جوں جوں انہیں زندگی کے نشیب و فراز سے آگاہی ہوتی گئی۔ وہ ان واقعات پر مُسکرانے لگے۔ جن کے لئے پہلے آنسو بہانے تھے۔ یہ صحیح ہے۔ کہ مرزا کی شوخی کی اصل بنا ان کی جدت طرازی اور ہر بات میں نیا پہلو نکالنے کی عادت تھی۔ لیکن یہ بھی ظاہر ہے کہ جس طریقے سے انہوں نے رنج و غم کی ہاتوں میں شگفتگیٔ طبع کو برقرار رکھا۔ وہ اُسی آدمی کا حصّہ ہو سکتا ہے۔ جس نے بقول ان کے "سختی و سستی رنج و آرام کو ہموار" کر دیا ہو۔ اور جو رنج و غم کی شدت سے اس قدر اندھا نہ ہو جاتا ہو۔ کہ رنج و الم کے سوا اُسے اور کچھ نظر ہی نہ آئے ؎

رازدانِ خوئے دہرم کردہ اند
خندہ بر دانا و ناداں میزنم

دنیا کے حوادث میں شاید المناک ترین واقعہ کسی کی موت ہے۔ جس پر دوست کیا دشمن بھی آنسو بہاتے ہیں۔ لیکن اردوئے معلی کے پڑھنے والے جانتے ہیں۔ کہ مرزا نے تعزیت کے موقعے پر بھی ظریفانہ انداز قائم رکھا۔ اور اظہار رنج اور تلقین صبر کی بجائے خطوں میں جانفزا لطیفے ہی لکھے۔ موت کے متعلق مرزا کا یہ انفرادی نقطۂ نظر کسی حد تک تو ان کی جدت پسندی کی وجہ سے ہوگا۔ لیکن اس سے بھی زیادہ یہ خاص زاویۂ نگاہ اسی چشم بصیرت کا عطیہ تھا۔ جس نے اُن کے لئے "سختی و سستی اور رنج و آرام" سب کو ہموار کر دیا تھا۔ شروع میں جب انہوں نے جذبات کی باگ ابھی تک عقل کے ہاتھوں میں نہ دی تھی۔ اُن کے اشعار میں

ف۔ ایک غیر مطبوعہ منظوم خط کے دو اشعار ہیں ؎

زرنجو دئے من مخور غم کہ من ۔۔۔ نہ دارم غمِ ہستیٔ خویشتن
نہ جاں از من است و نہ جسم آن من ۔۔۔ خود از مردنِ من چہ نقصانِ من!

موت کا بیان اسی طرح تھا۔ جس طرح دوسروں کے کلام میں مثلاً "ہائے ہائے" کی ردیف میں ان کی مشہور غزل پڑھیئے۔ جو انہوں نے تیئس چوبیس سال کی عمر میں کسی کی وفات پر لکھی تھی۔ اگرچہ یہ مرثیہ بہت پُر درد ہے۔ لیکن اسلوب خیال بالکل رسمی اور عامیانہ ہے۔ جب ہم اس کا مقابلہ عارف کے مرثیے سے کرتے ہیں۔ جو اس سے پچیس تیس برس بعد لکھا گیا۔ تو ہم دیکھتے ہیں کہ اس عرصے میں شاعر کا نقطۂ نظر بہت بدل گیا ہے بلکہ مرثیے میں مرزا نے ہجوم غم کی وجہ سے اپنا سکون اور توازن کھو نہیں دیا۔ اور موضوع بہت دردناک ہونے کے باوجود انہوں نے اپنی شوخ نگاری برقرار رکھی ہے۔ عارفؔ سے خطاب ہے سے

تم کونسے ایسے تھے کھرے داد و ستد کے
کرتا ملک الموت تقاضا کوئی دن اور

پچیس تیس برس کے وقفے سے مرزا نے جو دو مرثیے لکھے۔ ان کی طرز تحریر کا فرق ان کی عام شاعری میں بھی نمایاں ہے۔ ابتدا میں متانت غالب تھی۔ لیکن بتدریج خیالات شگفتہ ہوتے گئے اور اگرچہ اُن کی ظرافت کا بہترین نمونہ ان کے وہ اردو خطوط ہیں۔ جو انہوں نے غدر کے بعد لکھے۔ لیکن جہاں تک شعر و شاعری کا تعلق ہے۔ شوخ اور ظریفانہ اشعار کی جو کثرت درباری دور میں ہے۔ اس سے پہلے کبھی نہ تھی +

مرزا کی عام شاعری کا میدان وسیع تھا۔ اسی طرح شوخی اور ظرافت کو بھی انہوں نے چند مضامین تک محدود نہیں رکھا۔ اُن کی ظرافت بہت پاکیزہ تھی۔ اور تبسم زیر لب سے آگے کبھی نہ بڑھتی۔ لیکن اس میں کسی کی رُو و رعایت نہ کرتے تھے۔ گاہے گاہے اپنے اوپر بھی ہنس لیتے تھے سے

غافل ان مہ طلعتوں کے واسطے — چاہنے والا بھی اچھا چاہیئے
چاہتے ہیں خوب رُویوں کو اسدؔ — آپ کی صورت تو دیکھا چاہیئے

غالبؔ وظیفہ خوار ہو دو شاہ کو دُعا — وہ دن گئے کہ کہتے تھے "نوکر نہیں ہوں میں"

ایک دو جگہ تو شوخی حد سے گذر گئی ہے۔ اور عمل بیلنے کی طرف ہاتھ اُٹھتا نظر آتا ہے سے

حسن میں حور سے بڑھکر نہیں ہونے کے کبھی   آپ کا شیوہ و انداز و ادا اور سہی

یہ ظریفانہ اشعار زیادہ تر شوخیٔ طبع کا اظہار ہیں۔ لیکن جس کثرت اور جس چبھتے ہوئے طریقے سے انہوں نے بہشت کا تمسخر اڑایا ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے۔ کہ یہ موضوع انہیں بہت بھاتا تھا ؎

میں جو کہتا ہوں کہ ہم حشر میں لینگے تم کو   کس رعونت سے وہ کہتے ہیں کہ "ہم حور نہیں"

کیا ہی رضواں سے لڑائی ہوگی   گھر ترا خلد میں گر یاد آیا

قدرتِ حق سے یہی حوریں اگر واں ہوگئیں   ان پریزادوں سے لینگے خلد میں ہم انتقام

پانچواں دور

کلام غالب کی پہلی تاریخی تدوین کرتے وقت ہم نے ان اشعار کو جو غدر کے بعد لکھے گئے باقی اشعار سے علیحدہ ترتیب دیا تھا۔ لیکن اشعار کی تعداد تھوڑی تھی۔ اس لئے ہم نے ان کی بنا پر ایک مستقل دورِ شاعری متعین نہ کیا۔ غالب نامہ کی پہلی اشاعت کے بعد مکاتیب غالب اور سبدچین شائع ہوئے ہیں۔ ان کی وجہ سے ہماری رسائی غالب کے نئے کلام تک ہوئی ہے اور بعض پرانی غزلوں اور قصیدوں کے مستند ہونے کی تصدیق بھی ہوئی ہے۔ اب اس حصۂ کلام کو جداگانہ طور پر مطالعہ کرنے میں شاید کوئی ہرج نہ ہو٭

درباری تعلقات کی وجہ سے غدر سے پہلے کئی سال تک مرزا نے زیادہ توجہ اردو کی طرف رکھی۔ اس اثنا میں انہوں نے فارسی اشعار بھی کہے۔ لیکن ان اشعار بالخصوص فارسی غزلیات کی تعداد نسبتاً کم ہے۔ کلام کا بیشتر حصہ اردو میں ہے۔ غدر کے بعد دربار اور درباری تعلقات ختم ہوگئے۔ اب مرزا نے فارسی پر پھر زیادہ توجہ دینی شروع کی۔ اور غدر کے بعد انہوں نے جو اشعار کہے ہیں۔ ان میں فارسی اشعار کی تعداد اردو اشعار سے زیادہ ہے٭

غدر کے بعد مرزا نے جو اردو فارسی اشعار کہے۔ وہ طرزِ تحریر اور خیالات کے لحاظ سے ان کے درباری دور کے اشعار سے مشابہ ہیں۔ کلام میں سادگی اور شوخی ہے اور تلمیحات اور دور از کار

تشبیہات کی بھرمار نہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانے میں دیوان قاآنی اُن تک پہنچ گیا تھا۔ اور دیوان حافظ کو بھی انہوں نے زیادہ توجہ کی نظر سے دیکھا۔ سبد چیں میں کم از کم تین غزلیات ایسی ہیں جن میں حافظ کی طرف اشارہ ہے۔ اور ایسی غزلیات بھی موجود ہیں۔ جن کی بحریں اور لفظوں کی ترتیب اور خوش آہنگی قاآنی کی یاد دلاتی ہے ؎

اے خداوند خردمند و جہاں داور دانا — وے بہ نیروئے خرد بہ ہمہ کردار توانا
بہ ادا پایہ فزایا، بہ نظر عقد کشایا — بہ کرم ابر عطایا، بغضب برق سنانا
بہ نگہ خستہ نوازا، بہ سخن بذلہ طرازا — بہ قلم غالیہ سایا، بہ نفس عطر فشایا

ایک اور فارسی غزل کی ردیف اور بحر بڑی دلچسپ ہے ؎

ہاں من عاشق ذاتم تن تانا ہا یا ہو — ناظر حسن صفاتم تن تانا ہا یا ہو

مرزا کی یہ جدت طرازیاں فارسی تک ہی محدود نہ تھیں۔ انہوں نے امیر کلب علی خاں کی تعریف میں جو دو اردو قطعے اور نواب علاء الدین کے ایما پہ جو اردو غزل لکھی ہے۔ وہ بھی بحر و قافیہ کے اعتبار سے بہت دلچسپ ہیں۔ معلوم ہوتا ہے۔ کہ مرزا ان دنوں کہن سالی اور خرابئ صحت کی وجہ سے تلاش مضمون میں تو بہت محنت نہ کر سکتے تھے۔ اس لئے الفاظ کی تراش خراش اور اشعار کی عروضی خصوصیات میں جدتیں پیدا کر کے دلچسپی بہم پہنچاتے رہے۔

مرزا نے اس زمانے کی جن اردو فارسی غزلیات کو اپنے خطوط میں درج کیا ہے۔ وہ تو شاعرانہ نقطۂ نظر سے مرزا کے بہترین کلام کے ہم پایہ ہیں۔ لیکن اس زمانے کے بعض اشعار ایسے بھی ہیں۔ جو مرزا کے عام معیار شعر سے گرے ہوئے ہیں۔ ہم نے انہیں "تبرکاً" اور اپنے اندراجات کو مکمل کرنے کے لئے درج کتاب کر دیا ہے۔ لیکن ظاہر ہے کہ ان ہنگامی اشعار کی بنا پر مرزا کی شاعری کے متعلق کوئی نتیجہ اخذ نہیں ہو سکتا۔

غالب کی مقبولیت کے اسباب

مرزا کی شاعری کی خصوصیات جس ترتیب سے وہ کسی دور میں زیادہ نمایاں تھیں ہم نے

بیان کر دی ہیں ۔ لیکن غالب کی غیر معمولی مقبولیت سمجھنے کے لئے وہ کافی نہیں ۔ کلام غالب کی مقبولیت کی سب سے بڑی وجہ اس کا حیرت انگیز تنوع ہے جسے ڈاکٹر عبدالرحمن نے نہایت نفیس طریقے سے بیان کیا ہے "لوح سے تمت تک مشکل سے سو صفحے ہیں ۔ لیکن کیا ہے ۔ جو یہاں حاضر نہیں ۔ کونسا نغمہ ہے جو اس زندگی کے تاروں میں بیدار یا خوابیدہ موجود نہیں ؟" مرزا کی شاعری زیادہ تر عشق و محبت کا بیان ہے لیکن دقیق اور پیچیدہ خیالات کے طالب کے لئے یہاں منطقی دلائل اور پیچیدہ خیالات بھی ہیں ۔ شگفتہ طبع لوگوں کے لئے شوخی اور ظرافت ۔ انسانی فطرت کی داستان سنتا ہو ۔ تو یہاں وہ پتے کی باتیں ملیں گی کہ جوں جوں چشم بصیرت کھلتی جائے گی اس کا لطف بڑھتا جائیگا ۔ یہی وجہ ہے کہ دیوان غالب میں ہر شخص اپنی تصویر دیکھتا ہے ۔ اور لطف اٹھاتا ہے +

لیکن ہم یہ بتا دینا چاہتے ہیں کہ اس ساز میں نغموں کی فراوانی اور ہر نغمے کی دلآویزی کی وجہ یہ ہے کہ کلام غالب سنی سنائی باتوں کا بیان نہیں ۔ بلکہ قلب غالب کے مشاہدات کا آئینہ ہے ۔ اس رباب پر دست قدرت نے سارے سُر ایک ایک کرکے بجائے ہیں ۔ اور دیوان غالب انہی سُروں کی صدائے بازگشت ہے ۔ ہ

زخمہ بر تار رگِ جاں میزنم   کس چہ داند تا چہ دستاں میزنم

مسٹر والٹر ریلے نے شیکسپیئر کے متعلق لکھا ہے "وہ کمیاب ترین چیز تھا یعنی ایک پورا انسان" شیکسپیئر کے متعلق تو یہ رائے اس کی کتابوں کے مطالعہ پر مبنی ہے لیکن جن گوناگوں تجربوں سے مرزا کو واسطہ پڑا تھا اگر ان کا مقابلہ شیکسپیئر کے حالات سے کریں ۔ تو مرزا کا پلہ شیکسپیئر سے ہلکا نہیں رہیگا مرزا کی زندگی میں ان کے ایک مخالف نے انکے متعلق طنزاً لکھا تھا[1] "آپ انتخاب زماں ہیں ۔ یکہ دوراں ہیں ۔ جس طرف طبیعت آئی ۔ اس کی خاک اڑائی ۔ چنانچہ دختر رز سے جو تاک لگائی ۔ تو وہ ظرف پیدا کیا ۔ کہ مینائے گردوں میں شراب شفق قاضی آفتاب بادب پیشکش لایا ۔ اور قمار بازی پہ جو دھیان کیا ۔ تو وہ چھٹے جواری ہوئے

[1] گلستان بیخزاں

کہ میر لباط اور بکھڑے داؤں کھانے لگے "۔ لیکن یہ تصویر کا فقط ایک پہلو ہے۔ جہاں مرزا مینخانے اور قمار خانے کی پوری طرح خاک چھان چکے تھے۔ وہاں وہ شرع اور تصوف کی منزلوں سے بھی ناواقف نہ تھے۔ دہلی کے دو بڑے عالم مولوی فضل حق خیر آبادی اور مولینا صدر الدین اُن کے عزیز ترین دوست تھے۔ اور جس کثرت سے تصوف کے مضامین ان کے اشعار میں ادا ہوئے ہیں۔ اتنے ہندوستان کے شاید ہی کسی اور شاعر کے کلام میں ملینگے۔ وہ رنگ رلیوں میں پلکر جوان ہوئے تھے لیکن زمانے نے ایک ایک کر کے اپنے ترکش کے سارے تیر اُن پر چلائے اور جہاں وہ بزم نشاط اور محفلِ عشرت میں اجنبی معلوم نہ ہوتے تھے وہاں دردمند دل کے مصائب بھی خوب سمجھتے تھے۔ نتیجہ یہ ہے کہ میخوار ہو یا محتسب شوخی اور ظرافت کا دلدادہ ہو یا غمزدہ فیلسفی ہو یا عاشق مزاج ان سب کیلئے کلام غالب میں کچھ نہ کچھ موجود ہے +

مرزا کی مقبولیت کی ایک وجہ یہ بھی ہے۔ کہ وہ نئی طرز کے مُوجد تھے اور ان کے خیالات کا جو اسلوب تھا۔ آج زمانہ اس کی تائید کر رہا ہے۔ ہم یہ ذکر کر چکے ہیں کہ مرزا تقلید کے قائل نہ تھے۔ اپنی سمجھ پر زیادہ بھروسہ کرتے تھے۔ ان کی جدت پسندی نئے مضمون اور نئی تشبیہیں تلاش کرنے تک محدود نہ تھی۔ بلکہ لغت، شعر، انشا اور دوسری علمی و ادبی باتوں کے علاوہ وضع قطع اور لباس میں بھی وہ اپنے پیشرووں اور معاصروں کی پیروی کرنا ضروری نہ سمجھتے اور ان پر آزادانہ نکتہ چینی کرتے تھے +

جب کلکتہ میں ان کے اشعار پر یہ اعتراض ہُوا کہ انہوں نے قتیل کے وضع کردہ اصولوں کا خیال نہیں رکھا۔ تو انہوں نے بڑے جوش سے کہا تھا۔ ؎

زلہ بردار کس چرا باشم   من ہمایم مگس چرا باشم[1]

---

[1] حال ہی میں ایک نقاد نے اردو ادب پر انگریزی ادبیات کا اثر پرکھتے ہوئے بتایا ہے۔ کہ جدید اردو شعر و ادب میں اساتذہ سلف کی تقلید سے آزادی انگریزی ادبیات اور مغربی اساتذہ سے تعلقات کا نتیجہ ہے۔ بڑی حد تک ہم اس رائے سے متفق ہیں۔ لیکن یہ امر غور طلب ہے۔ کہ حالیؔ، جو اردو شاعری، فن تنقید اور سوانح نگاری میں موجودہ انقلاب کا بانی تھا۔ انگریزی سے قریباً قریباً نابلد تھا۔ غالب خود انگریزی سے بالکل بے بہرہ تھا۔ اور یہ بات بھی بہت عجیب ہے۔ کہ کلکتے کا مدرسہ جو ایسٹ انڈیا کمپنی نے جاری کیا تھا۔ اور جہاں معلمین اور طلبا کو انگریز حکام اور اساتذہ سے ملنے کے بہت موقعے ملتے رہتے تھے۔ تقلید اور تنگ خیالی کا مرکز بنا ہوا تھا اور غالب جسے یہ موقعے بھی میسر نہ آئے تھے۔ آزاد خیالی کا وعظ کر رہا تھا +

یہ آزاد خیالی اور تقلید سے نفرت عمر بھر اُن کی امتیازی خصوصیت رہی۔ اور موجودہ زمانے میں بھی یہی طرزِ عمل زیادہ مقبول ہے۔ اسی طرح مرزا نے اپنے دوستوں کی کتابوں پر جو تبصرے لکھے۔ وہ اگرچہ بہت بلند پایہ نہیں۔ لیکن ان میں اور مغربی طرز کی تقاریظ میں یہ بات مشترک ہے۔ کہ وہ کتاب اور مصنف کی تعریف میں مبالغے سے پاک ہیں۔ اس کے علاوہ زبان اور محاورے[1] پر مضمون اور خیال کو مقدم رکھنے کی جو خصوصیت کلامِ غالب میں موجود ہے۔ مغربی شاعری کے تنقیدی اصول بھی ان کے حامی ہیں۔ چنانچہ ان سب باتوں کی وجہ سے موجودہ نسل جس کی تعلیم مغربی اصولوں پر ہوئی ہے۔ مرزا کے کلام اور اپنے خیالات میں دوسرے مشرقی شعرا کی بہ نسبت بہت زیادہ باتیں مشترک پاتی ہے +

اعتراضات

موجودہ نسل کو پُرانی طرز کے غزل گو شعرا میں سے غالب سب سے زیادہ پسند ہے۔ لیکن جن لوگوں نے فنِ تنقید کے عام اصولوں سے گزر کر جزوی اور فروعی باتوں میں بھی مغربی شاعری کی تقلید کو شاعری کی معراج سمجھا ہے۔ انہوں نے غالبؔ کے کلام پر کئی اعتراض کئے ہیں۔ بالعموم یہ اعتراض خاص غالبؔ کے متعلق نہیں۔ بلکہ تمام مشرقی شاعری پر کئے جا سکتے ہیں۔ مثلاً ایک اہم اعتراض یہ ہے۔ کہ غالب نے بیشتر غزلیں لکھیں۔ اور غزل شاعرانہ جذبات کے اظہار کا ایک ناقص ذریعہ ہے۔ یہ بات صحیح ہے کہ غزل کے اشعار میں ربط ردیف اور قافیے کی وجہ سے ہوتا ہے مضمون کی وحدت سے نہیں۔ اور غالبؔ کی اکثر غزلیں الگ الگ اشعار کے گلدستے ہیں اور ایک وجدانی کیفیت کے مسلسل اظہار کی بجائے مضمون آفرینی اور خیال آرائی کے لئے وقف ہیں۔ لیکن آخر یہ غالبؔ کی بدقسمتی تھی۔ کہ جب اُس نے شعر گوئی شروع کی۔

---

[1] مرزا کی قدر دہلی اور لکھنؤ سے زیادہ پنجاب میں ہوئی ہے۔ اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ پنجاب میں اُردو زبان بولی نہیں جاتی۔ اور لوگ زبان اور محاورے کی لطیف خوبیوں سے اتنے لطف اندوز نہیں ہوتے۔ جس قدر خیالات سے۔ یہ اتفاق کہ اردو زبان کا مستقبل دہلی اور لکھنؤ سے زیادہ پنجاب سے وابستہ ہو گیا ہے۔ دیوانِ غالبؔ کی مقبولیت میں اضافے کا باعث ہُوا ہے +

تو غزل کے علاوہ اور کوئی صنفِ شاعری مقبول نہ تھی۔ اور اس کے علاوہ اس امر کا اعتراف نہ کرنا بھی بے انصافی ہے کہ غالب کے دیوان میں مسلسل اشعار کی جو کثرت ہے۔ وہ کسی اور ہندوستانی شاعر کے کلام میں شاید ہی ہوگی۔ اور اس کی اکثر غزلوں میں کچھ قافیہ و ردیف کی ہم آہنگی سے اور کچھ اپنی شخصیت کے پرتو سے ایک ایسی فضا پیدا ہو گئی ہے جس میں مختلف اشعار کی انفرادیت کھپ گئی ہے۔ اور کوئی تال بے سُر معلوم نہیں ہوتی +

غزل پر ایک اور اعتراض یہ کیا جاتا ہے۔ کہ اس میں معنوی وحدت تو کوئی ہوتی نہیں اس لئے غزلگو شعرا اپنے سامنے چند قافیے رکھ لیتے ہیں اور اُن کے مطابق اس وقت جو مضمون ذہن میں آئے۔ اُسے نظم کر کے غزل مکمل کر لیتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ نہ تو شعر میں آمد ہوتی ہے۔ اور نہ غزل میں شاعر کے ذاتی نقطۂ نظر کا اظہار ہوتا ہے۔ ممکن ہے یہ خیال کسی اور غزلگو شاعر کے متعلق صحیح ہو۔ لیکن کم از کم مرزا اس سے مستثنےٰ ہیں۔ انہوں نے خود ایک خط میں بڑے زور سے اس خیال کی تردید کی ہے۔ منشی ہرگوپال تفتہ کو لکھتے ہیں "دیکھیا ہنسی آتی ہے۔ کہ تم مانند اور شاعروں کے مُجھ کو بھی یہ سمجھتے ہو کہ اُستاد کی غزل یا قصیدہ سامنے رکھ لیا یا اس کے قوافی لکھ لئے۔ اور ان قافیوں پر لفظ جوڑنے لگے۔ لاحول ولا قوۃ الا باللہ۔ بچپن میں جب میں ریختہ لکھنے لگا ہوں۔ لعنت ہے مجھ پر اگر میں نے کوئی ریختہ یا اس کے قوافی پیش رکھ لئے ہوں صرف بحر اور ردیف قافیہ دیکھ لیا اور اس زمین میں غزل قصیدہ لکھنے لگا"۔ قطع نظر اس امر سے کہ مرزا اس طرزِ شعر گوئی سے خود متنفر تھے۔ اُن کے کلام سے بھی اس خیال کی تائید ہوتی ہے کہ ان کی غزلگوئی محض قافیہ پیمائی نہیں۔ بلکہ اُن کی اپنی دلفریب شخصیت کا اظہار ہے۔ شاعر کے خیالات میں بھی عام انسانوں کی طرح تغیر و تبدل ہوتا رہتا ہے۔ اور اگر آج ایک بات کا ایک پہلو نظر آتا ہے۔ تو کل دوسرا۔ چنانچہ دیوانِ غالب میں بھی یہ تفاوت موجود ہے۔ لیکن اس میں مشکل سے کوئی شعر ایسا ملے گا۔ جسے غالب کی اُس عظیم اور متنوع شخصیت سے منسوب نہ کیا جا سکے۔ جس سے ہم یادگارِ غالب کی وجہ سے خوب واقف ہیں +

مرزا غالب کا زاویۂ نگاہ عام لوگوں سے کئی باتوں میں مختلف تھا اور انکے اشعار میں بھی اپنے ہی خیالات کی تکرار ہوتی ہے۔ ہم لکھ چکے ہیں

کہ انہوں نے بہشت کا ذکر ہمیشہ استہزا سے کیا۔ اور یہ ان کے شخصی نقطۂ نظر کا اظہار معلوم ہوتا ہے۔ اسی طرح فرہاد کا ذکر ان کے اشعار میں کئی جگہ آیا ہے۔ اور سب جگہ طنزاً۔ مذہب کے متعلق ان کے بیسیوں اشعار ہیں۔ اور ہر شعر ان کی وسعت نظر اور طبعی تشکک کا اظہار ہے۔ اسی طرح رشک کے مضامین ہوں یا انسان کی فطری مجبوریوں کا ذکر طرزِ اظہار کے اختلاف سے قطع نظر وہ مرزا ہی کے اسلوب خیال کو نمایاں کرتے ہیں۔ اور بالعموم یہ خیال نہیں ہوتا۔ کہ مرزا نے کوئی مضمون قافیے سے مجبور ہو کر باندھ دیا ہے۔ بلکہ ایسا معلوم ہوتا ہے۔ کہ غزل ایک جامہ موزوں ہے۔ جو مرزا کی شخصیت پر راست آیا۔ اور جس نے اس کی دلفریب شخصیت کو اور نمایاں کر دیا +

نیچرل شاعری

مرزا کی شاعری پر ایک اور اعتراض یہ کیا گیا ہے۔ کہ وہ "نیچرل" نہیں۔ جب حالی نے یہ اصطلاح "مقدمۂ شعر و شاعری" میں پہلی مرتبہ استعمال کی تھی تو اس سے اس سے وہ شاعری مراد لی تھی جو "خیالی نہ ہو بلکہ نیچر یا فطرت کے مطابق ہو۔ اگر کلام غالب کو اس نقطۂ نظر سے جانچا جائے تو یہ اعتراض صحیح معلوم نہیں ہوتا۔ اگرچہ مرزا نے عام شاعروں کی طرح کئی جگہ مبالغے سے کام لیا ہے۔ لیکن ان کے بیشتر مضامین اصولاً عین فطرت کے مطابق ہیں۔ اور فطرت انسانی کے جو راز ان کے کلام میں بے نقاب ہوئے ہیں۔ وہ اور شعرا کے کلام میں بہت کم ہیں۔ معترضین نیچرل شاعری سے بالعموم مناظر قدرت کی شاعری مراد لیتے ہیں۔ اور کہتے ہیں کہ مرزا کے کلام میں یہ بڑا عیب ہے کہ انہوں نے مغربی شاعروں کی طرح مناظر فطرت کے متعلق نظمیں نہیں لکھیں۔ حقیقتاً یہ اعتراض بھی خاص مرزا کے متعلق نہیں۔ بلکہ اکثر مشرقی شعرا پر کیا جا سکتا ہے۔ اور یہ عموماً وہی لوگ کرتے ہیں۔ جو اپنے بزرگوں کی تقلید سے تو آزاد ہو جاتے ہیں۔ لیکن مغرب کی کورانہ تقلید کو انتہائی آزاد خیالی اور معراج کمال سمجھتے ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ انگریزی زبان کی کئی بلند پایہ نظمیں مناظر فطرت کے متعلق ہیں۔ اور انگریزی ادب میں مناظرِ فطرت کی شاعری کو ایک خاص درجہ حاصل ہے۔ لیکن اس سے بھی تو انکار نہیں کیا جا سکتا۔ کہ انگلستان بالخصوص "لیک ڈسٹرکٹس" میں شاندار مناظر قدرت کی جو فراوانی ہے۔ وہ ہندوستان یا کم از کم دہلی کے گرد و نواح میں میسر نہیں۔ اور اگر کوئی

دہلوی شاعر اس خیال سے مرعوب ہو کر کہ انگریزی شاعری میں مناظرِ فطرت کے متعلق بہت نظمیں ہیں۔ خود بھی اُونچے اونچے پہاڑوں اور خوش منظر جھیلوں کے خوبصورت مناظر اور چہچہاتے پرندوں کی موسیقی کو اپنی شاعری کا موضوع بنائے۔ تو ظاہر ہے کہ اس سے زیادہ ان نیچرل یا مصنوعی شاعری کوئی نہ ہوگی۔ جو لوگ گرم ملکوں کے چٹیل میدانوں میں رہتے ہیں۔ انہیں وہ دلفریب مناظر دیکھنے کا موقع ہی نہیں ملتا۔ جو قدرت نے فیاضی سے کشمیر۔ سوئٹزرلینڈ یا لیک ڈسٹرکٹس میں بہم پہنچائے ہیں۔ انہیں جو خوبصورت مناظر دیکھنے نصیب ہوتے ہیں۔ وہ بہت محدود ہیں مثلاً چاندنی رات، صبح، شام، شفق کی رنگینی اور دریا کا کنارہ بسنت بہار، برسات۔ اور اردو میں ان مناظر کے متعلق کئی نظمیں ہیں +

مرزا بھی ان مناظر سے بے پرواہ نہ تھے۔ اور اُن کے فارسی کلیات اور اردو دیوان میں متعدد اشعار ایسے ہیں۔ جن میں بہار، صبح، شام، برسات اور موسم سرما کی دلآویز تصویریں کھینچی ہیں "نمودارئ صبح" اور "ہجوم ظلمت شب" کے متعلق تو مرزا نے ، فارسی نثر میں بھی عبارت آرائی کی ہے اور اس سلسلے میں دو دلچسپ فارسی مثنویاں لکھی ہیں۔ اس کے علاوہ اُن کے فارسی قصائد کی بہترین تشبیہیں مناظر فطرت کے متعلق ہیں۔ ابتدائی اردو کلام میں بھی کئی نئی تشبیہیں ایسی ہیں۔ جو شاعر نے مناظر فطرت سے اخذ کی ہیں۔ اور جو ذاتی مشاہدے پر مبنی معلوم ہوتی ہیں یہ صحیح ہے مرزا کے ہاں نیچر فقط ایک دلچسپ شاعرانہ موضوع ہے اور ورڈز ورتھ اور دوسرے انگریزی شعرا کی طرح ایک دلآویز شخصیت نہیں، جس سے شاعر کو محبت ہو جاتی ہے۔ اور جو شاعر کو دُنیا کے مصائب و آلام کے مقابلے میں آرام و سکون بہم پہنچاتی ہے۔ مرزا کو نیچر سے وہ والہانہ وابستگی نہ تھی۔ جو ورڈز ورتھ کو تھی، لیکن جیسا کہ ہم کہہ چکے ہیں۔ نیچرل شاعری کی نشوونما شاعر کے ماحول پر منحصر ہے۔ اور ایک شہری شاعر سے یہ توقع نہیں کی جاسکتی۔ کہ وہ نیچر اور مناظر فطرت کی شاعری میں معراج کمال حاصل کرے +

اُردو کے کلاسیکل نقادوں نے مرزا کے کلام پر جو اعتراض کئے ہیں۔ وہ یا تو زبان کے متعلق ہیں۔ یا بقول سر والٹر ریلے "دہی کھانے والوں" کی نقادی، یعنی سرقہ اور توارد کی بحث۔ مرزا یاس اور مولینا آرگس (مولینا عبدالباری آسی؟) نے محنت اور تحقیق سے اساتذہ قدیم کے کلام سے کئی شعر ایسے ڈھونڈ نکالے ہیں۔ جن کے مضامین غالب کے اشعار سے ملتے جلتے ہیں۔ کسی زمانے میں ملٹن کے اشعار کے متعلق

بھی اسی طرح کا حساب کتاب ہُوا تھا۔ لیکن اس سے اس کی شہرت کو کوئی ضعف نہیں پہنچا۔ کیونکہ ایک تو بقول گوئٹے کائنات میں کوئی چیز بالکل نئی نہیں۔ اور دوسرے کسی شاعر کے چند اشعار میں توارد یا سرقہ ثابت کرنے سے اس کے باقی اشعار کی خوبیاں ضائع نہیں ہو جاتیں +

غالب کا فلسفہ

ان اعتراضات سے قطع نظر ایک اور مسئلہ جو آجکل معرضِ بحث میں ہے۔ غالب کے فلسفے کے متعلق ہے۔ غالب کے مداح مُصر ہیں۔ کہ وہ ایک بہت بڑا فلسفی تھا۔ اور اگر فلسفے سے پیچیدہ اور دقیق خیالات کا اجتماع مراد لیا جائے۔ تو اس رائے سے بہت کم لوگ اختلاف کرینگے۔ اگر کسی شاعر کے فلسفے سے اس کا انسانی زندگی یا اس کے کسی اہم پہلو کے متعلق کوئی خاص شخصی نقطۂ نظر مراد ہے۔ تو آجتک یہ دعویٰ ثبوت کا محتاج رہا ہے۔ ایک غزل گو کی شاعری کچھ اس طرح کی ہوتی ہے کہ جب تک وہ اقبال کی طرح اپنے نقطۂ نظر کی ترجمانی کی خاص کوشش نہ کرے۔ یا حافظ کی طرح ہمیشہ ایک ہی نشے میں مست نہ رہے۔ اس کے کلام میں چند خیالات کی تکرار کی بجائے مختلف النوع خیالات کا ہجوم ہوتا ہے۔ چنانچہ غالب کے فلسفے کے متعلق کوئی بھی نظریہ قائم کیا جائے۔ اس کی تردید کے لئے بیسیوں اشعار مل جائینگے۔ غزل کی اس خصوصیت کے علاوہ مرزا کا دل ایک ایسا جامِ جہاں نما ہے جس میں ایک ہی نقش بار بار نظر نہیں آتا۔ بلکہ اس میں فطرت کے تمام نقوش نمایاں ہیں۔ ان کا دل ایک آئینہ ہے۔ جس میں فطرت کے تمام عکس اس طرح نظر آرہے ہیں کہ ایک تصویر سے دوسری تصویر مختلف ہے۔ یہ ممکن ہے۔ کہ چند نقوش پر پردہ ڈالنے اور ایک آدھ کو نمایاں کرنے سے ایک تصویر بنائی جا سکے۔ جسے خوش فہم حضرات غالب کا فلسفۂ زندگی یا اُس کا شاعرانہ پیغام سمجھ لیں۔ لیکن آخر اس کوشش سے فائدہ؟ کیا یہ ضروری ہے۔ کہ ہر شاعر کوئی خاص پیغام یا فلسفۂ زندگی چھوڑ جائے؟ یہ صحیح ہے کہ بعض حضرات ایسے ہیں جن کے نزدیک شاعر کی خوبی اسی میں ہے کہ وہ اپنے خیالات اور احساسات کا نچوڑ رباعیوں اور قطعوں کی صورت میں اُن کے حوالے کردے۔ تاکہ وہ انہیں دیواروں پہ لگائیں۔ اور روزمرہ کی زندگی میں اپنے لئے چراغِ راہ بنائیں۔ ان خوش نصیب لوگوں کی طبیعتیں سدھائے ہوئے گھوڑوں کی طرح

ہیں جنہیں باگ کے اشارے سے جس طرف چاہیں موڑ سکتے ہیں۔ لیکن ظاہر ہے کہ بلند تربین شاعری ان لوگوں کے لئے نہیں۔ شاعر کا کام عقائد کو بدلنا نہیں۔ بلکہ تخیّل کی نشوونما اور تربیت ہے۔ وہ جانتا ہے کہ زندگی کے راز جو ذاتی احساسات اور مشاہدات کا عطیہ ہیں ان کا نچوڑ حقایق اور فلسفے کی صورت میں انسان کے سامنے پیش کر دیا جائے۔ تو اس کا کوئی فائدہ نہیں۔ جب تک تخیل کی نشوونما اسی شعوری بلندی تک نہ پہنچ گئی ہو۔ ایک بلند مرتبہ شاعر جو انسانی فطرت کا بھی صحیح نباض ہوتا ہے۔ اس لطیف نکتے سے بےخبر نہیں۔ کہ انسان کے عقاید اور اس کے تخیل میں اکثر ایک خفیف سا تضاد ہوتا ہے۔ اور اگر فلسفۂ زندگی اور پیغام سے ایک شخص کے عقائد بدل دیئے جائیں۔ لیکن اس کی دنیائے تخیل بالنفس غیر شعورہ اسی طرح رہے۔ تو یہ تضاد اور گہرا ہو جاتا ہے۔ اس سے انسانی فطرت ان بلندیوں پہ نہیں پہنچتی۔ جن کے حاصل کرنے کے لئے شاعری مفید ہو سکتی ہے۔ وہ ایک شرابخور کو دیکھتا ہے۔ جسے میخواری کے نقائص سمجھا دیئے گئے ہیں۔ اور جو اسے ترک کرنا چاہتا ہے۔ وہ اس بات کا قائل ہو گیا ہے۔ کہ شراب خوری بُری عادت ہے۔ لیکن اُٹھتے بیٹھتے سوتے جاگتے اس کے ذہن کی گہرائیوں میں ایک شراب خوری کے خیالات موجزن رہتے ہیں۔ اس کی دنیائے تخیل ایک شراب خور کی ہے۔ اگرچہ وہ پرہیز گاری کا فلسفہ بھی خوب سمجھتا ہے۔ اب انسانی فطرت کچھ اس طرح کی واقع ہوئی ہے۔ کہ اس حالت میں شراب خوری کے خلاف جس قدر دلیلیں اس کے سامنے پیش کی جائینگی۔ اُن سے اس کی باطنی کشمکش میں اضافہ تو ہوگا۔ لیکن جب تک اس کی دنیائے تخیل ہی کو نہ بدلا جائے گا۔ وہ اس گڑھے سے باہر نہیں نکل سکیگا۔ اسی طرح بہت ممکن ہے کہ ایک آدمی فلسفۂ عمل کا بہت معتقد ہو۔ صبح و شام "اسرارِ خودی" اور "درسِ حیات" کی تلاوت کرتا رہتا ہو۔ لیکن جب عمل کا وقت آئے۔ تو تخیل اس کا ساتھ نہ دے۔ بلکہ اس کی مخالفت کرے اور اُس کے ذہن کی گہرائیوں سے فقط ایسے احساسات اور خیالات پیدا ہوں۔ جن سے عمل غیر ضروری بلکہ مُضر معلوم ہو۔ ظاہر ہے کہ ایسی صورت میں اگر تخیل کی صحیح تربیت نہیں ہوئی تو اس فلسفۂ عمل سے ایک ذہنی کشمکش کے سوا اور کچھ حاصل نہ ہوگا۔ اور بقولِ حکیم الامت رح ع

برقے کہ بہ خود پیچد بیرو بہ سحاب اندر!

ہم یہ تسلیم کرتے ہیں کہ ہر بڑا شاعر زندگی پر اثر ڈالتا ہے۔ اور انتہائی شاعرانہ عظمت کا معیار انسانی زندگی کو بدلنے کی قابلیت ہے۔ لیکن اثر اندازی کے لئے یہ ضروری نہیں۔ کہ شاعر کسی معین فلسفۂ زندگی یا پیغام کا حامل بھی ہو۔ یہی نہیں بلکہ دنیائے شعر میں انتہائی عظمت اکثر انہی لوگوں نے حاصل کی ہے۔ جنہوں نے انسانی عقائد اور زندگی کے فلسفوں کو تو نہیں چھوا۔ لیکن اپنے کلام میں تخیل کی تربیت اور نشوونما کا ایسا سامان چھوڑا ہے۔ جس سے انسانی فطرت میں ایک انقلاب پیدا ہو گیا ہے۔ شیکسپیئر اور غالب دونوں اسی طبقے سے تعلق رکھتے ہیں۔ دونوں نے زندگی کے کسی ایک پہلو پر زیادہ زور نہیں دیا۔ کیونکہ ایک پہلو پر زیادہ زور تو وہ دے جسے دوسرے پہلو نمایاں نظر نہ آتے ہوں۔ لیکن یہ صرف ظاہر میں ہی کہیں گے۔ کہ انہوں نے انسانی زندگی کو متاثر نہیں کیا۔ انہوں نے کوئی فلسفہ یا پیغام دنیا کے لئے یادگار نہیں چھوڑا۔ لیکن انسانی تخیل کی صحیح تربیت اور انسانی فطرت کے ارتقا کیلئے ان کا کلام اسی طرح مفید ہے۔ جس طرح ایک عظیم اور بلند مرتبہ شخصیت کا فیض صحبت! ایک بڑا شاعر خود ایک عظیم الشان شخصیت کا حامل ہوتا ہے۔ اور اپنے کلام سے جو اس کی شخصیت کی انتہائی گہرائیوں کا اظہار ہے۔ اپنی شخصیت کا پرتو ناظرین کے دل و دماغ پر ڈالتا ہے۔ اور ایک نہایت لطیف طریقے سے ناظرین کی تخیلی زندگی بھی اسی رنگ میں رنگی جاتی ہے۔ جو شاعر کے تخیل میں نمایاں ہوتا ہے۔ ان کا تخیل شاعر کی دنیائے تخیل سے بہرہ مند ہوتا ہے۔ اور جس طرح یونانی ٹریجیڈی میں ہیرو کے کارہائے نمایاں دیکھنے اور دنیائے تخیل میں اسی کی طرح محسوس کرنے سے[1] ہم بھی ایک لطیف طریقے سے ہیرو کی

---

[1] یہ ایک لطیف نفسیاتی حقیقت ہے جسے علم نفسیات کے ماہر آج ہم پر ظاہر کر رہے ہیں۔ لیکن شعرا اور صوفیائے کرام کے کلام میں بھی اس کی طرف کئی اشارے ہیں۔ مثلاً مولینا جامی کہتے ہیں ؎

گر در دل تو گل گزرد گل باشی ۔۔۔ ور بلبل بیقرار بلبل باشی

تو جزوی و حق کل است گر روزی چند ۔۔۔ اندیشۂ کل پیشہ کنی کل باشی

خصوصیات سے بہرہ ور ہوتے ہیں۔ اسی طرح ایک شاعر کے مطالعہ سے اس کی شخصیت اور اس کے تخیل کا رنگ ہم پر چڑھ جاتا ہے۔ اور اگر یہ مطالعہ مستقل اور گہرا ہو۔ تو یہ اثر بھی دیرپا ہوتا ہے۔ بالکل اسی طریقے سے کلام غالب کے مطالعہ سے ہم پر غالب کی عظیم شخصیت کا پرتو پڑتا ہے۔ اور اگرچہ یہ اثر اس طرح واضح اور نمایاں نہیں۔ جس طرح دلائل و براہین سے عقائد کا بدلنا۔ لیکن جیسا کہ ہم بتا چکے ہیں۔ تخیل کی یہ تربیت عقائد کی شعوری تبدیلیوں سے کہیں زیادہ اہم ہے۔ اور شاعری کی یہی نیم پیغمبرانہ خصوصیت ہے۔ جس کی طرف غالب نے خود اشارہ کیا ہے ؎

اگرچہ شاعرانِ نغز گفتار ۔۔۔ زیک جام اند در بزم سخن مست
ولے با بادۂ بعضے حریفاں ۔۔۔ خمارِ چشمِ ساقی نیز پیوست
مشو منکر کہ در اشعارِ ایں قوم ۔۔۔ ورائے شاعری چیزے دگر ہست

فلسفۂ غم

ہم لکھ چکے ہیں کہ غالب کو فلسفی ثابت کرنے کے متعلق آج تک جو کوششیں ہوئی ہیں وہ اکثر ناکام رہی ہیں۔ ان کے علاوہ غالب کی افتادِ طبع اور اس کی شخصیت کے متعلق بھی کئی مضامین شایع ہوئے ہیں۔ اور چونکہ علامہ اقبال کے کلام کی وجہ سے اس وقت رجائی اور قنوطی فلسفوں کا اختلاف ملک کے سامنے بہت نمایاں ہے اس لئے غالب کے متعلق بھی چند مضامین اس موضوع پر شایع ہوئے ہیں۔ مولانا نیاز فتح پوری نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ غالب نے کوئی فلسفہ پیش کیا۔ تو وہ فلسفۂ تفاول و مسرت تھا۔ لیکن جمہور بالعموم اس امر پر متفق ہیں کہ غالب کے اشعار میں غم و حزن کی جھلک مسرت و اطمینان سے زیادہ نمایاں ہے۔ یہ صحیح ہے۔ کہ کلام غالب میں کئی جگہ تو غم کا بیان بیشتر خیال آرائی اور زورِ طبع یا تخیل کی شوخی دکھانے کا ذریعہ ہے۔ مثلاً ؎

غالب دگر مپرس کہ بما چہ میرود ۔۔۔ ہفت آسماں بگردش و ما درمیان او

جس کی بہار یہ ہو پھر اس کی خزاں نہ پوچھ ۔۔۔ ہے سبزہ زار ہر در و دیوارِ غمکدہ

دانم کہ دو خفتند زمیں را بہ آسماں ۔۔۔ آں گونہ دادہ اند مرا درمیاں فشار

جسے نصیب ہو روزِ سیاہ میرا سا — وہ شخص دن نہ کہے رات کو تو کیونکر ہو

لیکن غالب کا تمام کلام پڑھنے کے بعد دل پہ جو اثر باقی رہتا ہے۔ وہ کسی قدر مایوسی اور افسردگی ہی کا ہے۔ انہوں نے خود ایک شعر میں کہا ہے ؎

ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے — بہت نکلے مرے ارمان لیکن پھر بھی کم نکلے

حقیقت یہ ہے۔ کہ مرزا اُن بے اندازہ خواہشوں اور ارمانوں سے بھرا ہوا دل لئے ہوئے تھے جن کا پورا ہونا بہت مشکل تھا ؎

نامرادم دارد ایں افسردنِ خواہش بہ دہر
آب بر من بستہ اند آرے ز استسقائے من

اس کے علاوہ کئی طبیعتیں ایسی ہوتی ہیں۔ کہ جب ان کی خواہشات پوری نہیں ہوتیں۔ اور ان کی مایوسی اور بے اطمینانی کا علاج کامیابی اور کامرانی سے نہیں ہوتا تو وہ اپنی خواہشوں کو اور بڑھا کر عارضی تسکین کا سامان کر لیتے ہیں۔ جس طرح شراب پینے والے خمار اور اعضا شکنی کو دُور کرنے کے لئے اور شراب پی لیتے ہیں۔ بقولِ غالب

ع ہر چہ از سرمایہ کاست در ہوس افزودہ ایم

ع نشاطِ خاطرِ مفلس ز کیمیا طلبی است

لیکن جب خواہشیں اور امیدیں اس قدر بڑھ جائیں۔ تو بے اطمینانی بھی لازمی ہے۔ اور خواہشیں اور آرزوئیں جس قدر زیادہ ہونگی۔ مایوسی کے مواقع بھی اسی کثرت سے ہونگے ؎

ہر گُونہ حسرتے کہ ز ایام می کشیم
دُردِ تہِ پیالۂ امید بُودہ است

یہی وجہ ہے کہ مرزا کے کئی اشعار میں مایوسی اور افسردگی کا رنگ غالب ہے۔ اس کے علاوہ یہ بھی درست ہے کہ اگرچہ مرزا کی زندگی کسی لحاظ سے ناکام نہیں رہی۔ لیکن ان کی قسمت میں مصائب

کا حصہ بھی بہت تھا۔ وہ صرف دو برس کے تھے۔ کہ باپ نے وفات پائی۔ پانچ برس کے ہوئے تو چچا بھی مر گئے۔ اس کے بعد وہ بے شک عیش و عشرت میں پلے۔ لیکن اس چند روزہ عیش و عشرت کا خمیازہ بہت بھگتنا پڑا۔ قرضخواہوں کے پنجے سے انہیں عمر بھر نجات نہ ملی۔ زندگی کے بہترین سال دیوانی مقدمے کی تگ و دو میں گزر گئے۔ جس کا نتیجہ ناکامی اور رسوائی کے سوا کچھ نہ ہوا۔ تیس برس کی عمر میں بھائی کی دیوانگی کا صدمہ برداشت کرنا پڑا۔ جب ذرا سنبھلنے کی فرصت ملتی۔ تو کوئی اور چرکا لگ جاتا۔ پچاس سال کی عمر میں قمار بازی کے جرم میں جیل جانا پڑا۔ بادشاہ کے استاد ہوئے تو دو ہی سال میں ؏

آں قدح بشکست و آں ساقی نماند

جب مرزا کو ان نامساعد حالات سے سابقہ پڑا تو کوئی تعجب کی بات نہیں کہ ان کے اشعار میں غم کا عنصر غالب ہے لیکن غم کی بھی کئی قسمیں ہیں۔ اور ان میں بہت فرق ہے۔ ایک غم حالی کا ہے۔ جس سے بیتاب ہو کر وہ اپنے گرد و نواح کی دنیا ہی بدل دیتا ہے۔ دوسرا غم میر تقی میر کا غم ہے۔ جو اپنی ذاتی بے چینی اور باطنی کشمکش کا اظہار ہے۔ اور جس میں حساس اور رقیق القلب انسان کو غم سے اس قدر محبت ہو جاتی ہے۔ کہ اسے دور کرنے کی کوشش کی جائے۔ تو وہ اور بے چین ہوتا ہے۔ غالب کا غم نہ تو حالی کا غم ہے۔ جس پر دنیا کی سب خوشیاں نثار ہونی چاہئیں۔ اور نہ میر تقی میر ہی کا غم جو اگر مستقل طور پر رہے تو ایک طرح کی دماغی بیماری ہے۔ غالب کا غم اس صحت مند آدمی کا حزن و ملال ہے۔ جسے دنیا کی اچھی چیزوں سے محبت ہے۔ لیکن جب وہ مسلسل سعی کے باوجود انہیں حاصل نہیں کر سکتا۔ تو غمگین ہو جاتا ہے۔ غالب کے اشعار میں حزن و افسردگی کی جھلک ہے۔ لیکن غالب کی افسردگی عام قنوطیوں کی طرح دنیا کی مذمت کے باعث نہیں۔ بلکہ دنیا کی دلفریب چیزوں سے لگاؤ کی وجہ سے ہے۔ غالب کی انتہائی مایوسی میں بھی ترک دنیا۔ رہبانیت یا مردم بیزاری کا شائبہ تک نہیں۔ بلکہ یہ حزن و افسردگی اس آدمی کی ہے۔ جو زندگی کی قدر و قیمت پہچانتا ہے۔ اور جسے اس سے جدا ہونا یا اسے نہ پا سکنا ناگوار ہے۔ وہ خود ایک فارسی قصیدے میں کہتے ہیں ؎

شاہا گر نہ درد نہ نالم بدیں نمط — اندوہ چگونہ از دلِ مضطر بر آورم

نے پائے آنکہ از سرِ راحت تواں گذشت　　نے جائے آنکہ خار نہ بستر بہ آورم

اس کے علاوہ ہمیں مرزا کی مردانگی کی داد دینی چاہئیے۔ کہ اگرچہ اشعار میں جو اُن کے جذبات کا آئینہ ہیں۔ مایوسی اور بے اطمینانی صاف ٹپک پڑتی ہے۔ لیکن عملی زندگی میں انہوں نے غم کے آگے ہتھیار نہیں ڈالے اور میر تقی میرؔ کی طرح پژمردگی اور غم کو خوش طبعی اور زندہ دلی پہ غالب نہیں آنے دیا ؎

بیرم مگر بہ طبعِ جواناں گماں بیم
خوں خوردنم نہفتہ و مے خوردن آشکار

انسان جب کسی چیز کی خواہش کرتا ہے۔ اور اسے نہیں پاتا۔ تو اس کی مایوسی قدرتی امر ہے۔ خواہ یہ ناکامی خواہشات کی فراوانی سے ہو یا نامساعد اتفاقات سے۔ لیکن زندگی میں مسلسل اضطرار اور بے چینی بجھ نہیں سکتی۔ عام طور پہ مایوس اور ناکام لوگ اپنی ناکامیوں کو قضا و قدر کے سر پہ ڈالکر سمجھ لیتے ہیں کہ یہ مقدر کا قصور ہے۔ مرزا کی غمزدہ طبیعت نے بھی ایک طرح کا سکون اور توازن حاصل کر لیا تھا لیکن یہ سہی طور پہ قسمت کو ملزم قرار دے کر نہیں۔ بلکہ اس نگاہِ ژرف بیں کی مدد سے جو اپنی ناکامیوں سے آگاہ تھی۔ تو دوسروں کی ناکامیاں اور مایوسیاں بھی اُس سے پنہاں نہ تھیں۔ زمانے کے ترکش میں ہزاروں تیر ہیں۔ ایک سے ایک زہریلا اور ان سے کوئی محفوظ نہیں۔ انسان جب یہ دیکھتا ہے۔ تو طبیعت میں ایک طرح کا سکون آجاتا ہے۔ غالب کے کئی اشعار میں اس خیال کا اظہار ہے ؎

بے صرفہ ہی گزرتی ہے ہو گرچہ عمرِ خضر　　حضرت بھی کل کہینگے کہ ہم کیا کیا کئے

لے۔ مرزا خود کہتے ہیں ؎

آسودہ دلاں چوں شنوند آہ و فغاں نم　　دانند کہ من مردنیم رنج و الم را
غافل کہ ہم از ہولِ نگونساری بخت است　　فریاد گر از لب جہدار ہاب ہمسم را
غم خست درون من و خونابہ آں زخم　　بہ چشم روا داشت بروں دادن نم را
در زمرہ فرد خفتہ گدا یا نہ خورنیست　　پیش آمدہ روز سیہی حرف درقم را

ہوئی جن سے توقع خستگی کی داد پانے کی — وہ ہم سے بھی زیادہ خستۂ تیغِ ستم نکلے

ملتا ہے فوتِ فرصتِ ہستی کا غم کہیں — عمرِ عزیز صرفِ عبادت ہی کیوں نہ ہو

علاوہ ازیں مرزا نے زندگی کے انقلاب دیکھے تھے وہ جانتے تھے۔ کہ اگر خوشی محدود اور قلیل وقت کے لئے ہے۔ تو غم بھی غیر محدود یا غیر فانی نہیں ؎

شادی و غم ہمہ سرگشتہ نہ از یکدگر اند — روزِ روشن بہ وداعِ شبِ تار آمد و رفت

اور ؎ ریزد آں برگ، ایں گل افشاند — ہم خزاں ہم بہار در گذر است

اس کے علاوہ انسانی فطرت ہی کچھ اس طرح پابند اور مجبور واقع ہوئی ہے کہ غم کی باگ بہت ڈھیلی نہیں چھوڑی جا سکتی ؎

تاب لائے ہی بنے گی غالب
واقعہ سخت ہے اور جان عزیز

جب ان کے عزیز شاگرد ہر گوپال تفتہ ترکِ دنیا پر آمادہ ہوئے تو مرزا نے ایک خط لکھا جس میں انسانی فطرت کی ان مجبوریوں کا ذکر کر کے اُن کو نہایت صائب مشورہ دیا ہے۔ لکھتے ہیں "کیوں ترکِ لباس کرتے ہو پہننے کو تمہارے پاس کیا ہے۔ جس کو اتار کر پھینکو گے۔ ترکِ لباس سے قیدِ ہستی مٹ نہ جائیگی۔ بغیر کھائے پیئے گذارا نہ ہوگا سختی و سستی و رنج و آرام کو ہموار کرو۔ جس طرح ہو اُسی صورت بہر صورت گذرنے دو۔"

ایک اور خط میں انہوں نے خود اس عملی رواقیت (STOICISM) کی مثال قائم کی ہے۔ مرزا تفتہ کو لکھتے ہیں "مجھ کو دیکھو کہ نہ آزاد ہوں نہ مقید۔ نہ رنجور ہوں نہ تندرست۔ نہ خوش ہوں نا خوش۔ نہ مردہ ہوں نہ زندہ۔ جئے جاتا ہوں باتیں کئے جاتا ہوں۔ روٹی روز کھاتا ہوں شراب گاہ گاہ پئے جاتا ہوں جب موت آئیگی۔ مر رہوں گا۔ نہ شکر ہے نہ شکایت۔ جو تقریر ہے بہ سبیل حکایت۔"

جیسا کہ ہم نے سطورِ بالا میں بتایا ہے۔ ایک شاعر کے کلام میں اس کا فلسفہ اسی طرح ساری و پریشاں ہوتا ہے جس طرح ایک پھول کے نواح میں اس کی خوشبو۔ اس کی تعیین بہت مشکل ہے لیکن بحیثیتِ مجموعی زندگی کے متعلق مرزا کے نقطۂ نظر کا بہترین اظہار مندرجہ ذیل فارسی اشعار میں ہے جنہیں ہم نے "زندگی" کے عنوان سے تیسرے حصے میں درج کیا ہے ؎

تو نالی از خلۂ خار و تنگی کہ سپہر　　سر حسینؑ علیؓ بر سناں نگہ دارد

بر دلشادی و اندوہ دل منہ کہ قضا　　چو قرعہ بر نمطِ امتحاں نگہ دارد

یزید را بہ لباسِ خلیفہ بنشاند

کلیم را بہ لباسِ شباں نگہ دارد

مذہب

ایک اور دلچسپ مسئلہ غالب کا مذہب ہے۔ اور ان کی تصانیف سے پتہ چلتا ہے کہ انہیں مذہب سے دلچسپی عوام سے زیادہ رہی ہے۔ مہر نیمروز جس میں ابتدائے آفرینش وغیرہ کے متعلق ہنود و عقائد کا خلاصہ درج ہے۔ اور بعض اشعار (مثلاً "تحفہ دنیا") سے ہنود و مذہب کے عقائد کے متعلق مرزا کی غیر معمولی واقفیت ظاہر ہوتی ہے۔ "دبستان مذہب" اکثر ان کے زیرِ مطالعہ رہتی تھی۔ اور پارسیوں کی مذہبی کتب مثلاً دساتیر سے اُن کی ذاتی واقفیت تھی۔ ممکن ہے۔ کہ مذاہبِ عالم سے یہ دلچسپی ہر فرد کی تعلیم کا اثر ہو۔ لیکن اس میں کوئی شبہ نہیں کہ یہ دلچسپی ضرور تھی اور مرزا کے کئی نہایت پاکیزہ اشعار جو اس مسئلے کے متعلق ہیں۔ رسمی قافیہ پیمائی سے زیادہ قلبی کاوش کا پتہ دیتے ہیں ؎

دیر و حرم آئینۂ تکرارِ تمنا　　واماندگیٔ شوق تراشے ہے پناہیں

با من میاویز اے پدر فرزندِ آذر را نگر　　ہر کس کہ شد صاحب نظر دینِ بزرگاں خوش نکرد

دلم در کعبہ از تنگی گرفت آوارہ خواہم　　کہ با من وسعتِ بتخانہ ہائے ہند و چیں گوید

آوارۂ غربت نتواں دید صنم را باشد کہ دگر بتکدہ سازند حرم را

اس کے علاوہ چند دیگر عقائد سے قطع نظر عام مذہب کے متعلق مرزا کا نقطۂ نظر بہت دلچسپ ہے۔ مشرقی شعرا بالعموم مذہب کے معاملے میں آزاد خیال رہے ہیں۔ اور دارالافتا کی تنگ نظری اور سختی کی تلافی حافظ۔ عمر خیام۔ خسرو اور فیضی کی روشن خیالی اور وسیع مشربی سے ہوتی رہی ہے۔ جیسا کہ مندرجہ بالا اشعار سے ظاہر ہے۔ مرزا بھی مذہب کے معاملے میں بیحد آزاد خیال تھے۔ لیکن انتہائی آزاد خیالی کے باوجود اُن میں ابونواس اور سرمد کی بے قاعدگی نہ تھی۔ وہ انسان کی ذہنی اور روحانی نشوونما پر کسی طرح کی پابندیاں عائد کرنا پسند نہ کرتے تھے۔ ہاں وہ اس لطیف نکتے سے بھی بیخبر نہ تھے۔ کہ یہ نشوونما بہترین طور پر اسی صورت میں ہو سکتی ہے کہ یہ کسی نظام اور آئین کے ماتحت ہو۔ مثلاً عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے۔ کہ شریعت اور طریقت کے راستے جدا جدا ہیں۔ لیکن مرزا جانتے تھے۔ کہ حقیقتاً ان دونوں میں کوئی اصولی اختلاف نہیں۔ طریقت کا تعلق بالعموم انسان کے تزکیۂ نفس اور اس کی ذاتی روحانی تربیت سے ہوتا ہے اور شرع اُس کے افعال کو اجتماعی یعنی سوسائٹی کے نقطۂ نظر سے دیکھتی ہے۔ اور انسان کی پوری نشوونما کے لئے شخص اور اجتماعی دونوں پہلو بہت اہم ہیں۔ چنانچہ مرزا خود طریقت سے قریب تر ہونے کے باوجود شریعت کی اہمیت سے بھی غافل نہ تھے۔ ایک قصیدے میں رسولِ اکرمؐ کی تعریف میں لکھا ہے۔ ع

خرد بسایۂ شرعت زفتنہ زنہاری

وہ طبعاً ہمسفر اور رہنما سے آزاد ہو کر آزادانہ تلاشِ حق کے قائل تھے۔ لیکن جانتے تھے۔ کہ "راہ و رسمِ منزلہا" سے واقفیت نہ صرف مفید بلکہ ضروری ہے ؎

عناں گسیختہ بیراہہ تاختن تا چند
بشرع پیچم دگر دم بپویہ ہنجاری

ایک اور پُر معنی شعر ہے ؎

بہ رہنِ ضبط ہے آئینہ بندئ گوہر
وگرنہ بحر میں ہر قطرہ چشمِ پُرنم ہے

"شرع" اور "حق" کے تعلق کو انہوں نے ایک اور فارسی شعر میں نہایت لطیف پیرائے میں نظم کیا ہے ؎

بشرع آویز وحق ہجو زمجنوں کم نہ بارے
کہ دل با محمل است اما زباں باساربان دارد

اسی طرح صوفیہ کرام میں ایک مصرع مشہور ہے ع

با خدا دیوانہ دبا مصطفےٰ ہشیار باشں

یعنی خالق اور مخلوق کا تعلق تو انسان کے اپنے متعلق ہے۔ لیکن نبی کریمؐ ایک جماعت کے سردار ہیں اس لئے ان کا ذکر کرتے ہوئے اس جماعت کے اصول وآئین ملحوظ رہنے چاہئیں۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں۔ کہ مرزا نے اس اصول سے سر مو تجاوز نہیں کیا۔ خدا کا ذکر انہوں نے اپنی نظموں میں جس آزادی اور بے باکی سے کیا ہے۔ اس کی مثال ہندوستانی شاعری میں کہیں نہیں ملتی۔ لیکن پیغمبر صلعم کا ذکر کرتے ہوئے انہوں نے ادب کا دامن کبھی ہاتھ سے نہیں چھوڑا[1]۔ اور اگرچہ خدا کے متعلق ان کے کئی اشعار ایسے ہیں۔ جنہیں دار الافتا میں کفر کے کلمات سمجھا جائیگا۔ لیکن جہاں کہیں انہوں نے رسول اکرمؐ کا ذکر کیا ہے اس میں پورا ادب واحترام ملحوظ رکھا ہے +

مرزا کی اس "پابند آزادی" یعنی آزاد خیالی اور حفظِ مراتب کی ایک دلچسپ مثال مختلف مذاہب کے لوگوں سے ان کے تعلقات ہیں۔ یادگارِ غالب اور مرزا کے اپنے کلام سے ان کے ہندو اور عیسائی دوستوں سے جو مخلصانہ تعلقات معلوم ہوتے ہیں۔ وہ تو اس قابل ہیں کہ روشن خیالی کے اس زمانے میں ہم انہیں چراغِ راہ بنائیں۔ لیکن ان کے باوجود مرزا "ضبط وآداب رسوم" سے کبھی غافل نہیں ہوئے اور جماعت بندی کا بھی خیال رکھتے تھے۔ چنانچہ وہ مرزا تفتہ کو ایک خط میں لکھتے ہیں "بندہ

[1] اسکی ایک دلچسپ مثال اُن کا وہ دیباچہ ہے۔ جو انہوں نے سراج المعرفت کے شروع میں بہادر شاہ کے حکم سے لکھا۔ اور جس میں انہوں نے صوفیوں کے غیر شرعی مقولہ "الولایت افضل من النبوت" کی اس طرح تاویل کی ہے۔ کہ اس سے کسی بے ادبی کا اظہار نہیں ہوتا +

پیرو رہیں تو بنی آدم کو مسلمان ہو یا ہندو یا نصرانی عزیز رکھتا ہوں اور اپنا بھائی گنتا ہوں۔ دوسرا مانے یا نہ مانے۔ باقی رہی وہ عزیزداری جس کو اہلِ دنیا قرابت کہتے ہیں۔ اُس کو قوم اور ذات اور مذہب اور طریق شرط ہے۔ اور اُس کے مراتب و مدارج ہیں۔"

مرزا شرع کی قدر و اہمیت سمجھتے تھے۔ لیکن مذاہب کے جزوی اختلاف اور فقہ کی پیچیدگیوں اور بلاضرورت پابندیوں سے انہیں کوئی دلچسپی نہ تھی۔ آجکل لوگ قانون کی موشگافیوں سے خوب واقف ہیں۔ لیکن فقہ کی باریکیاں کچھ اس سے بڑھ کر ہوتی ہیں۔ قرونِ وسطیٰ میں عیسائی مفکروں کے نزدیک فرشتوں کا حجم ایک اہم مسئلہ تھا۔ اور ان کے درمیان اکثر اس سوال پہ بحثیں ہوتی تھیں کہ ایک "تلوار کی نوک پہ بیک وقت کتنے فرشتے کھڑے ہو سکتے ہیں۔ لیکن مرزا کی سلیم الطبعی کو یہ خیالی قلابازیاں پسند نہ تھیں۔ اور انہوں نے اپنے خطوط میں مروجہ تعلیم فقہ اور "مسائل ابوحنیفہ" کے خلاف بہت جلے کٹے فقرے لکھے ہیں۔ اُن کے خیال میں انسان کو چاہئے کہ مذہب کی اصولی باتوں کو سمجھ لے اور ان پہ ایمان رکھے۔ فقہ اور مذہب کی جزوی باتوں میں وقت ضائع کرنا بیفائدہ ہے یہ وقت دل و دماغ کی تربیت میں صرف ہونا چاہئے۔ میر مہدی کے نام ایک خط لکھا ہے۔ جس میں میر سرفراز حسین کو تلقین کرتے ہیں "میاں کس قصے میں پھنسا ہے۔ فقہ پڑھ کر کیا کرے گا۔ طب و نجوم و ہیئت و منطق و فلسفہ پڑھ۔ جو آدمی بنا چاہے۔ خدا کے بعد نبی اور نبی کے بعد امام یہی ہے مذہب حق و السلام والاکرام۔ علی علی کیے کر اور فارغ البال رہا کر۔"

انہوں نے ایک دو مذہبی بحثوں میں حصہ لیا لیکن ان میں بھی جزوی اختلافات اور فقہی موشگافیوں کو ناپسند کیا۔ چنانچہ خدا کے علاوہ کسی اور کو مخاطب کرنے کے متعلق مقلدوں اور غیر مقلدوں میں جو مشہور اختلاف ہے۔ مرزا اس کو بھی غیر ضروری اور جزوی سمجھتے تھے ؎

ابلہاں را زانکہ دانش نارسا است
گفتگو ہا بہ سرِ حرفِ ندا است

عقیدتاً مرزا اثنا عشری شیعہ تھے۔ اور جب شاعرانہ رنگ میں حضرت علیؓ سے اپنی عقیدت کا اظہار کرتے تو بہت کچھ کہہ جاتے۔ اس کے علاوہ وہ "وحدانیت خدا اور نبوت خاتم الانبیا" کے "بدل معتقد اور بزبان معترف تھے"۔ لیکن ان کے کلام سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلامی عقائد کی قبا ان کے بدن پہ پوری طرح پھبتی نہ تھی سے

رموزِ دیں نشناسم درست و معذورم
نہادِ من عجمی و طریقِ من عربی است

تمام مغلوں میں ایک طرح کا "پیگن ازم" پایا جاتا ہے۔ وہ بیشتر "عیشِ امروز" کے قائل ہوتے ہیں۔ اور "فکرِ فردا" انہیں اس طرح مضطرب نہیں رکھتا جس طرح سامی نسل کے لوگوں کو۔ مرزا بھی اس کلیہ سے مستثنےٰ نہ تھے۔ اور "عیشِ امروز" کے وہ بھی اسی طرح قائل تھے۔ جس طرح بابر یا جہانگیر اور جس طرح مغلیہ سلطنت کے بانی نے کہا تھا۔ ع

بابر بعیش کوش کہ عالم دوبارہ نیست

اسی طرح مرزا کے کئی اشعار سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ وہ روزِ جزا یا جسمانی عذاب و اجر کے قائل نہ تھے۔ مثنوی ہو یا غزل، قصیدہ ہو یا رباعی جہاں کہیں انہوں نے بہشت کا ذکر کیا ہے ہمیشہ شوخی بلکہ تمسخر ہی سے کیا ہے۔ اور معلوم ہوتا ہے۔ کہ جس طرح دورِ عباسیہ کے کئی حکما یا سر سید احمد خاں نعیم جسمانی کے قائل نہ تھے۔ اسی طرح مرزا کی رائے بھی اس معاملے میں عام مسلمانوں سے مختلف تھی۔

حُبِّ وطن

حال ہی میں مرزا کے چند مداحوں نے اُن کے بعض اشعار سے ثابت کرنا چاہا ہے کہ ان میں حُبِّ وطن کا مادہ بدرجۂ اتم موجود تھا۔ حقیقتاً یہ خیال نہ صرف مرزا کے حالاتِ زندگی اور اُن کے فارسی کلام سے ناواقفیت کی وجہ سے پیدا ہوا۔ بلکہ مرزا کی افتادِ طبیعت کے غلط اندازے پر مبنی ہے۔ مرزا بقولِ خود شہد کی مکھی نہ تھے۔ بلکہ مصری کی مکھی تھے۔ ہم بیان کر چکے ہیں۔ کہ جب غدر سے دو سال پہلے فیصلہ ہوا۔ کہ بہادر شاہ کے بعد

شاہی سلسلہ ختم کر دیا جائے اور اس کے جانشین کا خطاب شاہزادہ ہو۔ تو مرزا کو شاہی سلسلے کے ختم ہونے کا کوئی صدمہ نہیں ہوا۔ انہیں اگر کوئی فکر تھا۔ تو اپنے مستقبل کے متعلق اور بہادر شاہی سلسلہ ختم ہونے کے بعد انہوں نے فوراً وکٹوریہ کی خدمت میں درخواستیں گزارنی شروع کر دیں۔ کہ شام و روم کے بادشاہوں کے درباری شاعر ہوتے ہیں۔ مجھے کیوں نہ "کوئین پوئٹ"[1] گنا جائے۔

مرزا معاملہ فہم تھے۔ اور اپنے جذبات کو عقل کے تابع رکھتے تھے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ بہادر شاہ سے اُن کی دلبستگی کبھی اتنی گہری نہیں ہوئی۔ کہ وہ اس کی بربادی سے بے قرار ہو جاتے۔ اور اگر ایسا ہوتا بھی تو مرزا اپنے سوا کس کو اس قدر ہم سمجھتے تھے۔ کہ اس کے لئے آنسو بہاتے؟

مرزا کے خطوط سے پتہ چلتا ہے کہ کئی انگریزوں کے ساتھ ان کے مخلصانہ تعلقات تھے "اسٹرلنگ" کی موت پر انہوں نے جو مرثیہ لکھا ہے۔ اُسے کسی طرح رسمی یا خود غرضانہ نہیں کہا جا سکتا۔ "میجر جان جاکوب" کے ساتھ اُن کے گہرے دوستانہ مراسم تھے۔ اور جب میجر دہلی آتے تو مرزا اُن کے ٹھہرنے کا انتظام کرتے۔ سر جان میکلوڈ۔ میٹکاف اور طامسن نے اُن کے ساتھ بہت شریفانہ برتاؤ کیا۔ نہ صرف کئی انگریزوں سے مرزا کے دوستانہ تعلقات تھے۔ بلکہ وہ انگریزی نظام کو بھی مغلیہ نظام پر ترجیح دیتے تھے۔ چنانچہ جب سر سید احمد خاں نے بہت محنت سے آئین اکبری کی تصحیح کی۔ اور اشاعت کے وقت مرزا کی رائے طلب کی۔ تو انہوں نے ایک مثنوی لکھی۔ جس سے ان کا مافی الضمیر بخوبی ظاہر ہوتا ہے ؎

گر ز آئیں میرود با ما سخن — چشم بکشا اندریں دیرِ کہن
صاحبانِ انگلستان را نگر — شیوہ و اندازِ ایشاں را نگر
تا چہ آئیں ہا پدید آوردہ اند — آنچہ ہرگز کس ندید آوردہ اند

---

[1] مرزا نے سر جان میکلوڈ فنانشل کمشنر پنجاب کے لئے اپنی اردو نظم و نثر کا انتخاب کیا تھا۔ اس کے دیباچے میں لکھتے ہیں "البتہ میں اس کا مستحق ہوں۔ کہ کوئین پوئٹ گنا جاؤں۔ اور اس کے علاقے سے ایک نیا نام اور نئی عزت پاؤں"۔

(ادبی دنیا اگست ۱۹۳۶ء)

زیں ہنرمنداں ہنر بیشی گرفت — سعی بر پیشینیاں پیشی گرفت

حق ایں قوم ست آئیں داشتن — کس نیارد ملک بے آئیں داشتن

داد و دانش را بہم پیوستہ اند — ہند را صد گونہ آئیں بستہ اند

پیش ایں آئیں کہ دارد روزگار
گشتہ آئینِ دگر تقویمِ پار!

جب یہ مثنوی سرسید کے پاس پہنچی تو انہوں نے اسے کتاب کے ساتھ شائع نہ کیا کیونکہ اس میں تقریظ کی بجائے آئینِ اکبری پر تنقید کی ہوئی تھی۔ اس مثنوی سے بھی پتہ چلتا ہے کہ وہ "دع ماکدر خذ ماصفا" کے اصول پر پوری طرح عامل تھے۔ اور ملکی یا نسلی تعلقات کو بہت اہمیت نہ دیتے تھے۔ اس کے علاوہ حبِ وطن کی موجودہ صورت جو حقیقتاً مغرب سے ماخوذ ہے۔ اس قدر نئی ہے کہ مرزا سے اس کی توقع رکھنا عبث ہے۔

غالب کے معاصرین

مرزا نے اپنے اشعار اور خطوط میں جا بجا اپنی محرومیِ قسمت اور معاصرین کی قدرناشناسی کی شکایت کی ہے۔ اس سے اور یادگارِ غالب کے بعض اندراجات سے یہ خیال عام ہو گیا ہے۔ کہ اپنی زندگی میں مرزا کی قدر بقدرِ استحقاق نہیں ہوئی۔ حقیقتاً یہ خیال جس قدر عام ہے۔ اسی قدر غلط ہے۔ اور مرزا کے زمانے کے حالات اور اس زمانے کے تذکرات میں جتنی تحقیق کی جائے۔ اس سے یہی نتیجہ نکلتا ہے کہ مرزا کی قدر شناسی میں زمانے نے کوئی کوتاہی نہیں کی۔ اور اگر مرزا اس سے مطمئن نہ تھے۔ تو اس کی وجہ یہی تھی۔ کہ وہ اپنی تمام تصنیفات کے متعلق جو اچھی رائے رکھتے تھے۔ اس سے پورا پورا اتفاق کرنا صحیح ادبی مذاق کو ناگوار تھا۔ یہ درست ہے کہ شاعری میں جب کوئی نئے راستے نکالتا ہے تو اس کی قدر آہستہ آہستہ ہوتی ہے۔ لیکن مرزا نے فنِ شعر میں کوئی نیا راستہ نہیں نکالا۔ فقط پرانی روش میں اپنے طبعی جوہر سے کامیابی حاصل کی۔ اور اپنے کمالِ شاعری سے غزل کو انتہائی عروج پر پہنچا دیا۔ اور اگرچہ آجکل تعلیم اور چھاپے خانوں کی توسیع سے کلامِ غالب کے پڑھنے والوں

کی تعداد بڑھ گئی ہے۔ لیکن اس کے باوجود غزل کی خوبیوں کے سمجھنے کی صلاحیت اس نسل میں جس کی ذہنی تربیت نئے اصولوں پر ہو رہی ہے۔ غالب کے معاصرین سے کچھ زیادہ نہیں۔ اور حقیقت یہ ہے کہ جب ہم تمام حالات کا بالتفصیل مطالعہ کرتے ہیں۔ تو پتہ چلتا ہے۔ کہ زمانہ غالب کی نہیں۔ بلکہ معاصرین غالب کی رائے کی تائید کر رہا ہے۔ مرزا کو اپنے فارسی قصائد اور فارسی نثر پہ بے انتہا ناز تھا۔ اور فارسی غزلگوئی میں بھی وہ خواجہ حافظ کو خاطر میں نہ لاتے تھے۔ ہم مرزا کے فارسی کلام کی اہمیت کو سمجھتے ہیں۔ لیکن مرزا خود اُسے جس قدر بلند پایہ سمجھتے تھے۔ اُس سے لفظ بہ لفظ متفق ہونا ممکن نہیں۔ اور اس کے متعلق مرزا کے معاصرین (مثلاً نواب مصطفےٰ خاں شیفتہ۔ مولینا صدرالدین آزردہ۔ بیخبر۔ نیر وغیرہ) کی جو رائے تھی۔ وہی درُست معلوم ہوتی ہے۔ مرزا کے فارسی کلام کو تو موجودہ زمانے میں بھی کوئی خاص فروغ حاصل نہیں ہُوا۔ اُن کی شاعری کو جو بلند مرتبہ حاصل ہے۔ وہ اُن کے منتخب دیوان ریختہ کی وجہ سے ہے۔ عوام الناس مرزا کا یہ مصرع ؏

شہرتِ شعرم بگیتی بعدِ من خواہد شدن

پڑھتے ہیں اور سر دُھنتے ہیں کہ مرزا کا وہی کلام آج الہامی سمجھا جاتا ہے۔ جس کے متعلق ان کے معاصرین کہتے تھے ؎

اگر اپنا کہا تم آپ ہی سمجھے تو کیا سمجھے | مزہ کہنے کا جب ہے اک کہے اور دوسرا سمجھے
کلام میر سمجھے اور کلامِ میرزا سمجھے | مگر انکا کہا یہ آپ سمجھیں یا خدا سمجھے

یہ قطعہ حکیم آغا جان عیشؔ کا ہے۔ جو انھوں نے اجمیری دروازے کے مشاعرے میں پڑھا تھا۔ حکیم صاحب شعر کا اچھا مذاق رکھتے تھے۔ لیکن شعر فہمی میں ان کا وہ مرتبہ نہ تھا۔ جو اس قطعے سے اختلاف رکھنے والے کئی دوسرے معاصرین کو حاصل تھا لیکن آخر یہ قطعہ اس منتخب دیوان کے متعلق نہیں۔ جس کو سب شعر فہم حرزِ جان بنائے ہوئے ہیں۔ اس میں جن اشعار کے دقیق ہونے کی شکایت ہے انہیں خود مرزا نے مطبوعہ دیوان میں شایع کرنے کے قابل نہ سمجھا۔ اور لکھا کہ "منتخب دیوان سے باہر جو میرے اشعار ملیں۔ انہیں میرا نہ سمجھا جائے"۔ اگر مرزا کی اس تحریر کے بعد بھی اس

مسئلے میں اختلاف کی کوئی گنجائش تھی۔ تو اس کا جواب نسخۂ حمیدیہ ہے۔ جس میں خارج شدہ اشعار شایع ہوئے ہیں۔ اور جنہیں دیکھ کر یہ تسلیم کئے بغیر چارہ نہیں۔ کہ مرزا کے معاصرین نے اگر ان اشعار کو الہامی نہ سمجھا۔ تو ان پر کفر کا فتوےٰ عائد نہیں ہوتا۔ بلکہ اردو ادب ان کا ممنون ہے۔ کہ انہوں نے تنقید اور تمسخر سے مرزا کو سرخ و سپید خزف ریزوں کے جمع کرنے سے روکا۔ اور ان کی توجہ اس بحرِ شعر و سخن کی طرف کھینچی۔ جس میں غواصی کا صلہ وہ بے بہا موتی ہیں۔ جو اردو ادب کے لئے مایۂ ناز ہیں +

اس کے علاوہ جن لوگوں نے غالب کے معاصرین کے متعلق فقط مرزا اور حالی کی شکایتیں ہی پڑھی ہیں۔ وہ مرزا کی اُس قدر و منزلت سے ناواقف ہیں۔ جو اُن کے ممتاز معاصرین کے دلوں میں تھی اور جس کا ثبوت تمام معاصرانہ تذکروں میں ملتا ہے۔ انہیں اس وقت سے شعرا کے تذکروں میں جگہ ملنی شروع ہو گئی تھی۔ جب وہ ابھی سولہ سترہ سال کے تھے۔ "گلشنِ بیخار" میں جو اس زمانے کا اہم ترین تذکرہ ہے۔ مرزا کی اس قدر تعریف اور ان کے کلام سے اس قدر طویل انتخاب درج ہے۔ کہ گارسن دتاسی اپنی "تاریخ ادبیات اردو" میں حیرت ظاہر کرتا ہے۔ کہ شیفتہ جس کی نمایاں خصوصیت میانہ روی ہے۔ غالب کا اس قدر مداح ہے۔ سر سید احمد خاں نے آثار الصنادید میں دہلی کے ممتاز لوگوں کے جو حالات درج کئے ہیں۔ ان میں غالب کو دہلی کے باقی شعرا میں سب سے پہلے جگہ دی ہے۔ اور اس میں غالب کی شاعرانہ عظمت کا جس طرح اعتراف کیا ہے اس پر مرزا جتنا بھی فخر کرتے بجا تھا۔ نواب ضیاء الدین نے خود دیوان غالب کا خاتمہ لکھا جو متداول دیوان کے ساتھ تو شایع نہیں ہوا۔ لیکن آثار الصنادید میں چھپ چکا ہے۔ اُن کے دوسرے مداحوں میں سے مولوی فضل حق، خان بہادر منشی غلام غوث بیخبر، مومن، ناسخ اور نساخ آسمانِ علم و ادب کے درخشاں ستارے تھے۔ لوگ مرزا سے ملنے اور ملاقات کرنے دہلی آتے۔ عزیز لکھنوی اور صفیر بلگرامی کی ملاقات کے حالات ہم درج کر چکے ہیں۔ اُن کے علاوہ سید غوث علی شاہ قلندر جن کا مزار پانی پت میں مرجع خاص و عام ہے۔ اور جو مولینا اسمٰعیل میرٹھی کے مرشد تھے۔ مرزا سے ان کے مکان پر ملنے گئے۔ مرزا سے

ان کی ملاقاتوں کا حال ان کے لاجواب تذکرے میں مفصل درج ہے۔ اس کے علاوہ لوگوں نے مرزا کی تصانیف کو ہاتھوں ہاتھ خریدا۔ اُن کا اردو دیوان شایع کرنے کے لئے دو ناشر جس طرح بیتاب تھے اس کی تفصیل ان کے خطوط میں موجود ہے۔ دستنبو ہاتھوں ہاتھ بکی۔ اور تو اور اُن کے رقعات کی بھی بہت مانگ تھی۔ ہندوستان کے اکثر ممتاز رؤسا و اکابر سے ان کے تعلقات تھے۔ اور وہ ان کی امداد بھی کرتے رہتے تھے۔ ایک فارسی خط میں قاضی القضاۃ مولوی ولایت حسین کے تین سو روپے بھیجنے کی رسید ہے۔ اردوئے معلیٰ میں نواب میر غلام بابا خاں رئیس سورت کی طرف سے پہلے ایک گھڑی اور پھر زر امدادی پانے کا شکریہ ادا کیا ہے۔ مہاراجہ الور انہیں تحفے تحائف بھیجتے رہتے تھے۔ نواب مصطفےٰ خاں نے مصیبت میں ہمیشہ ان کی مدد کی۔ بڑودہ سے انہیں نقدی ملتی تھی۔ شاہ لکھنؤ کی طرف سے بھی پہلے قصیدے پہ پانچ ہزار روپیہ انعام کا حکم ہوا اور اگرچہ مرزا کی بدقسمتی سے یہ رقم اُن تک نہ پہنچی لیکن بعد میں پانچسو روپیہ سالیانہ مقرر ہوا۔ اور جب تک سلطنت قایم رہی مرزا کو یہ وظیفہ ملتا رہا۔ مرزا پر دربار رامپور کے جو احسانات تھے وہ سب کو معلوم ہیں۔[1] یہ صحیح ہے کہ دربار دہلی میں ان کی قدر حسب توقع نہیں ہوئی۔ لیکن ہم ان حالات کا ذکر کر چکے ہیں۔ جو مرزا کی ترقی میں حائل تھے۔ مرزا ابھی تیرہ سال کے تھے۔ کہ ذوقؔ ظفر کے اُستاد ہو گئے۔ اس کے بعد کئی واقعات ایسے ہوئے جن کا ملال ظفر کو ضرور رہا ہوگا۔ اور یہ امر بھی توجہ طلب ہے۔ کہ ظفرؔ اردو کا شاعر اور اردو شاعری کا قدردان تھا۔ اور مرزاؔ اس زبان کو جو اس کے دربار میں نشوونما پا رہی تھی۔ کسی قابل نہ سمجھتے تھے۔ ظفر صاف اور موثر اشعار کا دلدادہ تھا۔ مرزا نازک خیالی اور مضمون آفرینی پہ جان دیتے تھے۔ لیکن اس کے باوجود ظفرؔ نے مرزا کے ساتھ کبھی بے انصافی نہیں کی۔ ۱۸۴۷ء میں جب قمار بازی کی وجہ سے مرزا پہ مقدمہ چلایا گیا۔ تو بادشاہ نے مجسٹریٹ کو سفارشی خط لکھا۔ اس کے بعد اگرچہ مرزا اپنا ابتدائی

---

[1] یہ درست ہے۔ کہ نواب یوسف علی خاں کی بہ نسبت نواب کلب علی خاں نے مرزا سے کسی قدر سرد مہری کا سلوک کیا۔ لیکن انہوں نے بھی مرزا کے ماہوار مشاہرے میں کبھی ناغہ نہیں کیا۔

مرزا شاعری ترک کر چکے تھے۔ لیکن ذوق کی زندگی میں انہیں استاد مقرر کرنا بہادر شاہ جیسے وضعدار بادشاہ کے لئے ناممکن تھا۔ اس کے باوجود اس نے انہیں درباری مورخ مقرر کیا۔ نجم الدولہ دبیر الملک نظام جنگ کا خطاب عطا کیا۔ اور چھ سو روپیہ سالیانہ مقرر کیا۔ جب ہم یہ خیال کرتے ہیں کہ ذوق کا ابتدائی مشاہرہ صرف پانچ روپے ماہوار تھا۔ تو غالب کا یہ وظیفہ کسی طرح کم معلوم نہیں ہوتا۔ تحفے تحائف بھی ملتے رہتے۔ یہ صحیح ہے۔ کہ عہد اکبری و شاہ جہانی میں شعرا کی جو قدر ہوتی تھی۔ وہ بہادر شاہ نے نہ کی لیکن وہ کر ہی کیسے سکتے تھے۔ جب زمانہ ہی بدل چکا تھا ؎

زمانہ دگر گونہ آئیں نہاد
شُد آں مُرغ کو بیضہ زریں نہاد

مرزا عبدالرحیم خان خاناں کے متعلق مشہور ہے کہ اس نے ایک شاعر کی اس درخواست پر کہ میں نے ایک لاکھ روپیہ کبھی نہیں دیکھا۔ اس کے سامنے لاکھ روپے کا ڈھیر لگا کر اُسے بخش دیا۔ لیکن بیچارے بہادر شاہ نے شائد خود بھی ایک لاکھ روپیہ کبھی نہ دیکھا تھا۔ وہ اس طرح کی فیاضی کیسے کرتا ؟

سر والٹر ریلے انگریزی کے مشہور شاعر ملٹن کے متعلق لکھتا ہے کہ "ملٹن کا سب سے بڑا مداح ملٹن ہے۔ اور جو کوئی ملٹن کی تعریف لکھے گا۔ اُسے ملٹن کے اپنے خیالات ہی مختلف الفاظ میں ادا کرنے پڑینگے یوں تو شاعرانہ خود ستائی میں ہمارے سب شعرا مغربی شعرا سے بہت آگے ہیں۔ لیکن ریلے نے ملٹن کے متعلق جو کچھ لکھا ہے۔ وہ غالب پر لفظ بلفظ صادق آتا ہے۔ لوگ ڈاکٹر بجنوری کے "مقدس وید اور دیوان غالب" والے فقرے کو دہراتے ہیں۔ اور اُسے خوش اعتقادی اور مبالغے کا انتہائی اظہار سمجھتے ہیں۔ لیکن آخر بجنوری نے غالب ہی کے دو فارسی اشعار لکھ کر شاعرانہ نثر میں فقط ان کی تشریح کر دی تھی ؎

گر شعر و سخن بدہر آئیں بودے
دیوانِ مرا شہرتِ پرویں بودے
غالب اگر ایں فنِ سخن دیں بودے
آں دیں را ایزدی کتاب ایں بودے

مرزا اپنی تعریف میں بھی وہی مبالغہ روا رکھتے تھے۔ جو مدحیہ قصائد میں ممدوح کی تعریف میں کرتے تھے۔ اسے لفظ بلفظ صحیح ماننا مذاق سلیم کو گوارا نہیں۔ اور یہ امر افسوس ناک ہے کہ کلام غالب کی

موجودہ شہرت اور مرزا کے معاصرین کی مزعومہ اور مفروضہ قدرشناسی سے یہ خیال بہت عام ہوگیا ہے کہ ایک شاعر کی صحیح قدردانی اس کے اپنے زمانے یا ملک میں نہیں ہو سکتی۔ اور آج ایسے شعرا پیدا ہو گئے ہیں۔ جو جرمن زبان کا ایک لفظ نہیں جانتے۔ لیکن اپنا اردو کلام جرمن قوم کے نام معنون کرتے ہیں یعنی ہندوستان میں تو شعر فہم کوئی نہیں رہا۔ ان حضرت کے کلام کو اگر کوئی سمجھ سکتا ہے۔ تو وہ جرمن قوم کے افراد ہیں۔ ہم شاعرانہ تعلّی کو (اگر اسے شاعرانہ تعلّی ہی سمجھا جائے) بہت بڑا عیب نہیں گنتے۔ لیکن موجودہ شاعروں اور ان کے حواریوں کی یہ روش کہ ناظرین کو اپنے اشعار کی خوبیوں سے واقف کرنے کی بجائے انہیں مرعوب کرکے اور ان کی قابلیت جتا کر داد لی جائے، کسی طرح قابلِ تحسین نہیں۔ اور ہمیں افسوس ہے کہ اس طرزِ استدلال کے عام ہونے کی ایک وجہ غالبؔ کی موجودہ شہرت اور یہ خیال ہے کہ اپنے زمانے میں اُن کی صحیح قدر نہیں ہوئی؛

حُلیہ ہم نے پہلے حصّے میں غالبؔ سے سفیر بلگرامی اور عزیز لکھنوی کی ملاقات کا حال درج کیا ہے۔ جس سے مرزا کی اخیر عمر کی کمزوری اور ان کی وضع قطع کا حال معلوم ہوگیا ہوگا۔ لیکن مرزا نے اپنے شاگرد مرزا حاتم علی بیگ مہر کے نام ان کی تصویر ملنے پر جو خط لکھا ہے۔ وہ اس بارے میں نہایت جامع ہے۔ اس میں نہ صرف مرزا کے ایام جوانی کی ایک دلآویز تصویر ہے۔ بلکہ ان کی جدّت پسندی اور امتیازی رنگ قائم رکھنے کی خصوصیّت پر بھی روشنی پڑتی ہے۔ ہم اس خط میں سے ایک طویل اقتباس درج ذیل کرتے ہیں؛

"تمہارا حُلیہ دیکھ کر تمہارے کشیدہ قامت ہونے پر مجھ کو رشک نہ آیا۔ کس واسطے کہ میرا قد بھی درازی میں انگشت نما ہے۔ تمہارے گندمی رنگ پر رشک نہ آیا۔ کس واسطے کہ جب میں جیتا تھا تو میرا رنگ چنپئی تھا۔ اور دیدہ ور لوگ اس کی ستائش کیا کرتے تھے۔ اب جو کبھی وہ اپنا رنگ یاد آتا ہے۔ تو چھاتی پر سانپ سا لوٹ جاتا ہے۔ ہاں مجھ کو رشک آیا اور میں نے خون جگر کھایا تو اس کلمہ پر کہ ڈاڑھی خوب گھُٹی، ہوئی وہ مزے یاد آگئے۔ کیا کہوں جی پر کیا گذری بقول شیخ علی حزیں ؎

تا دسترسم بود زدم چاک گریباں
شرمندگی از خرقۂ پشمینہ ندارم

جب ڈاڑھی مونچھ میں بال سفید آ گئے۔ تیسرے دن چیونٹی کے انڈے گالوں پر نظر آنے لگے۔ اس سے بڑھ کر یہ ہوا کہ آگے کے دو دانت ٹوٹ گئے۔ ناچار مسّی بھی چھوڑ دی۔ اور ڈاڑھی بھی۔ مگر یاد رکھیئے اس بھونڈے شہر میں ایک وردی ہے عام۔ مُلّا۔ حافظ۔ بساطی۔ نیچہ بند۔ دھوبی۔ سقا۔ بھٹیارا۔ جولاہا۔ کنجڑا منہ پر ڈاڑھی۔ سر پہ بال۔ فقیر نے جس دن ڈاڑھی رکھی اسی دن سر منڈایا"

اخلاق و عادات

حالی نے یادگارِ غالب میں مرزا کے اخلاق و عادات کی جو تصویر کھینچی ہے۔ اس میں اضافے کی گنجائش بہت کم ہے۔ اور شاعر کی شہرت کی بنیاد شاید دیوانِ غالب سے بھی زیادہ مولینا حالی کے اس شاہکار پر ہے۔ لیکن جیسا کہ حالی نے حیاتِ جاوید کے دیباچے میں لکھا ہے۔ یہ تصویر یک طرفی ہے۔ اس کتاب میں مصنف نے مرزا کے "کلام کی خوبیاں ظاہر کی ہیں۔ اور ان کے پھوڑوں کو کہیں ٹھیس نہیں لگنے دی"۔ مرزا کی ذہنی اور دماغی خوبیوں یعنی ان کی شگفتہ طبعی، ذہانت، آزاد خیالی اور محققانہ نظر سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا۔ لفظی اور ذہنی راستبازی کو بہت اہمیت دیتے تھے۔ اور ان کے فارسی خطوط میں "راستی بالائے طاعت است" کا فقرہ اتنی دفعہ دُہرایا گیا ہے۔ کہ یہ اصول ان کی زندگی کا اہم ترین مسلک معلوم ہوتا ہے۔ علاوہ ازیں جب اُن کی کوئی غلطی انہیں سمجھا دی جاتی۔ تو وہ بلا تامل اس کا اعتراف کر لیتے۔ وہ پہلے درجے کے وضعدار تھے۔ اور گو انہیں صحیح نوابی شان کبھی میسر نہیں ہوئی۔ لیکن جہاں تک ہو سکا۔ انہوں نے جاگیرداروں کی تمام وضعداریاں نبھائیں۔ دوستوں کا بہت خیال رکھتے۔ اور جن لوگوں کو اپنا دوست سمجھتے۔ ان کے مصائب اور بدحالی سے متاثر ہو جاتے۔ حُسنِ اخلاق اور لحاظ و مروّت میں وہ عہدِ مغلیہ کے شرفا کا ایک اچھا نمونہ تھے۔ لیکن وہ آخر انسان تھے۔ فرشتہ نہ تھے۔ اُن کا دل غصے۔ رنج۔ رشک اور اس طرح کے تمام انسانی جذبات سے بہت جلد متاثر ہوتا۔ بعض وقت طیش میں آ کر اپنے مخالفین کے متعلق وہ ایسے سخت فقرے لکھ جاتے کہ تہذیب انہیں دُہرانے کی اجازت نہیں دیتی۔ فارسی لُغت نویسوں کے متعلق انہوں نے جو درشت اور فحش الفاظ استعمال کئے۔ اُن کا ذکر ہم کر چکے ہیں۔ اسی طرح نواب شمس الدین اور ان کے درمیان جائداد کے متعلق جھگڑا تھا۔ قضارا نواب ولیم فریزر کے قتل کے

الزام میں ماخوذ ہوئے۔ اس موقعے پر مرزا نے ناسخ کو خط میں لکھا ہے " از اینہ دستمگر کُش ستم رسیدہ نواز بدعا ہائے صبحدمی میخواہم۔ کہ ایں خیرہ سر بے آزرم زود تر بہ بادِ افراہ گرفتار و از سر فرازی بپایہ دار گردد۔ و دانم کہ ہمتم ظفر یاب و دعایم مستجاب است۔" نواب شمس الدین تختۂ دار پر لٹکا دیئے گئے۔ لیکن مرزا کا غصہ فرد نہیں ہوا۔ وہ ایک اور خط میں لکھتے ہیں۔ " قبلۂ حاجات۔ درنگے کہ در نگارش ضرعت نامہ رُوے داد بہ افسردگی شوق محمول نشود۔ چکنم ہمت بکارے شگرف آویختہ بود۔ و نظر منظرے بلند را دید بانی ہمیکرد۔ تا آنکہ ہنگام سر آمد و ہر کہ دار کیفرے کہ بایست یافت۔ مرزبانِ بیوات مانند کریم خاں سرہنگ خویش بحلق آویختہ شد و بمراترش بہ عدم آباد رفت ؎

" ہر کسے آں درود عاقبت کار کہ کشت "

یہ صحیح ہے کہ نواب نے بھی مرزا کو اذیت پہنچانے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی تھی۔ اور مرزا کو نواب کے جُرم کا یقین بھی ہوگا۔ لیکن پھر بھی ان خطوط میں ذاتی عداوت اور غیظ و غضب کا اظہار درسِ عبرت سے کہیں زیادہ نمایاں ہے۔ اور یہ جذبات ایک ایسے شخص کے نہیں ہونے چاہئیں۔ جس کے تمام ارمان " قلندری و آزادگی و ایثار و کرم " کے ہوں

مولینا حالی یادگارِ غالب میں لکھتے ہیں۔ " غدر کے بعد ان کی آمدنی کچھ اوپر ڈیڑھ سو ماہوار ہوگئی تھی۔ اور کھانے پینے کا خرچ بھی کچھ لمبا چوڑا نہ تھا۔ مگر وہ غریبوں اور محتاجوں کی امداد اپنی بساط سے زیادہ کرتے تھے۔ اس لئے اکثر تنگ رہتے تھے۔" مرزا کے ایک اردو خط اور چند فارسی اشعار میں بھی اس بات کا اظہار ہے۔ لیکن ہمارے خیال میں عام طور پر یہ مان لینا صحیح نہیں کہ مرزا کا سارا قرضہ اُن کی خیرات کی وجہ سے تھا۔ حالی کے علاوہ کسی اور تذکرہ نگار نے ان کی فیاضیوں کا کہیں ذکر نہیں کیا۔ اس کے علاوہ غریبوں اور مسکینوں کے لئے تنگ رہنا تو وہی گوارا کر سکتا ہے۔ جو ان کی خاطر اپنا آرام اور اپنی ضروریات قربان کرے۔ مرزا بالعموم اپنے آرام و آسائش کا بہت خیال رکھتے تھے۔ غدر میں اور اس کے بعد انہوں نے اَور تو اَور اپنے بھائی مرزا یوسف اور اس کے اہل و عیال کی بھی کوئی خاص مدد نہیں کی۔ غدر کی مصیبتیں مرزا یوسف کو تن تنہا جھیلنی پڑیں۔ اور معلوم ہوتا ہے۔ کہ جب وہ مرگیا تو مرزا نمازِ جنازہ میں بھی

شریک نہ تھے۔ اس کی وفات کے بعد مرزا نے اپنی بھتیجی اور بھاوج وغیرہ کے لئے کیا کیا۔ اس کا کہیں ذکر نہیں۔ لیکن ان کے ایک اردو خط سے ظاہر ہوتا ہے۔ کہ کم از کم تین سال تک انہوں نے اپنی بھتیجی کو ایک پائی تک نہیں بھیجی۔ حالانکہ مرزا کا اپنا بسر اوقات زیادہ تر چچا کی پنشن پر تھا۔ مرزا بے شک اپنی مصیبتوں میں گرفتار رہتے۔ لیکن ان کے حالات کا بغور مطالعہ کرنے کے بعد یہی خیال ہوتا ہے۔ کہ ان کی اپنی ضرورتیں اتنی بڑھی ہوئی تھیں۔ کہ وہ کسی کی خاطر اپنے آرام کو قربان نہ کر سکتے تھے اور نہ اپنے آپ کو خطرے میں ڈالتے تھے۔

مرزا کو زندگی کی مہم تن تنہا طے کرنی پڑی تھی۔ اس لئے وہ اپنی اہمیّت سے خوب واقف تھے اس کے علاوہ اُنہوں نے زندگی کا سبق کتابی اصولوں سے نہیں بلکہ زمانے کے طمانچوں سے سیکھا تھا۔ وہ جانتے تھے۔ کہ اخلاق کے معلّمین خود نمائی اور فخر کے خلاف جاہے کچھ کہیں لیکن انسان کو اپنی خوبیوں کی طرف اکثر خود توجہ دلانے کی ضرورت ہوتی ہے اور جیسا کہ ہم بالتفصیل بتا چکے ہیں اُنہوں نے اپنی نظم و نثر کے متعلق انکسار اور کسر نفسی سے کبھی کام نہیں لیا۔ اور غالب کا سب سے بڑا مداح غالب خود ہے۔

ہم نے مندرجہ بالا سطور میں یہ دکھانے کی کوشش کی ہے۔ کہ اگرچہ مرزا بڑی خوبیوں کے حامل تھے تاہم اُن کے احساسات و جذبات عام انسانوں کے سے تھے۔ اور اُن کی مقبولیت کی ایک بڑی وجہ بھی یہی ہے۔ کہ ان کا دل یوگیوں یا دیوتاؤں کا دل نہ تھا۔ بلکہ عام انسانوں کا۔ وہ شاعر تھے۔ عام انسانوں سے زیادہ حسّاس اور اپنے احساسات کے اظہار پر قادر۔ لیکن ان کے جذبات و احساسات وہی تھے۔ جو تمام انسانوں کو بیقرار رکھتے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ ناظرین ان کے دل کی داستان میں اپنی ہی کہانی پڑھتے ہیں۔ مرزا کو خود اپنی اس "بشریّت" پر ناز تھا ؎

خوئے آدم دارم آدم زادہ ام
آشکارا دم ز عصیاں میزنم

اور ہم اس مضمون کو ایک فارسی قطعے پر ختم کرتے ہیں۔ جس میں انہوں نے اپنی افتادِ طبع کو نہایت خوبی سے

نظم کیا ہے۔

اسد اللہ خاں غالب

نہ چنانم کہ بہ عقیدۂ خولیش	از فسونِ کسے ہراس کنم
نتوانم کہ از نصیحت و وعظ	عالمے را خدا شناس کنم
نہ کہ اخبارِ باستانی را	دیو افسانہا قیاس کنم
نہ کہ از آثارِ ہرچہ مشہور ست	اثرِ تازہ اقتباس کنم
نہ کہ از بہرِ حلّہ ہائے بہشت	ترکِ آرائشِ لباس کنم
نہ کہ در عالمِ فراخ روی	عار از ژندۂ پلاس کنم
چوں نہ من ساقیم نہ محتسبم	نہ بہ بزم نہ مے بکاس کنم

نہ بواجب زسعی در مانم
نہ بہر مدعا مکاس کنم

اِنتخاب

هر چند منش کہ یزدانی سروش است در سر آغاز نیز گزیدہ گو و پسندیدہ جو
بود - اما بیشتر از فراخ روی پئے جادہ ناشناساں بر داشتے و کجیٔ رفتار آناں را
لغزش مستانہ انگاشتے - تا ہمرہاں تکاپو پیش خراماں را بہ خستگی سرزنش ہمت عاری
کہ در من یافتند بمہر بجنبید و دل از آزرم بدرود آمد - اندوہ آوارگیہائے من خوردند
و آموزگارانہ در من نگریستند - شیخ علی حزیں بخندۂ زیر لبی بیراہہ رویہائے مرا در نظرم
جلوہ گر ساخت - و زہر نگاہ طالب آملی و برقِ چشم عُرفی شیرازی
مادۂ آں ہرزہ جنبش ہائے ناروا در پائے رہ پیمائے من سوخت ظہوری بسرگرمی
گیرائی نفس حرزے ببازو و توشہ بکمرم بست - نظیری لا اُبالی خرام بہنجار
خاصۂ خودم بچالش آورد - اکنوں بہ یمن فرہ پرورش آموختگی ایں گروہ فرشتہ شکوہ
کلکِ رقاصِ من بخرامش تدرو است و برامش موسیقار - بجلوہ طاؤس است و بپرواز عنقا

غالب

انتخاب

فہرست

کلامِ غالبؔ کی تاریخی تدوین

دیوانِ غالب کی تاریخی تدوین میں سب سے پہلا قدم مفتی انوار الحق نے اٹھایا۔ جنہوں نے نسخۂ حمیدیہ کی اشاعت کے وقت غالبؔ کے وہ اشعار جو پچیس برس کی عمر سے پہلے لکھے گئے تھے۔ بعد کے اشعار سے جُدا کر کے ترتیب دیئے۔ مفتی صاحب نے یہ ترتیب صحیح عالمانہ ذوق سے متاثر ہو کر کی ہے۔ لیکن اس التزام میں اُنہیں بہت پیچیدگیاں پیش نہیں آئیں۔ دیوان کے مرتب کرتے وقت ان کے پیشِ نظر دیوانِ غالبؔ کا ایک ایسا قلمی نسخہ تھا۔ جس پر تاریخ کتابت ۱۲۳۷ھ درج تھی۔ ظاہر ہے کہ جو اشعار اس نسخے میں موجود تھے۔ وہ تاریخ کتابت سے پہلے ہی لکھے گئے تھے۔ اور چونکہ شاعر کی عمر اس وقت پچیس برس کی تھی۔ اس لئے جو اشعار اس نسخے کے متن میں درج تھے۔ وہ اس عُمر تک لکھے جا چکے ہونگے مفتی صاحب نے یہ نسخہ کسی قدر احتیاط سے مرتب کیا[1] لیکن پھر بھی اس میں کئی غلطیاں ہیں۔ اور یہ نہیں کہا جاسکتا۔ کہ مطبوعہ کتاب ہو بہو قلمی نسخے کے مطابق ہے۔ مثلاً نسخۂ حمیدیہ کے صفحہ ۱۵ پر یہ غزل ہے ؎

عشرتِ قطرہ ہے دریا میں فنا ہو جانا
درد کا حد سے گزرنا ہے دوا ہو جانا

مفتی صاحب نے یہ نہیں بتایا کہ یہ غزل قلمی نسخے میں درج ہے۔ لیکن صفحہ (۱) کے بالمقابل انہوں نے قلمی نسخے کا جو صفحہ نمونے کے طور پر دیا ہے۔ اس کے حاشیے پر یہ غزل موجود ہے۔ اسی طرح مندجہ ذیل

---

[1] کتابت کی غلطیاں اس میں بے شمار ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے۔ کہ جہاں تک قلمی نسخے کے بعد کی غزلوں کا تعلق ہے۔ یہ نسخہ نظامی پریس کے شایع کردہ دیوانِ غالبؔ (مطبوعہ ۱۹۱۷ء) کی نقل ہے۔ نظامی پریس والوں نے تو اس ایڈیشن کے آخر میں غلط نامے کا اضافہ کر دیا اور یہ ایڈیشن کو بڑی احتیاط سے مرتب کیا۔ لیکن نسخۂ حمیدیہ نقل کرتے وقت غلط نامہ نظر انداز کر دیا گیا۔ اور غلطیاں ساری نقل کر لی گئیں۔ قلمی نسخے کی غزلیں بھی مطبوعہ ایڈیشن میں اصل کے مطابق نہیں +

غزلیں بھی قلمی نسخے کے حاشیے میں موجود ہیں۔ لیکن مطبوعہ نسخے میں اس کی طرف کوئی اشارہ نہیں ۔

دھمکی میں مرگیا جو نہ بابِ نبرد تھا عشقِ نبرد پیشہ طلبگارِ مرد تھا

محرم نہیں ہے تو ہی نوا ہائے راز کا یاں ورنہ جو حجاب ہے پردہ ہے ساز کا

دوست غمخواری میں میری سعی فرمائینگے کیا؟ زخم کے بھرنے تلک ناخن نہ بڑھ آئینگے کیا؟

پھر ہوا وقت کہ ہو بال کشا موجِ شراب دے بطِ مے کو دل و دستِ شنا موجِ شراب

عشق مجھ کو نہیں وحشت ہی سہی میری وحشت تری شہرت ہی سہی

مفتی انوارالحق کے بعد دیوانِ غالب کی ترتیب کی سب سے پہلی باقاعدہ کوشش ڈاکٹر سید عبداللطیف نے کی۔ لیکن اُن کا مرتبّہ دیوان غالب ابھی تک شائع نہیں ہوا۔ حالانکہ ۱۹۲۸ء میں اس کی اشاعت کے وعدے ہوئے تھے۔ البتہ جن اصولوں پر وہ اُسے مرتّب کرنا چاہتے ہیں۔ اُنکی تشریح انہوں نے اپنی کتاب کے تیسرے باب میں کردی ہے۔ اس کے مطابق انہوں نے غالب کے اردو کلام کو ان چار حصوں میں تقسیم کیا ہے:-

۱۔ دورِ اول ۱۸۱۱ء - ۱۸۲۱ء

۲۔ دورِ ثانی ۱۸۲۲ء - ۱۸۳۲ء

۳۔ دورِ ثالث ۱۸۳۲ء - ۱۸۵۵ء

۴۔ دورِ رابع ۱۸۵۶ء - ۱۸۶۹ء

بظاہر تو یہ ترتیب نہایت معقول ہے۔ اور معلوم ہوتا ہے کہ اگر شاعر کے کلام کو ان چار بڑے حصوں میں ترتیب دے کر مطالعہ کیا جائے تو اس کی ذہنی نشو و نما کے سمجھنے میں بہت مدد ملے گی۔ لیکن حقیقت یہ ہے

کہ ڈاکٹر صاحب کے پاس تاریخی ترتیب کا ذریعہ بھوپالی نسخے کے علاوہ اور کوئی نہیں۔ بیشک اس نسخے کے حاشیے کے اشعار کو انہوں نے ترتیب دے کر ہماری واقفیت میں اضافہ کیا لیکن اس بارے میں بھی انکی یہ رائے غلط ہے کہ جو اشعار قلمی نسخے کے متن یا حاشیے میں درج نہیں وہ سب ۱۸۳۳ء کے بعد کے ہیں۔ نواب مصطفےٰ خان شیفتہ نے گلشنِ بے خار ۱۸۳۲ء میں لکھی۔ اور اس کا ایک قلمی نسخہ جس کی تصحیح انہوں نے خود کی تھی۔ برٹش میوزیم میں موجود ہے۔ اس میں انہوں نے غالب کے اردو دیوان کا انتخاب دیا ہے اور اس میں کئی ایسی غزلیں موجود ہیں، جو بھوپالی نسخے کے حاشیے پر تو موجود نہیں۔ لیکن ظاہر ہے کہ اگر وہ ۱۸۳۲ء سے بعد کی ہوتیں تو اُن کا انتخاب شیفتہ اپنے تذکرے میں نہ کر سکتے۔ اِسی طرح ''چکنی ڈلی'' کی تعریف میں مرزا کا جو قطعہ ہے۔ وہ قیامِ کلکتہ کے دوران میں یعنی ۱۸۳۲ء سے پہلے لکھا گیا۔ لیکن قلمی نسخے کے حاشیے پر اُس کا کوئی اندراج نہیں۔ ہمیں ڈاکٹر صاحب کی اس رائے سے اتفاق ہے کہ جو اشعار نسخۂ حمیدیہ کے حاشیے پر درج ہیں۔ وہ ۱۸۳۲ء سے پہلے کے بلکہ ہماری تحقیقات کے مطابق ۱۸۲۷ء سے بھی پہلے کے ہیں لیکن اِس سے یہ نتیجہ اخذ نہیں ہو سکتا۔ کہ قلمی نسخہ ۱۸۳۲ء تک کے تمام اشعار کی مکمّل یادداشت ہے۔ اور جو اشعار اس میں نہیں وہ ۱۸۳۲ء سے ۱۸۵۵ء تک یعنی تیسرے دَور کے شمار کئے جانے چاہئیں۔

یہ صحیح ہے کہ ڈاکٹر صاحب کی کتاب کلامِ غالب کو کسی اُصول کے تحت مرتّب کرنے کی پہلی ٹھوس علمی کوشش ہے اور سب سے پہلے اُنہوں نے شاعر کے کلام کو تاریخی ترتیب سے مطالعہ کرنے کی ضرورت محسوس کی۔ لیکن ڈاکٹر صاحب کو جس قدر تنقید اور ریسیرچ کے اُصولوں سے واقفیت ہے اُتنی غالب کی تصنیفات سے نہیں۔ اور اپنی کتاب میں انہوں نے کئی باتیں ایسی لکھی ہیں جو غلط ہیں۔ اس بات نے انکی کتاب کی علمی وقعت کو بہت نقصان پہنچایا ہے۔ مثلاً صفحہ ۲۲ پر وہ غالب کے متعلق لکھتے ہیں کہ وہ ۱۸۵۷ء کے غدر تک مہرِ نیمروز لکھنے میں مشغول رہے۔ حالانکہ مرزا یہ کتاب ۱۸۵۲ء میں ختم کر چکے تھے۔ چنانچہ وہ ۱۱ر جون ۱۸۵۲ء کو ایک فارسی خط میں مولوی رجب علی خان کو لکھتے ہیں۔ ''مسودہ روزنامہ رُوداد اورنگ نشینانِ چغتائیہ بدستِ ہیرا سنگھ رواں داشتہ ام۔ ہنوز از رسیدنش نشاں نیافتہ ام۔'' انہوں نے مولوی رجب علی خان کو ایک اور خط مارچ ۱۸۵۲ء کے بعد لکھا۔ اس میں بھی اس کتاب کا ذکر ہے۔ ''بعد حمد و نعت و منقبت و مدح والئ عصر دسببِ تالیفِ کتاب کہ آئینِ نامہ طرازانِ ہنگامہ

مراست - از کشورکشایاں تا نصیرالدین سلطان ہمایوں سخن راندہ ام - باقی فرداست"۔ چونکہ مرزا نے ہمایوں کے بعد کے حالات لکھے ہی نہیں۔ اس لئے ظاہر ہے کہ مہر نیمروز ۱۸۵۲ء تک مکمل ہوگئی ہوگی۔ علاوہ ازیں نواب ضیاالدین کی تاریخ طباعت سے ظاہر ہوتا ہے۔ کہ ۱۸۵۵ء میں یہ کتاب چھپ بھی گئی تھی اور اس کا ۱۸۵۵ء کا چھپا ہوا ایک نسخہ برٹش میوزیم میں بھی موجود ہے"۔

اسی طرح ڈاکٹر صاحب کا خیال ہے کہ ۱۸۵۹ء کے بعد کی اہم تصنیف مرزا کی فارسی مثنوی "ابرگہربار" ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ جب سر سید نے ۱۸۴۵ء میں "آثار الصنادید" لکھی تو یہ مثنوی لکھی جاچکی تھی۔ چنانچہ سرسید لکھتے ہیں "۔۔۔ اور ایک مثنوی مشتمل او پر غزوات ۔۔۔ کہ اگرچہ ہنوز ناتمام ہے۔ لیکن پھر بھی قریب پندرہ سولہ جزو کے ہو چکی ہے"۔ علاوہ ازیں اس مثنوی کے کئی اشعار "مہر نیمروز" میں منتخب ہو چکے ہیں۔

ڈاکٹر صاحب کا خیال ہے کہ غالب کا اردو دیوان ۱۸۵۵ء کے قریب منتخب ہوا۔ لیکن مولوی کریم الدین نے ۱۸۴۸ء میں جو "تذکرۃ الشعرائے اردو" دہلی سے شائع کیا۔ اس میں وہ غالب کے متعلق لکھتے ہیں"۔۔۔۔ اور ایک دیوان اردو ان کی تصنیف سے بہت چھوٹا ہے۔ مطبع سید الاخبار میں درمیان ۱۸۴۳ء[1] کے چھپا تھا۔۔۔۔ وہ دیوان بندہ کے پاس بھی ہے"۔ اسی ضمن میں انہوں نے انتخاب کے متعلق بھی ذکر کیا ہے۔ کہ مرزا نے ایک ضخیم دیوان کو "منتخب کر کے چھوٹا سا دیوان بنا لیا ہے"۔ ظاہر ہے کہ یہ دیوان جو بقول مولوی کریم الدین ۱۸۴۳ء(؟) میں چھپ کر شائع ہوا۔ اس سے بہت پہلے منتخب ہوا ہوگا۔ مرزا کے ایک خط سے خیال ہوتا ہے کہ یہ انتخاب مرزا کے قیام کلکتہ کے زمانے تک مکمل ہو چکا تھا۔ اور اس کا دیباچہ بھی لکھا جا چکا تھا۔ چنانچہ مرزا نے کلکتہ سے حکیم احسن اللہ خان کو جو خط لکھا ہے۔ اس میں لکھتے ہیں۔ "سطرے چند کہ بدیباچگی دیوان ریختہ کسوت حرف و رقم پوشیدہ۔۔۔۔ ارمغان میفرستم"۔ اس کے علاوہ مرزا کی فارسی نظم و نثر کا ایک بیش قیمت مجموعہ بانکی پور لائبریری میں موجود ہے۔ جسکی تاریخ کتابت لائبریری کی مطبوعہ فہرست میں تو ۱۱۵۴ھ ہجری درج ہے۔ لیکن

---

[1] تذکرۃ الشعراء کا جو نسخہ ہمیں ملا ہے۔ اس میں سن کا پہلا ہندسہ ٹھیک طرح پڑھا نہیں جاتا۔

جو یقیناً ۱۲۵۴ھ ہجری یعنی ۱۸۳۸ء میں نقل ہوا۔ اِس میں بھی دیوانِ ریختہ کا فارسی دیباچہ موجود ہے۔ ہمارے خیال میں اس زبردست شہادت کی بنا پر یہ یقین کرنا خطرے سے خالی ہوگا۔ کہ مرزا کا پہلا اردو دیوان پچیس ۲۵ برس کی عمر سے پہلے ہی مرتب ہو چکا تھا۔ اور اس کے چند سال بعد انہوں نے اس میں سے مشکل اور کم پایہ اشعار نکال کر منتخب دیوانِ ریختہ مرتب کر لیا تھا۔ اُس کے بعد انہوں نے بیشتر فارسی شعر کہے ہیں۔ اردو اشعار بہت کم۔ اُن کا پہلا اردو دیوان اکتوبر ۱۸۴۱ء[۱] میں سید المطابع سے شائع ہوا۔ اس مطبوعہ نسخے کی ایک جلد اب بھی خان بہادر سید ابو محمد صاحب کے پاس ہے۔ ..... دیوان کا دوسرا ایڈیشن تھوڑے سے اضافے کے بعد مئی ۱۸۴۷ء میں مطبع دار السلام دہلی سے شائع ہوا۔ اُس کی ایک نقل مولانا حسرت موہانی کے پاس ہے۔ معلوم ہوتا ہے اس کے بعد دربار کے تعلقات کی وجہ سے مرزا کو اردو کی طرف زیادہ توجہ دینی پڑی۔ اور بالآخر ۱۸۵۷ء میں جب انہوں نے نواب رامپور کی تعریف میں ایک قصیدہ لکھا تو اس کے ساتھ انہوں نے اپنے اس زمانے تک کے کہے ہوئے اردو کلام کا مجموعہ بھیجا۔ یہ مجموعہ متداول دیوان کی بنیاد ہے۔ لیکن ظاہر ہے کہ یہ کلامِ غالب کا پہلا انتخاب نہیں +

اس کے علاوہ ڈاکٹر صاحب نے مرزا کی فارسی تصنیفات کو بہت اہمیت نہیں دی۔ انہوں نے غالب کے اردو کلام کو چار دوروں میں تقسیم کرنے کی کوشش کی ہے۔ لیکن فارسی کلام کو بالکل بالائے طاق رکھا ہے۔ ایک شاعر کے کلام کی تاریخی تدوین کا سب سے بڑا فائدہ یہی ہے کہ اس سے شاعر کی طبعی نشو و نما اور اسکی ذہنی تربیت کا حال معلوم ہوتا ہے اور خیالات کا تغیر و تبدل دکھانے سے شاعر کی شخصیت زیادہ نمایاں ہو جاتی ہے۔ اب مرزا کی ذہنی حالت اور اُن کے خیالات کا اظہار فقط ان کا اردو کلام ہی نہیں بلکہ فارسی زبان میں بھی انہوں نے شعر کہے ہیں۔ جو تعداد میں اردو سے کہیں زیادہ ہیں اس کے علاوہ شاعرانہ نقطۂ نظر سے بھی مرزا کا فارسی کلام اردو دیوان سے کم رتبہ نہیں۔ وہ خود کہتے ہیں ؎

---

[۱] ہمیں طبع اوّل کا جو نسخہ خان بہادر سید ابو محمد صاحب سے دستیاب ہوا۔ اُس کا سرورق غائب ہے اسلئے اسکا سال طباعت معین نہیں ہو سکتا۔ لیکن پروفیسر مہیش پرشاد صاحب کو اس نسخے کی جو نقل ملی ہے۔ اس پر تاریخ طباعت اکتوبر ۱۸۴۱ء موجود ہے۔

نیست نقصاں یک دو جزو ست ار سواد ریختہ | کاں ورژم برگے زنخلستانِ فرہنگ منست
فارسی بیں تا بہ بینی نقشہائے رنگ رنگ | بگذر از مجموعۂ اردو کہ بیرنگ منست
فارسی بیں تا بدانی کاندر اقلیمِ خیال | مانی و ارژنگم و آں نسخہ ارتنگ منست
کے درخشد جوہرِ آئینہ تا باقیست زنگ | صیقلِ آئینہ ام ایں جوہر زنگ من ست

اور یہ بھی صحیح ہے کہ مرزا کے اردو دیوان میں یا تو اُن کا طفولیت اور عنفوانِ شباب کے چند سالوں کا کلام ہے یا درباری دور کے اشعار ہیں۔ جن کا بیشتر حصہ فرمائش کے طور پر لکھا گیا۔ اب اگر اس کلام کو مرزا کا حاصلِ زندگی سمجھ لیا جائے تو اس سے غالب کی ذہنیت یا اسکے کمالِ شعرگوئی کے متعلق جو نتائج اخذ ہوں گے وہ غیر مکمل مواد پر مبنی اور غلط ہوں گے۔

اس اصولی نقص کے علاوہ فارسی سے ناواقفیت یا بے اعتنائی کی وجہ سے ڈاکٹر صاحب نے تصنیفاتِ غالب کی تعیین میں کئی فاش غلطیاں کی ہیں۔ مثلاً یہ ایک مسلّمہ اصول ہے کہ کسی خط کی تاریخ تحریر اس کے مضمون سے معیّن ہو سکتی ہے۔ لیکن ڈاکٹر صاحب نے اپنی کتاب کے صفحہ ۸۰ پر اسے واضح کرنے کے لئے جو مثال دی ہے وہ خود غلط ہے۔ "وہ مرزا کے دو خطوط کا ذکر کرتے ہوئے جو ۱۸۶۰ء کے ہیں۔ اور جن میں غالب کے اردو دیوان کا ذکر ہے لکھتے ہیں۔" "اسی طرح نواب ضیاءالدین خان کے نام کا وہ خط بھی جو بلا تاریخ ہے اسی سال سے منسوب ہونا چاہیئے۔"

اس عبارت میں ڈاکٹر صاحب نے جس خط کا ذکر کیا ہے۔ اس کا اقتباس درج ذیل ہے۔:

> "جناب قبلہ و کعبہ' آپ کو دیوان دینے میں کیوں تامل ہے .....
> .... ایک جلد ہزار جلد بن جائے۔ میرا کلام شہرت پائے۔ میرا دل خوش ہو تمہاری تعریف کا قصیدہ اہلِ عالم دیکھیں۔ تمہارے بھائی کی تعریف کی نثر سب کی نظر سے گزرے۔"

اِس خط کی تاریخ معین کرنا مشکل ہے۔ لیکن ظاہر ہے کہ یہ خط اردو دیوان کے متعلق نہیں۔ جو ۱۸۶۱ء میں میرٹھ گیا۔ بلکہ فارسی کلیات کے متعلق ہے۔ کیونکہ نہ تو اردو دیوان میں نواب ضیاالدین کی تعریف کا قصیدہ"

ہے۔ اور نہ اُن کے "بھائی (نواب امین الدین) کی تعریف کی نثر" یہ دونوں چیزیں فارسی کلیات میں ہیں۔ اور یہ خط کلیات فارسی ہی کے متعلق ہے۔

کلام غالب کی تاریخی تدوین کا خیال ہمیں ڈاکٹر لطیف کی کتاب پڑھکر ہوا۔ اس کے بعد جب ہم نے غالب کے فارسی خطوط کا بغور مطالعہ کیا اور دیکھا کہ غالب نے ایک طویل حصہ عمر میں اردو شعر گوئی ترک کر رکھی تھی تو غالب کی شاعرانہ نشو و نما سمجھنے کے لئے اس تدوین کی ضرورت ہمیں اور بھی محسوس ہوئی۔ شروع شروع میں ہم نے تاریخی تدوین کی بنا نسخۂ حمیدیہ قلمی نسخہ رامپور کے علاوہ معاصرانہ تذکروں پر رکھی۔ اور گلشن بے خار، آثار الصنادید، جلوہ خضر اور دوسرے تذکروں کی بنا پر ان غزلیات کو علیحدہ کیا جن کے اشعار اُن تذکروں میں منتخب کئے گئے تھے۔ خوش قسمتی سے اس تلاش و تحقیق کے دوران میں ہمیں کلام غالب کے ایسے نادر معاصرانہ نسخوں کا سُراغ مل گیا جو ان تذکروں کے اشعار سے کہیں زیادہ مکمل اور قابلِ اعتماد تھے اور جنھوں نے ہمیں بہت حد تک ان تذکروں سے بے نیاز کر دیا۔ کلام غالب کی موجودہ تاریخی تدوین بیشتر انہی نسخوں پر مبنی ہے۔ غالب نامہ کی پہلی اشاعت کے وقت ہم نے دیوان غالب اردو طبع اول (مملوکہ خان بہادر سید ابو محمد صاحب)، قلمی نسخہ میخانۂ آرزو (بانکی پور لائبریری)، قلمی نسخہ دیوان فارسی (رامپور لائبریری)، نسخہ حمیدیہ اور تذکرہ گلشنِ بے خار سے خاص طور پر استفادہ کیا تھا۔ موجودہ اشاعت کے لئے ہم نے قلمی نسخۂ دیوانِ اردو (مملوکہ حافظ محمود خان صاحب شیرانی)۔ دیوان اردو طبع ثانی (۱۸۴۷ء)، دیوانِ فارسی طبع اول (۱۸۴۵ء) سے مدد لی ہے۔ اور ان مآخذ کی بنا پر کلام غالب کو مندرجہ ذیل پانچ دوروں میں ترتیب دیا ہے۔

۱۔ پہلا دور
۱۸۰۷ء تا ۱۸۲۱ء

اِس دور میں ان اشعار کا انتخاب ہے۔ جو پچیس ۲۵ برس کی عمر سے پہلے لکھے جا چکے تھے۔ اور نسخہ حمیدیہ کے متن میں موجود ہیں۔ ہم نے ان اشعار کو تمام کا تمام درج کرنے کی بجائے فقط انتخاب دینے پر اس لئے اکتفا کیا ہے۔ کہ اس دور کے اشعار کو مفتی انوار الحق نے بھی باقی اشعار سے علیحدہ شائع کیا ہے۔ تمام اشعار کو مطبوعہ نسخہ حمیدیہ سے نقل کرنے کے لئے کسی خاص محنت کی ضرورت

ہے۔ اور نہ اس میں کوئی خاص مصلحت ہے۔ یہ اشعار بیشتر دقیق اور شاعرانہ نقطۂ نظر سے کم پایہ ہیں۔ جو حضرات غالب کے ابتدائی دَور کا خاص طور پر مطالعہ کرنا چاہیں۔ اُن کے لئے مطبوعہ نسخۂ حمیدیہ میں ابتدائی غزلیات علیحدہ ترتیب دی ہوئی موجود ہیں۔ ہم نے فقط ایسے اشعار کا انتخاب دیا ہے۔ جو ادبی نقطۂ نظر سے قابلِ قدر ہیں۔ اور غالب کی ابتدائی طرزِ شاعری کو بھی نمایاں کرتے ہیں ؛

۲۔ دوسرا دور
۱۸۲۱ء سے ۱۸۲۷ء

اِس ضمن میں وہ اردو اشعار درج ہیں۔ جو نسخۂ حمیدیہ کے متن میں موجود ہیں۔ لیکن دیوانِ غالب کے پہلے مطبوعہ اڈیشن (۱۸۴۱ء) میں چھپ چکے ہیں۔ بظاہر تو اِس دور کو ۱۸۴۱ء پر ختم ہونا چاہیئے تھا۔ لیکن مطبوعہ اڈیشن کے اشعار کا جزو غالب ۱۸۲۷ء سے پہلے لکھا جا چکا تھا۔ اس لئے ہم نے اِس دَور کو ۱۸۲۷ء پر ختم کیا ہے۔ اور جو اشعار ۱۸۲۷ء کے بعد لکھے گئے۔ اُن کی تفصیلات آیندہ سطور میں ہم پہنچا دی ہیں ؛

۱۸۲۷ء تک کے اشعار معین کرنے میں ہم نے سب سے زیادہ بھروسہ اردو دیوان کے اس قلمی نسخے پر کیا ہے جو پروفیسر شیرانی صاحب کے کتب خانے کی زینت ہے۔ اس نسخے پر تاریخ کتابت درج نہیں۔ لیکن داخلی شہادت کی بنا پر کہا جا سکتا ہے۔ کہ یہ نسخہ مرزا کے سفرِ کلکتہ (۱۸۲۶ء) سے کچھ عرصہ پہلے لکھا گیا۔ اور مرزا کی کئی غزلیں جو اس سفر کے دوران میں لکھی گئیں۔ اِس نسخے کے حاشیے پر درج ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ غالباً دہلی یا لکھنؤ میں کوئی صاحب تھے جن کے پاس یہ نسخہ محفوظ تھا۔ اور جنہیں مرزا اثنائے سفر میں اپنا کلام بھیجتے رہے۔ حاشیے کی دو غزلوں کے متعلق تصریح ہے کہ باندہ سے بھیجی گئیں۔ اور قیامِ لکھنؤ کی مندرجہ ذیل مشہور غزل بھی حاشیے پر درج ہے ؎

صدرہ آہنگِ زمیں بوسِ قدم ہے ہم کو ۔۔۔ واں پہنچ کر جو غش آتا پئے ہم ہے ہم کو

اس قلمی نسخے[1] کے درمیان اور اخیر کے چند اوراق غائب ہیں۔ اور ریفین سے یہ نہیں کہا جا سکتا کہ جو اشعار

[1] جس وقت یہ دیوان نقل کیا گیا (ق ۱۸۲۶ء) اس وقت مرزا ابتدائی کلام پر نظرِ ثانی کر رہے تھے۔ چنانچہ کئی پُرانی غزلوں کے نئے نئے نسخۂ شیرانی کے متن میں موجود ہیں۔ لیکن دیوانِ ریختہ کے انتخاب کی نوبت ابھی تک نہ آئی تھی مرزا غالب نے کلکتہ سے ایک خط میں حکیم احسن اللہ خان کو دیوانِ ریختہ کا فارسی دیباچہ بھیجنے کا ذکر کیا ہے۔ اس

اس نسخے میں نہیں وہ سب ۱۸۲۷ء کے بعد کے ہیں۔ لیکن قیاس غالب یہی ہے۔ چنانچہ ذیل کی غزلیں ہمیں نسخۂ شیرانی میں نہیں ملیں:-

کیوں جل گیا نہ تابِ رُخِ یار دیکھ کر	۱	جلتا ہوں اپنی طاقتِ دیدار دیکھ کر
مہرباں ہو کے بلا لو مجھے چاہو جس وقت	۲	میں گیا وقت نہیں ہوں کہ پھر آ بھی نہ سکوں
یہ ہم جو ہجر میں دیوار و در کو دیکھتے ہیں	۳	کبھی صبا کو کبھی نامہ بر کو دیکھتے ہیں
دھوتا ہوں جب میں پینے کو اس سیم تن کے پانو	۴	رکھتا ہے ضد سے کھینچ کے باہر لگن سے پانو
سادگی پر اس کی مر جانے کی حسرت دل میں ہے	۵	بس نہیں چلتا کہ پھر خنجر کفِ قاتل میں ہے
دل سے تری نگاہ جگر تک اتر گئی	۶	دونوں کو اک ادا میں رضامند کر گئی
جس بزم میں تو ناز سے گفتار میں آوے	۷	جاں کالبدِ صورتِ دیوار میں آوے
ہم رشک کو اپنے بھی گوارا نہیں کرتے	۸	مرتے ہیں ولے ان کی تمنّا نہیں کرتے
دیکھ کر در پردہ گرمِ دامن افشانی مجھے	۹	کر گئی وابستۂ تن میری عریانی مجھے
لاغر اتنا ہوں کہ گر تو بزم میں جادے مجھے	۱۰	میرا ذمہ دیکھ کر گر کوئی بتلا دے مجھے

ان کے علاوہ صفحات ۲۷۸، ۲۸۱ اور ۲۸۲ کے تمام اشعار بھی نسخۂ شیرانی میں نہیں ملے۔

"خمخانۂ شباب" کے جو اشعار نسخۂ شیرانی کے متن یا حاشیے میں درج نہیں اور جو ۱۸۲۷ء کے بعد لکھے گئے۔

ہمارے خیال میں ان کا جزوِ غالب ۱۲۴۸ھ ہجری یعنی ۱۸۳۲-۳۳ء سے پہلے لکھا جا چکا تھا۔ دیوانِ غالب طبع اول میں اشعار کی تعداد ۱۰۹۴ ہے۔ اور نواب ضیاء الدین کی اس تقریظ میں جو ۱۸۳۸ء میں لکھی گئی۔ اشعار کی تعداد ۱۰۷۲ درج ہے (آثار الصّنادید)۔ ظاہر ہے۔ کہ بائیس[لہ] اشعار کے سوا اس ضمن کے باقی سب اشعار ۱۸۳۳ء سے پہلے لکھے گئے ہوں گے۔ باقی اشعار میں ——— سے

(بقیہ حاشیہ ۱۶۷) سے خیال ہوتا ہے کہ دیوانِ ریختہ کا انتخاب سفر کلکتہ یا قیام کلکتہ کے دوران میں یا اس سے کچھ عرصہ پہلے ہوا۔

لہ یہ بائیس اشعار غالباً "خمخانۂ شباب" کی آخری دو رباعیوں، ردیف واؤ کی دوسری غزل اور ردیف یائے کی غزل مندرجہ صفحہ ۲۷۳-۲۷۴ پر مشتمل تھے۔

چار پانچ غزلیں ایسی ہیں جنکے اشعار گلشنِ بیخار میں منتخب ہوئے ہیں۔ گلشنِ بیخار اوائل ۱۲۴۸ھ یعنی ۱۸۳۲ء میں شروع اور اواخر ۱۲۵۰ھ (۱۸۳۴ء یا ۱۸۳۵ء) میں مکمل ہوا۔ اس میں غالب کے متعلق مذکور ہے "دیوانش رابعد ترتیب و تکمیل دیگر نگریست۔ فراواں ابیات ازاں حذف و ساقط کردہ قدر قلیلے انتخاب زدہ۔ مدتہاست کہ بہ نظمِ ریختہ سرے ندارد ...... دیوانش بنظر رسید و ایں ابیات ازاں منتخب گردید۔" ظاہر ہے کہ اگر اس اندراج کی تحریر کے وقت مرزا نے ایک مدت سے اردو شاعری ترک کر رکھی تھی۔ تو جو اشعار اس اندراج کے ساتھ درج ہوئے۔ وہ کم ازکم ۱۲۴۸ ہجری (۱۸۳۲ء۔ ۱۸۳۳ء) تک لکھے جا چکے ہوں گے۔ مولانا نظامی بدایونی کا بیان ہے۔ کہ انہوں نے غالب کا ایک دیوان مرتبہ ۱۲۴۸ھ ہجری مطالعہ کیا ہے۔ اور اس کے شروع میں جو دیباچہ لکھا ہے اس کی تاریخ اندراج انہوں نے ۲۴ ذیقعد ۱۲۴۸ھ ہجری دی ہے[1]۔ ہمارا خیال ہے کہ نواب مصطفٰے خان نے گلشنِ بے خار میں جن غزلیات کا انتخاب درج کیا۔ وہ یقیناً اس دیوان میں ہونگی۔ ان کے علاوہ بعض دوسری غزلیات کے متفرق اشعار اور رباعیات جو "خمخانۂ شباب" میں درج ہیں۔ اُن کا بیشتر حصہ بھی ۱۸۳۲ء اور ۱۸۳۳ء سے پہلے لکھا جا چکا ہوگا ؛

۳۔ تیسرا دور
۱۸۲۷ء۔ ۱۸۴۷ء

اس دور کو ہم نے تین مختصر دوروں میں تقسیم کیا ہے۔

(ا) ۱۸۲۷ء سے ۱۸۳۰ء تک۔ یعنی ان اشعار کا انتخاب جنکے متعلق داخلی شہادت کی بنا پر کہا جا سکتا ہے کہ وہ سفرِ کلکتہ کے دوران میں لکھے گئے +

(ب) ۱۸۳۰ء سے ۱۸۳۸ء تک۔ یعنی ان اشعار کا انتخاب جو غالباً سفرِ کلکتہ کے بعد لکھے گئے۔ لیکن قلمی نسخہ بانکی پور لائبریری (۱۸۳۸ء) میں موجود ہیں +

(ج) ۱۸۳۸ء سے ۱۸۴۷ء تک۔ یعنی ان اشعار کا انتخاب جو قلمی نسخہ بانکی پور کے بعد لکھے گئے لیکن دیوانِ غالب مطبوعہ ۱۸۴۵ء میں موجود ہیں۔ یا دوسرے ذرائع سے اس دور میں شمار کئے جا سکتے ہیں۔

---

[1] دیوانِ غالب (نظامی پریس ایڈیشن) صفحہ ۶۱، ۶۷

اس بیس سال کے عرصے میں مرزا کی توجہ زیادہ تر فارسی شعر گوئی کی طرف تھی۔ اور اس دوران میں انہوں نے بیس اردو غزلیں بھی نہیں کہیں ۔

۴۔ چوتھا دور
۱۸۴۷ء - ۱۸۵۷ء

اس دور میں ۵۹ اردو اشعار ہیں۔ جو اردو دیوان کے مطبوعہ نسخہ ۱۸۴۱ء میں موجود نہیں۔ لیکن اس قلمی نسخے میں موجود ہیں۔ جو مرزا نے ۱۸۵۷ء میں رامپور بھیجا۔ بظاہر اس دور کا آغاز ۱۸۴۱ء سے ہونا چاہیے تھا۔ لیکن مرزا نے ۱۸۴۱ء سے ۱۸۴۷ء تک فقط چار اردو غزلیں اور ایک قطعہ لکھا ہے۔ اس لئے ہم نے اس دور کو ۱۸۴۷ء سے شروع کیا ہے۔ اور ان اشعار کو جو ۱۸۴۷ء سے پہلے لکھے گئے ۱۸۴۷ ق یا اس طرح کی دوسری علامت سے ممتاز کر دیا ہے ۔

اس زمانے کے فارسی اشعار کا انتخاب بھی اسی دور میں شامل ہے ۔

۵۔ پانچواں دور
۱۸۵۷ء - ۱۸۶۹ء

اس دور میں ۵۹ اردو اور فارسی اشعار ہیں۔ جو غدر کے بعد لکھے گئے۔ اور جن کی تاریخ تصنیف شاعر کے خطوط یا دوسرے ذرائع سے معین کی جا سکتی ہے ۔

مضمون ختم کرنے سے پہلے ہم اتنا کہہ دینا چاہتے ہیں۔ کہ "مکمل شرح کلام غالب" کی جن غزلوں کو مولانا نیاز، مولانا عبد الباری آسی۔ مجنوں گورکھپوری اور دوسرے اہل قلم حضرات نے غالب کے نتائج طبع مان لیا ہے۔ انہیں کلام غالب ماننے میں ہمیں بہت تامل ہے۔ ہمارے وجوہ بالاختصار یہ ہیں :-

(۱) جن بیاض سے یہ اشعار نقل ہوتے ہیں۔ اس کے مالک، مرتب اور کاتب کے متعلق کوئی قابل ذکر تحقیق نہیں۔ تاریخ کتابت بھی اس پر درج نہیں۔

(۲) کہا جاتا ہے کہ کوئی صاحب شاگرد تھے۔ ان کو مرزا نے وقت بے وقت رامپور میں یہ غزلیں لکھوائیں اور وہ ان کے پاس رہیں۔ ان کا خیال تھا کہ جب دیوان طبع ہوگا تو یہ غزلیں اسی میں شریک کر دی جاویں گی

مرزا کے خطوط سے ظاہر ہے۔ کہ وہ رامپور فقط دو دفعہ گئے۔ ایک دفعہ جنوری ۱۸۶۰ء کے اخیر میں اور دوسری دفعہ اکتوبر ۱۸۶۵ء میں۔ دوسری دفعہ جب مرزا رامپور گئے تو انکی عمر اڑسٹھ ۶۸ سال سے زیادہ تھی۔ اور صحت کی حالت ناگفتہ بہ۔ ایسی حالت میں یہ خیال کرنا عبث ہے کہ انہوں نے پچیس ایسی غزلیں لکھی ہونگی جو دقیق خیالات سے پُر ہیں۔ پھر لطف یہ ہے کہ یہ غزلیں فرمائش پر بھی نہیں لکھی گئیں۔ اور ان میں نواب رامپور کی طرف کسی جگہ اشارہ نہیں۔ مرزا نے بہادر شاہ کی فرمائش پر جو غزلیں لکھیں۔ اُن میں بادشاہ کا ذکر اکثر آجاتا ہے۔ اب اگر مرزا نے یہ غزلیں بامر مجبوری فرمانروائے رامپور کے ارشاد پر لکھیں تو کم از کم ایک غزل میں تو نواب کا ذکر ہوتا۔ غالب نے رامپور کا پہلا سفر ۱۸۶۰ء میں اختیار کیا اس سفر کے دوران میں انہوں نے نواب ضیاءالدین کی فرمائش پر نواب صاحب رامپور سے اپنے دیوان کا نسخہ لے کر نواب ضیاءالدین کے پاس بھیجا۔ واپسی پر میرٹھ اُترے تو منشی ممتاز علی نے انہیں دیوان کے ایک نسخے کے لئے کہا اور جیسا کہ مرزا کے خطوں سے ظاہر ہے۔ انہوں نے نواب ضیاءالدین سے یہ نسخہ لے کر میرٹھ بھیجدیا۔ اب اگر ان پچیس غزلوں کے متعلق یہ بیان درست ہے کہ وہ دیوان کی طباعت کے وقت شامل کی جانے والی تھیں تو بڑا تعجب ہے کہ اس فیصلے کے تھوڑے عرصہ بعد جب میرزا نے میرٹھ میں اپنے دیوان کی اشاعت کا فیصلہ کیا تو اپنے تازہ ترین کلام کو اس میں کیوں شامل نہ کیا۔

۳۔ مولوی عبدالرزاق شاکر کے نام غالب کے اردو خطوط موجود ہیں لیکن رامپور کے سفر میں وہ غالب کے شریک نہ تھے۔ غالب انہیں ایک خط میں لکھتے ہیں "قبلہ و کعبہ فقیر پا در رکاب ہے شنبہ چہارشنبہ ان دونوں دنوں میں سے ایک دن عازم رامپور ہوں گا۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اب جو کوئی خط آپ بھیجیں۔ مکان کا پتہ لکھنا ضروری نہیں۔ شہر کا نام اور میرا نام کافی ہے۔" ظاہر ہے کہ اگر شاکر صاحب رامپور ہوتے تو انہیں مرزا کے نام (اور شہر کے نام سے) خط لکھنے کی ضرورت نہ ہوتی۔ غالب کے خطوط میں مولوی عبدالرزاق کے سوا اور کسی شاکر کا ذکر نہیں۔

۴۔ اس زمانے میں مرزا نے جو غزلیں لکھیں۔ اُن کے خیالات سادہ اور زبان صاف ہے مثلاً ؎

میں ہوں مشتاقِ جفا۔ مجھ پہ جفا اور سہی
تم ہو بیداد سے خوش اس سے سوا اور سہی

لیکن مولانا آسی نے جو اشعار شائع کئے ہیں۔ اُن میں سے اکثر دقیق ہیں۔ اور مرزا کی اُس زمانے کی طرزِ شعر گوئی کے مطابق نہیں۔ جو اشعار سادہ ہیں وہ بھی مرزا کے کلام کی خصوصیات سے عاری ہیں جو ان کے اس زمانے کے اردو اشعار کا مابہ الامتیاز ہیں۔ ایک شعر تو ایسا ہے کہ اُس کے پڑھنے سے میر امانی اسد کا وہ مطلع یاد آتا ہے۔ جس کی وجہ سے مرزا نے اپنا تخلص بدل دیا تھا ؎

وفا جفا کی طلبگار ہوتی آئی ہے
ازل کے دن سے یہ اے یارؔ ہوتی آئی ہے

۵۔ مرزا کے علاوہ غالب علی خان اور دو تین دوسرے شعرا کا بھی تخلص غالب تھا۔ اگر بیاض کے سارے اشعار غالب کے ہیں تو ممکن ہے کہ وہ کسی اور غالب کے ہوں۔ مرزا کے یقیناً نہیں *

ان وجوہ کی بنا پر ان غیر مطبوعہ غزلیات کو ہم نے مرزا غالب کے اشعار نہیں مانا۔ اور ان کا انتخاب اُن کی شاعری کے کسی دور میں نہیں دیا *

ریختہ

رنگِ بیدل
بادۂ نیم رس

۱۸۰۷(ء) تا ۱۸۲۱ء

طرزِ بیدلؔ میں ریختہ لکھنا
اسد اللہ خاں قیامت ہے!

دیباچهٔ دیوانِ ریختہ

مشامِ شمیم آشنایاں را صلا۔ و نہادِ انجمن نشیناں را مژدہ۔ کہ لختے از سامانِ مجمرہ گردانی آمادہ و دامنے
از عودِ ہندی بدست بہم دادہ است۔ نہ چوبہائے سنگ شعب خوردہ بہنجار ناطبعی شکستہ بے اندام تراشیدہ
بلکہ بہ تیشہ شگافتہ۔ بکارد ریزہ ریزہ کردہ۔ بسوہاں خراشیدہ۔ اے دودِ نفس گداختگی ہائے شوق بجستجوئے آتش
پارسی است نہ آتشے کہ در گلخنہائے ہند افسردہ و خاموش و از کفِ خاکستر بہ برگ خود وش سیہ پوش۔ یعنی چہ
بر روئے مسلم است تا پاکی با ستخوان مردہ ناہار شکستن و از دیوانگی بر رشتۂ شمع مزار کشتہ آویختن ہر آئینہ
بدل گداختن نیرزد۔ و بزم افروختن را نشاید۔ روغنِ آتش شمع را افروزندہ و آتش پرست را بہ یادِ فراہم و آتش
سوزندہ نیک میداند کہ پژوہندہ در ہوائے آں رخشندہ آذر نعل در آتش است۔ کہ بچشم روشنی ہوشنگ
از سنگ بیروں تافتہ و در ایوانِ لہراسپ نشو و نما یافتہ حسن را فروغ است و لالہ را رنگ و مغ را چشم و کدہ را چراغ
بخشندہ۔ مژدہ اں در دل جشن برافروزد۔ سپاسم کہ شرارے از آں آتش تابناک در خاکسترِ خویش یافتہ بکاوکاو
شتافتہ ام۔ و از نفس دمہ ال برنہادہ بود کہ در کم مایۂ روزگاراں آنمایہ فراہم تواند آمد کہ مجمرہ را فروشنائی
چراغ و درایچۂ عود را بال شناسائی دماغ تواند بخشید بہانا نگارندۂ این نامہ را آں در سر است کہ پس از انتخاب
دیوانِ ریختہ گرد آوردن سرمایۂ دیوان فارسی برخیزد و دستفاضۂ کمال این فریور فن پس زانوئے خویش نشیند۔
امید کہ سخن سرایان سخنور ستائے پراگندہ ابیاتے را کہ خارج ازیں اوراق یابند از آثار تراوش رگِ
کلک این نامہ سیاہ نشناسند۔ و چامۂ گرد آورندہ در ستائش و نکوہش آں اشعار ممنون و ماخوذ نسگالند۔
یارب این بوئے ہستی ناشنیدہ و از نیستی بہ پیدائی نارسیدہ یعنی نقش بضمیر آمدۂ نقاش کہ اسد اللہ خاں موسوم بہ میرزا
نوشہ معروف و غالب متخلص است۔ چناں کہ اکبرآبادی مولد و دہلوی مسکن است فرجام کار نجفی مدفن نیز باد +

تمام شدہ بست و چہارم شہر ذیقعدہ ۱۲۴۸ھ ہجری

غالب

تشریحات

۱۔ غالب نے جو اشعار ابتدائے شعر گوئی سے پچیس برس کی عمر تک لکھے۔ انہیں ہم نے دو حصوں میں تقسیم کر دیا ہے
(ا) رنگِ بیدل کے ضمن میں اُن غزلوں کے اشعار درج ہیں جنہیں مروّجہ دیوان مرتب کرتے وقت مصنف نے بالکل نظر انداز کر دیا اور جو غالباً بالکل ابتدائی شعر گوئی کا نمونہ ہیں۔ اُن میں سے ہم نے ایسے اشعار کا انتخاب دیا ہے۔ جو شاعر کی ابتدائی طرزِ شاعری کو نمایاں کرتے ہیں اور ادبی نقطۂ نظر سے بھی بے مایہ نہیں +
(ب) بادۂ نیم رس کے تحت ان غزلیات اور قصائد کا انتخاب ہے جنہیں شاعر نے پچیس برس کی عمر سے پہلے لکھا تھا۔ اور جن کے اکثر اشعار منتخب دیوانِ ریختہ میں موجود ہیں +
۲۔ ان صفحات میں جب کسی شعر کے مقابل "م" درج ہو تو اس سے یہ سمجھنا چاہئے۔ کہ اگرچہ ردیف اور قافیے کی وحدت کی وجہ سے یہ شعر باقی اشعار کے ساتھ درج ہے۔ لیکن یہ اس دور کا نہیں بلکہ شاعر نے بعد میں اضافہ کیا ہے +
۳۔ دوسرے دور کے جن اشعار کے بالمقابل "م" لکھا ہے۔ وہ قلمی نسخہ مملوکہ حافظ محمود خان شیرانی میں نہیں اور غالباً ۱۸۲۷ء کے بعد لکھے گئے +
۴۔ جہاں کسی شعر کے بالمقابل "ق" درج ہو وہاں اس شعر کو اس سے پہلے دور کا شعر سمجھنا چاہیئے +
۵۔ جہاں ایک غزل کے چند اشعار ایک لکیر کے بعد درج ہیں وہ اس دور کے نہیں بلکہ شاعر نے بعد میں اضافہ کئے ہیں۔ عموماً ایسے اشعار دورِ اوّل کے دوسرے حصے میں ملیں گے۔ جنہیں شاعر نے دیوان مرتب کرتے وقت (یعنی دوسرے دور میں) اضافہ کیا +

رنگِ بیدل

غزلیات

بشغلِ انتظارِ مہوشاں در خلوتِ شبہا   سرِ تارِ نظر ہے رشتۂ تسبیحِ کوکب ہا
کرے گر فکرِ تعمیرِ خرابی ہائے دل گردوں   نہ نکلے خشت مثلِ استخواں بیرونِ قالب ہا
عیادت ہائے طعن آلودِ یاراں زہرِ قاتل ہے   رفوئے زخم کرتی ہے بنوکِ نیشِ عقرب ہا
کرے ہے حسنِ خوباں پردے میں مشّاطگی اپنی   کہ ہے تہ بندیٔ خط سبزۂ خط در تہِ لب ہا
فنا کو عشق ہے بیمقصداں حیرت پرستاراں   نہیں رفتارِ عمرِ تیز رو پابندِ مطلب ہا

اسد کو بُت پرستی سے غرض دردآشنائی ہے
نہاں ہیں نالۂ ناقوس میں در پردہ "یارب ہا!"

وحشی بن صیّاد نے ہم رمخوردوں کو کیا رام کیا   رشتۂ چاکِ جیب دریدہ صرفِ قماشِ دام کیا
مُہر بجائے نامہ لگائی بر لبِ پیکِ نامہ رساں   قاتلِ تمکیں سنج نے یوں خاموشی کا پیغام کیا

شامِ فراقِ یار میں جوشِ خیرہ سری سے ہمنے اسد
ماہ کو در تسبیحِ کواکب جائے نشینِ امام کیا

گرفتاری میں فرمانِ خطِ تقدیر ہے پیدا   کہ طوقِ قمری از ہر حلقۂ زنجیر ہے پیدا
زمیں کو صفحۂ گلشن بنایا خوں چکانی نے   چمن بالیدنی ہا از رمِ نخچیر ہے پیدا
نہیں ہے کف لبِ نازک پہ فرطِ نشۂ مے سے   لطافت ہائے جوشِ حسن کا سرشیر ہے پیدا
عروجِ ناامیدی چشمِ زخمِ چرخ کیا جانے   بہارِ بے خزاں از آہِ بے تاثیر ہے پیدا

اسدؔ جس شوق سے ذرّے تپش فرسا ہوں روزن میں
جراحت ہائے دل سے جوہر شمشیر ہے پیدا

بہ مُہرِ نامہ جو بوسہ گلِ پیام رہا — ہمارا کام ہوا اور تمہارا نام رہا
ہوا نہ مجھ سے بجز درد حاصلِ صیّاد — بسانِ اشک گرفتارِ چشم دام رہا
دل و جگر تفِ فرقت سے جلکے خاک ہوئے — ولے ہنوز خیالِ وصالِ خام رہا
شکستِ رنگ کی لائی سحر شبِ سنبل — پہ زلفِ یار کا افسانہ ناتمام رہا
دہانِ تنگ مجھے کس کا یاد آیا تھا — کہ شب خیال میں بوسوں کا اژدہام رہا

نہ پوچھ حال شب و روز ہجر کا غالبؔ
خیالِ زلف و رُخِ دوست صبح و شام رہا

ہے بہاراں میں خزاں پرور خیالِ عندلیب — رنگِ گُل آتش کدہ ہے زیرِ بالِ عندلیب
عمر میری ہوگئی صرفِ بہارِ حُسن یار — گردشِ رنگِ چمن ہے ماہ و سالِ عندلیب
منع مت کر حُسن کی ہمکو پرستش سے کہ ہے — بادۂ نظارۂ گلشن حلالِ عندلیب

ہے مگر موقوف بر وقتِ دگر کارِ اسدؔ
اے شبِ پروانہ و روز وصالِ عندلیب

ناخن دخلِ عزیزاں یک قلم ہے نقب زن — پاسبانیٔ طلسم کنج تنہائی عبث
محملِ پیمانۂ فرصت ہے بردوش حباب — دعوئے دریا کشی و نشہ پیمائی عبث
اے اسدؔ بیجا ہے ناز سجدۂ عرضِ نیاز — عالمِ تسلیم میں یہ دعوئے آرائی عبث

قیس بھاگا شہر سے شرمندہ ہو کر سوئے دشت
بن گیا تقلید سے میری یہ سودائی عبث!

قطعِ سفرِ ہستی و آرامِ فنا ہیچ
رفتار نہیں بیشتر از لغزشِ پا ہیچ

حیرت ہمہ اسرار پہ مجبورِ خموشی
ہستی نہیں جز بستنِ پیمانِ وفا ہیچ

تمثالِ گداز آئینہ ہے عبرتِ بینش
نظارہ تحیّر۔ چمنستانِ بقا ہیچ

گلزارِ دمیدن، شررستان رمیدن
فرصت تپش و حوصلۂ نشو و نما ہیچ

آہنگِ عدم نالہ بہ کہسار گرو ہے
ہستی میں نہیں شوخیِ ایجادِ صدا ہیچ

کس بات پہ مغرور ہے اے عجزِ تمنّا
سامانِ دعا وحشت و تاثیرِ دعا ہیچ

آہنگِ اسدؔ میں نہیں جز نغمۂ بیدل
عالم ہمہ افسانۂ ما دارد و ما ہیچ

تو پست فطرت اور خیالِ بسا بلند
اے طفلِ خود معاملہ قد سے عصا بلند

ویرانیٔ جز آمد و رفتِ نفس نہیں
ہے کوچہائے نے میں غبارِ صدا بلند

رکھتا ہے انتظارِ تماشائے حسنِ دوست
مژگانِ باز ماندہ سے دستِ دعا بلند

موقوف کیجیے یہ تکلّف نگاریاں
ہوتا ہے ورنہ شعلۂ رنگِ حنا بلند

ہے دلبری کمینگرِ ایجادِ یک نگاہ
کارِ بہانہ جوئیِ چشمِ حیا بلند

بالیدگی نیازِ قدِ جانفزا اسدؔ
در ہر نفس بقدرِ نفس ہے قبا بلند

حسرتِ دستگہ و پائے تحمّل تاچند
رگِ گردن خطِ پیمانۂ بے مُل تاچند

کوکبِ بخت بجز روزنِ پُر دود نہیں
عینکِ چشمِ جنوں حلقۂ کاکل تاچند

چشمِ بے خونِ دل و دل تہی از جوشِ نگاہ
یزباں عرضِ فسونِ ہوسِ گُل تاچند

بزمِ داغِ طرب و باغ کشادِ پرِ گُل
شمع و گُل تا کے و پروانہ و بلبل تاچند

نالہ دامِ ہوس و دردِ اسیری معلوم
شرح بر خود غلطیہائے تحمّل تاچند

سادگی ہے عدمِ قدرتِ ایجادِ غنا
ناکسی! آئینۂ نازِ توکل تاچند

اسدِ خستہ گرفتارِ دو عالم اوہام
مشکل آساں کن یک خلق! تغافل تاچند

بہ کامِ دل کریں کس طرح گمرہاں فریاد
ہوئی ہے لغزشِ پا لکنتِ زباں فریاد

کمالِ بندگیِ گل ہے رہنِ آزادی
ز دستِ مشرتِ پرِ خارِ آشیاں فریاد

نوازشِ نفسِ آشنا کہاں، ورنہ
برنگِ نَے ہے نہاں در ہر استخواں فریاد

تغافل آئینہ دارِ خموشیٔ دِل ہے
ہوئی ہے محو بہ تقریبِ امتحاں فریاد

ہلاکِ بیخبری نغمۂ وجود و عدم
جہان و اہلِ جہاں سے جہاں جہاں فریاد

جوابِ سنگدلیہائے دشمناں، ہمّت
ز دستِ شیشۂ دلہائے دوستاں فریاد

ہزار آفت و یک جانِ بے نوائے اسدؔ
خدا کے واسطے اے شاہِ بیکساں فریاد

بینشِ بسعیِ ضبطِ جنوں نو بہار تر
دِل در گدازِ نالہ بہ کاہ آبیار تر

قاتل بعزمِ ناز و دل از زخم در گداز — شمشیر آبدار و نگاہ آبدار تر

ہے کسوتِ عروجِ تغافل کمالِ حُسن — چشمِ سیہ بمرگِ نگہ سوگوار تر

اے چرخ خاک بر سرِ تعمیرِ کائنات — لیکن بنائے عہدِ وفا استوار تر

آئینہ داغِ حیرت و حیرت شکنجِ یاس
سیماب بیقرار و اسدؔ بیقرار تر

گو بیابانِ تمنا و کجا جولانِ عجز — آبلے پا کے ہیں یاں رفتار کو دندانِ عجز

ہو قبولِ کم نگاہی تحفۂ اہلِ نیاز — اے دل وائے جانِ ناز لے دین وائے ایمانِ عجز

بوسۂ پا انتخابِ بد گمانیہائے حُسن — یاں ہجومِ عجز سے تا سجدہ ہے جولانِ عجز

حُسن کو غنچوں سے ہے پوشیدہ چشمی ہائے ناز — عشق نے وا کی ہے ہر یک خار سے مژگانِ عجز

وہ جہاں مسند نشینِ بارگاہِ ناز ہو! — قامتِ خوباں ہے محرابِ نیازستانِ عجز

بسکہ بے پایاں ہے صحرائے محبت اے اسدؔ
گرد باد اس راہ کا ہے عقدۂ پیمانِ عجز

نہ بندھا تھا عدم نقشِ دلِ مور ہنوز — تب سے ہے یاں دہنِ یار کا مذکور ہنوز

صد تجلّی کدہ ہے صرفِ جبینِ غربت — پیرہن میں ہے غبارِ شررِ طُور ہنوز

پا پُر از آبلہ، راہِ طلبِ مے میں ہوا — ہاتھ آیا نہیں یک دانۂ انگور ہنوز

گُل کھلے، غنچے چٹکنے لگے، اور صبح ہوئی — سرخوشِ خواب ہے وہ نرگسِ مخمور ہنوز

اے اسدؔ، تیرگیٔ بختِ سیہ ظاہر ہے

نظر آتی نہیں صبح شبِ دیجور ہنوز

حاصلِ وابستگی ہے عمرِ کوتاہ اور بس
وقفِ عرضِ عقدہ ہائے متصل تارِ نفس

تیز تر ہوتا ہے خشمِ تندرویاں عجز سے
ہے رگِ سنگِ فسانِ تیغِ شعلہ خار و خس

سختیٔ راہِ محبت منع و خیلِ غیر ہے
پیچ و تابِ جادہ ہے یاں جوہرِ تیغِ عسس

اے اسدؔ ہم خود اسیرِ رنگ و بوئے باغ ہیں
ظاہرا صیادِ ناداں ہے گرفتارِ ہوس

دشتِ الفت میں ہے خاکِ کشتگاں محبوس و بس
پیچ و تابِ جادہ ہے خطِ کفِ افسوس و بس

ہے تصور میں نہاں سرمایۂ صد گلستاں
کاسۂ زانو ہے مجھ کو بیضۂ طاؤس و بس

کفر ہے، غیر از وفورِ شوق، رہبر خواستن
راہِ صحرائے حرم میں ہے جرسِ ناقوس و بس

یک جہاں گل تختۂ مشقِ شگفتن ہے اسدؔ
غنچۂ خاطر رہا افسردگی مانوس و بس

عشاق اشکِ چشم سے دھوویں ہزار داغ
دیتا ہے اور جوں گل و شبنم بہارِ داغ

جوں اعتمادِ نامہ و خط کا ہو مُہر سے
یوں عاشقوں میں ہے سببِ اعتبار داغ

ہوتے ہیں نسبت جلوۂ خور سے ستارگاں
دیکھ اس کو دل سے مٹ گئے بے اختیار داغ

وقتِ خیالِ جلوۂ حُسنِ بتاں اسدؔ
دکھلائے ہے مجھے دو جہاں لالہ زار داغ

بلبلوں کو دُور سے کرتا ہے منعِ بارِ باغ
ہے زبانِ پاسباں خارِ سرِ دیوارِ باغ

کون آیا جو چمن بیتابِ استقبال ہے — جنبشِ موجِ صبا ہے شوخیِ رفتارِ باغ
کون گُل سے ضعف و خاموشیِ بلبل کہہ سکے — نے زبانِ غنچہ گویا نے زبانِ خارِ باغ

جوشِ گُل کرتا ہے استقبالِ تحریرِ اسدؔ
زیرِ مشقِ شعر ہے نقش از پئے احضارِ باغ

عیسیٰ مہرباں ہے شفا ریز یک طرف — دردآفریں ہے طبعِ الم خیز یک طرف
سنجیدگی ہے ایک طرف رنجِ کوہکن — خوابِ گرانِ خسرو و پرویز یک طرف
خرمن بباد دادہ دعوے ہیں، ہو سو ہو — ہم اک طرف ہیں برقِ شرربیز یک طرف
ہر مُو بدن پہ شہپرِ پرواز ہے مجھے! — بیتابیِ دلِ تپش انگیز یک طرف

یک جانب اے اسدؔ شبِ فرقت کا بیم ہے
دامِ ہوس ہے زُلفِ دلآویز یک طرف

بدر ہے آئینۂ طاقِ ہلال — غافلاں! نقصاں سے پیدا ہے کمال
بسکہ ہے اصلِ ومید نہا غبار — ہے نہالِ شکوۂ ریحاں سفال
نور سے نیرے ہے اس کی روشنی — ورنہ ہے خورشید یکدستِ سوال

ہو جو بلبل پیر و فکرِ اسدؔ
غنچۂ منقارِ گل ہو زیرِ بال

ازانجا کہ حسرت کشِ یار ہیں ہم — رقیبِ تمنائے دیدار ہیں ہم
رسیدن گلِ باغ واماندگی ہے — عبث محفل آرائے رفتار ہیں ہم

نفس ہو نہ معزولِ شعلہ دُرُودن | کہ ضبطِ تپش سے شرر کار ہیں ہم
تغافل کمینگاہِ وحشت شناسی | نگہبان ولہائے اغیار ہیں ہم
تماشائے گلشن تمنائے چیدن | بہار آفرینا! گنہگار ہیں ہم
نہ ذوقِ گریباں نہ پروائے داماں | نگاہ آشنائے گل و خار ہیں ہم

اسد! شکوہ کفر و دعا ناسپاسی
ہجومِ تمنّا سے لاچار ہیں ہم

ڈرتا ہوں کوچہ گردئ بازارِ عشق سے | ہیں خارِ راہ، جوہرِ تیغِ عسس تمام
اے بالِ اضطراب کہاں تک فسردگی | یک پر زدن تپش میں ہے کارِ قفس تمام
گذرا جو آشیاں کا تصوّر بوقتِ بند | مژگانِ چشمِ دام ہوئے خار و خس تمام

کرنے نہ پائے ضعف سے شورِ جنوں اسد
اب کی بہار کا یونہی گذرا برس تمام

سودائے عشق سے دمِ سردِ کشیدہ ہوں | شامِ خیالِ زلف سے صبحِ دمیدہ ہوں
کی متصل ستارہ شماری میں عمر صرف | تسبیحِ اشکہائے زمژگاں چکیدہ ہوں
ہوں گرمئ نشاطِ تصوّر سے نغمہ سنج | میں عندلیبِ گلشنِ ناآفریدہ ہوں
دیتا ہوں کشتگاں کو سخن سے سرِ تپش | مضرابِ تارہائے گلوئے بریدہ ہوں

جوں بوئے گل ہوں گرچہ گرانبارِ مشتِ زر
لیکن اسد بوقتِ گزشتن جریدہ ہوں

خون در جگر نہفتہ، بہ زردی رسیدہ ہوں
خود آشیانِ طائرِ رنگِ پریدہ ہوں

میں چشم وا کشادہ گلشن نظر فریب
لیکن عبث کہ شبنمِ خورشید دیدہ ہوں

تسلیم سے یہ نالۂ موزوں ہوا حصول
اے بے خبر! میں نغمۂ چنگِ خمیدہ ہوں

پیدا نہیں ہے اصلِ تگ و تازِ جستجو
مانندِ موجِ آب زبانِ بریدہ ہوں

سر پر مرے وبالِ ہزار آرزو رہا
یا رب میں کس غریب کا بختِ رمیدہ ہوں

میرا نیاز و عجز ہے مفتِ بتاں اسدؔ
یعنی کہ بندۂ بہ درم ناخریدہ ہوں

فتادگی میں قدم استوار رکھتے ہیں
برنگِ جادہ سرِ کوئے یار رکھتے ہیں

طلسمِ مستیٔ دل آں سوئے ہجومِ سرشک
ہم ایک میکدہ دریا کے پار رکھتے ہیں

ہوا ہے گریۂ بیباک ضبط سے تسبیح
ہزار دل پہ ہم اک اختیار رکھتے ہیں

جنونِ فرقتِ یارانِ رفتہ ہے غالبؔ
بسانِ دشت دلِ پُر غبار رکھتے ہیں

ضبط سے مطلب بجز وارستگی دیگر نہیں
دامنِ تمثال آبِ آئینہ سے تر نہیں

ہے وطن سے باہر اہلِ دل کی قدر و منزلت
عزلت آبادِ صدف میں قیمتِ گوہر نہیں

باعثِ ایذا ہے برہم خوردنِ بزمِ سرور
لختِ لختِ شیشۂ اشکستہ جز نشتر نہیں

ہے فلک بالا نشینِ فیضِ خم گردیدنی
عاجزی سے ظاہرا رتبہ کوئی برتر نہیں

کب تلک پھیرے اسدؔ لبہائے تفتہ پر زباں

طاقتِ لب تشنگی اے ساقیِ کوثر نہیں

خلق ہے صفحۂ عبرت سے سبق ناخواندہ — ورنہ ہے چرخ و زمیں یک ورقِ گرداندہ
میکدے میں ز دل افسردگی بادہ کشاں — موجِ مے مثلِ خطِ جام ہے ہر جا ماندہ
خواہشِ دل ہے زباں کو سببِ گفت بیاں — ہے سخن گرد ز دامانِ ضمیر افشاندہ
کوئی آگاہ نہیں باطنِ ہم دیگر سے — ہے ہر اک فردِ جہاں میں ورقِ ناخواندہ

جیف بیجا صلیِ اہلِ ریا پر غالب
یعنی ہیں ماندہ زآنسو و ازیں سو رانده

شکوہ و شکر کو ثمر بیم و امید کا سمجھ — خانۂ آگہی خراب، دل نہ سمجھ بلا سمجھ
وحشتِ دردِ بیکسی بے اثر اس قدر نہیں — رشتۂ عمرِ خضر کو نالۂ نارسا سمجھ
گاہ بہ خلد امید وار گہ بہ جحیم بیمناک — گرچہ خدا کی یاد ہے کلفتِ ماسوا سمجھ
اے بہ سرابِ حسنِ خلق تشنۂ سعیِ امتحاں — شوق کو منفعل نہ کر ناز کو التجا سمجھ
ہے خطِ عجز ما و تو، اوّل درسِ آرزو — ہے یہ سیاقِ گفتگو کچھ نہ سمجھ فنا سمجھ
نغمہ ہے محوِ ساز رہ، نشہ ہے بے نیاز رہ — رندِ تمام ناز رہ، خلق کو پارسا سمجھ
نے سر و برگِ آرزو، نے رہ و رسمِ گفتگو — اے دل و جانِ خلق تو ہم کو بھی آشنا سمجھ

لغزشِ پا کو ہے بلد، نغمہ یا علی مدد
ٹوٹے گر آئینہ اسد سبحہ کو خوں بہا سمجھ

بسکہ چشم از انتظارِ خوش خطاں بے نور ہے — یک قلم شاخِ گلِ نرگس عصائے کور ہے

ہے عجب مردوں کو غفلت ہائے اہلِ دہر پر — سبزہ جوں انگشتِ حیرت در دہانِ گور ہے
حسرت آبادِ جہاں میں ہے الم غم آفریں — نوحہ گویا، خار زارِ نالۂ رنجور ہے
کیا کروں غمہائے پنہاں لے گئے صبر و قرار — دزد گر ہو خانگی تو پاسباں مجبور ہے

ہے وہاں تکلیفِ عرضِ بے دماغی اور اسدؔ
یاں صریرِ خامہ مجھ کو نالۂ رنجور ہے

بہ سر نوشت میں میری ہے اشک افشانی — کہ موجِ آب ہے ہر ایک چینِ پیشانی
لبِ نگار میں آئینہ دیکھ آبِ حیات — بہ گمرہی سکندر ہے محوِ حیرانی
کہوں وہ مصرعِ برجستہ وصفِ قامت میں — کہ سرو ہو نہ سکے اس کا مصرعِ ثانی

اسدؔ نے کثرتِ دلہائے خلق سے جانا
کہ زلفِ یار ہے مجموعۂ پریشانی

ہوا جب حسن کم، خط بر عذارِ سادہ آتا ہے — کہ بعد از صاف ہے ساغر میں دُرد و بادہ آتا ہے
محیطِ دہر میں بالیدن از ہستی گزشتن ہے — کہ یاں ہر اک حباب آسا شکست آمادہ آتا ہے
دیارِ عشق میں جاتا ہے جو سوداگری ساماں — متاعِ زندگانی ہا بہ غارت دادہ آتا ہے

اسدؔ وارستگاں باوصفِ ساماں بے تعلق ہیں
صنوبر گلستاں میں با دلِ آزادہ آتا ہے

خبر نگہ کو نگہ چشم کو عدو جانے — وہ جلوہ کر کہ نہ میں جانوں اور نہ تو جانے
نفس بہ نالہ رقیب و نگہ بہ اشک عدو — زیادہ اس سے گرفتار ہوں کہ تو جانے

جنونِ فسردۂ تمکیں ہے، کاش، عہدِ وفا　　گدازِ حوصلہ کو پاسِ آبرو جانے
زباں سے عرضِ تمنائے خامشی معلوم　　مگر، وہ خانہ بر اندازِ گفتگو جانے

مسیح کشتۂ الفت ببر علی خاں ہے
کہ جو اسدؔ تپشِ نبضِ آرزو جانے

صبح سے معلوم آثارِ ظہورِ شام ہے　　غافلاں! آغازِ کار آئینۂ انجام ہے
بسکہ تیرے جلوۂ دیدار کا ہے اشتیاق　　ہر بُتِ خورشید طلعت آفتابِ بام ہے
کیا کمالِ عشق نقص آبادِ گیتی میں ملے　　پختگی ہائے تصوّر یاں خیالِ خام ہے

ہو جہاں وہ ساقیِ خورشید رُو مجلس فروز
واں اسدؔ! تارِ شعاعِ مہر خطِّ جام ہے

اے خوشا وقتے! کہ ساقی یک خمستاں وا کرے
تار و پودِ فرشِ محفل پنبۂ مینا کرے

یک ورے بر روئے رحمت بستہ وورِ شش جہت
نا امیدی ہے خیالِ خانہ ویراں کیا کرے

ناتوانی سے نہیں سر در گریبانی اسدؔ
ہوں سراپا یک قلم تسلیم جو مولا کرے

م　توڑ بیٹھے جب کہ ہم جام و سبو پھر ہم کو کیا
آسماں سے بادۂ گلفام گو برسا کرے

بہ رہنِ ضبط ہے آئینہ بندیٔ گوہر — وگرنہ بحر میں ہر قطرہ چشمِ پُرنم ہے
اگر نہ ہووے رگِ خواب صرفِ شیرازہ — تمام دفترِ ربطِ مزاج برہم ہے

اسدؔ بہ نازکیٔ طبعِ آرزو، انصاف
کہ ایک وہمِ ضعیف و غمِ دو عالم ہے

تا چند نازِ مسجد و بتخانہ کھینچیے — جوں شمع دل بہ خلوتِ جانانہ کھینچیے
عجز و نیاز سے تو نہ آیا وہ راہ پر — دامن کو آج اُس کے حریفانہ کھینچیے

ہے ذوقِ گریہ عزمِ سفر کیجیے اسدؔ
رختِ جنونِ سیل بہ ویرانہ کھینچیے

کاشانۂ ہستی کہ برانداختنی ہے — یاں سوختنی چارہ گرِ ساختنی ہے
ہے شعلۂ شمشیرِ فنا حوصلہ افگار — اے داغِ تمنّا! سپر انداختنی ہے

ہے سادگیٔ ذہن تمنائے تماشا
جائے کہ اسدؔ رنگِ چمن باختنی ہے

گدائے طاقتِ تقریر ہے زباں تجھ سے — کہ خامشی کو ہے پیرایۂ بیاں تجھ سے
فسردگی میں ہے فریادِ بیدلاں تجھ سے — چراغِ صبح و گلِ موسمِ خزاں تجھ سے
طراوتِ سحر ایجادیٔ اثر، یک سو — بہارِ نالہ و رنگینیٔ فغاں تجھ سے
نیاز پردۂ اظہارِ خود پرستی ہے — جبینِ سجدہ فشاں تجھ سے آستاں تجھ سے
بہانہ جوئیٔ رحمت کمیں گرِ تقریب — وفائے حوصلہ و رنجِ امتحاں تجھ سے

اسدؔ! بہ موسمِ گُل در طلسمِ کنجِ قفس
خرام تجھ سے، صبا تجھ سے، گلستاں تجھ سے

خدایا دل کہاں تک دن بصد رنج و تعب کاٹے
خمِ گیسو ہو شمشیرِ سیہ تاب اور شب کاٹے

کریں گر قدرِ اشکِ دیدۂ عاشق خود آرایاں
صدف دندانِ گوہر سے بہ حسرت اپنے لب کاٹے

دریغا وہ مریضِ غم کہ فرطِ ناتوانی سے
بہ قدرِ یک نفس جا وہ بہ صد رنج و تعب کاٹے

یقیں ہے آدمی کو دستگاہِ فقر حاصل ہو
دمِ تیغِ توکّل سے اگر پائے سبب کاٹے

اسدؔ مجھ میں ہے اُس کے بوسۂ پا کی کہاں جرأت
کہ میں نے دست و پا باہم بہ شمشیرِ ادب کاٹے

رنجشِ یار مہرباں، عیش و طرب کا ہے نشاں
دل سے اُٹھے ہے جو غبار گردِ سوادِ باغ ہے

شعر کی فکر کو اسدؔ! چاہیئے ہے دل و دماغ
عذر، کہ یہ فسردہ دل بے دل و بے دماغ ہے

جُرعات

پھر وہ سوئے چمن آتا ہے خدا خیر کرے — رنگ اڑتا ہے گلستاں کے ہواداروں کا

یہ یادِ قامت اگر ہو بلند آتشِ غم — ہر ایک داغِ جگر آفتابِ محشر ہو
ستم کشی کا کیا دل نے حوصلہ پیدا — اب اس سے ربط کروں جو بہت ستمگر ہو

جامِ ہر ذرّہ ہے سرشارِ تمنّا مجھ سے — کس کا دل ہوں کہ دو عالم سے لگایا ہے مجھے

ہزار قافلۂ آرزو بیاباں مرگ — ہنوز محملِ حسرت بہ دوشِ خود رائی

جس طرف سے آئے ہیں آخر ادھر ہی جائینگے — مرگ سے وحشت نہ کر راہِ عدم پیمودہ ہے

رباعی

مشکل ہے زبس کلام میرا اے دل — سُن سُن کے اسے ملول ہوتے ہیں جاہل
آساں کہنے کی کرتے ہیں فرمائش — گویم مُشکل وگرنہ گویم مُشکل

بادۂ نیم رس

غزلیات

نقش فریادی ہے کس کی شوخیِ تحریر کا — کاغذی ہے پیرہن ہر پیکرِ تصویر کا
کاوِ کاوِ سخت جانیہائے تنہائی نہ پوچھ — صبح کرنا شام کا لانا ہے جوئے شیر کا

جذبۂ بے اختیارِ شوق دیکھا چاہیے — سینۂ شمشیر سے باہر ہے دم شمشیر کا
آگہی دامِ شنیدن جسقدر چاہے بچھائے — مدّعا عنقا ہے اپنے عالمِ تقریر کا

بسکہ ہوں غالب اسیری میں بھی آتش زیرِ پا
موئے آتش دیدہ ہے حلقہ میری زنجیر کا

شمارِ سبحہ مرغوبِ بتِ مشکل پسند آیا — تماشائے بیک کف بُردنِ صد دل پسند آیا
بہ فیضِ بیدلی نومیدیِ جاوید آساں ہے — کشائش کو ہمارا عقدۂ مشکل پسند آیا
ہوائے سیرِ گل آئینۂ بے مہریِ قاتل — کہ اندازِ بخوں غلطیدنِ بسمل پسند آیا

جرأت تحفہ، الماس ارمغاں داغِ جگر ہدیہ
مبارکباد اسدؔ غمخوارِ جانِ دردمند آیا

جز قیس اور کوئی نہ آیا بروئے کار — صحرا مگر بہ تنگیِ چشمِ حسود تھا
آشفتگی نے نقشِ سویدا کیا درست — ظاہر ہُوا کہ داغ کا سرمایہ دُود تھا
تھا خواب میں خیال کو تجھ سے معاملہ — جب آنکھ کھل گئی نہ زیاں تھا نہ سُود تھا
پوچھا تھا گرچہ یار نے احوالِ دل، مگر — کس کو دماغِ منتِ گفت و شنود تھا
ڈھانپا کفن نے داغِ عیوبِ برہنگی — میں ورنہ ہر لباس میں ننگِ وجود تھا
لیتا ہُوں مکتبِ غمِ دل میں سبق ہنوز — لیکن یہی کہ رفت گیا، اور، بود تھا

تیشے بغیر مر نہ سکا کوہکن اسدؔ
سرگشتۂ خمارِ رسوم و قیود تھا

کہتے ہو نہ دینگے ہم دل اگر پڑا پایا — دِل کہاں کہ گُم کیجئے، ہم نے مدّعا پایا
عشق سے طبیعت نے زیست کا مزا پایا — درد کی دوا پائی، درد لا دوا پایا
شورِ پندِ ناصح نے زخم پر نمک چھڑکا — آپ سے کوئی پوچھے، تم نے کیا مزا پایا
ہے کہاں تمنّا کا دوسرا قدم یارب! — ہمنے دشتِ امکاں کو ایک نقشِ پا پایا
سادگی و پُرکاری، بیخودی و ہشیاری — حُسن کو تغافل میں جرأت آزما پایا
خاکبازیٔ امید کارخانۂ طفلی — یاس کو دو عالم سے لب بخندہ وا پایا
غنچہ پھر لگا کھلنے، آج ہم نے اپنا دل — خوں کیا ہُوا دیکھا، گم کیا ہُوا پایا

حالِ دل نہیں معلوم لیکن اس قدر یعنی
ہم نے بارہا ڈھونڈا، تم نے بارہا پایا

دوستدار دشمن ہے، اعتمادِ دل معلوم
آہ بے اثر دیکھی، نالہ نارسا پایا

شوق ہر رنگ رقیبِ سروساماں نکلا
قیس تصویر کے پردے میں بھی عریاں نکلا

ساغرِ جلوۂ سرشار ہے ہر ذرّۂ خاک
شوقِ دیدار بلا آئنہ ساماں نکلا

بوئے گُل، نالۂ دل، دُودِ چراغِ محفل
جو تری بزم سے نکلا۔ سو پریشاں نکلا

زخم نے داد نہ دی تنگیٔ دل کی یارب!
تیر بھی سینۂ بسمل سے پرافشاں نکلا

کچھ کھٹکتا تھا مرے سینے میں، لیکن آخر
جس کو دل کہتے تھے سو تیر کا پیکاں نکلا

دلِ حسرت زدہ تھا مائدۂ لذّتِ درد
کام یاروں کا بقدرِ لب و دنداں نکلا

تھی نو آموزِ فنا ہمّتِ دشوار پسند
سخت مشکل ہے کہ یہ کام بھی آساں نکلا

دل میں پھر گریہ نے اک شور اٹھایا غالبؔ
آہ جو قطرہ نہ نکلا تھا سو طوفاں نکلا

دہر میں نقشِ وفا وجہِ تسلّی نہ ہوا
ہے یہ وہ لفظ کہ شرمندۂ معنی نہ ہوا

سبزۂ خط سے ترا کاکلِ سرکش نہ دبا
یہ زمرّد بھی حریفِ دمِ افعی نہ ہوا

میں نے چاہا تھا کہ اندوہِ وفا سے چھوٹوں
وہ ستمگر مرے مرنے پہ بھی راضی نہ ہوا

دل گذرگاہِ خیالِ مے و ساغر ہی سہی
گر نفس جادۂ سر منزلِ تقویٰ نہ ہوا

ہوں ترے وعدہ نہ کرنے پہ بھی راضی کہ کبھی
گوش منت کشِ گلبانگِ تسلّی نہ ہوا

کس سے محرومیِ قسمت کی شکایت کیجیے — ہم نے چاہا تھا کہ مر جائیں سو وہ بھی نہ ہُوا

مر گیا صدمۂ یک جنبشِ لب سے غالبؔ
ناتوانی سے حریفِ دمِ عیسیٰ نہ ہُوا

جب بتقریبِ سفر یار نے محمل باندھا — تپشِ شوق نے ہر ذرّے پہ اک دل باندھا
اہلِ بینش نے بہ حیرت کدۂ شوخیِ ناز — جوہرِ آئینہ کو طوطیِ بسمل باندھا
یاس و امید نے یک عربدہ میداں مانگا — عجزِ ہمّت نے طلسمِ دلِ سائل باندھا
یار نے تشنگیِ شوق کے مضموں چاہے — ہم نے دل کھول کے دریا کو بھی ساحل باندھا

مطربِ دل نے مرے تارِ نفس سے غالبؔ
ساز پر رشتہ پئے نغمۂ بیدلؔ باندھا

پئے نذرِ کرم تحفہ ہے شرمِ نارسائی کا — بخوں غلطیدۂ صد رنگ دعویٰ پارسائی کا
نہ ہو حسنِ تماشا دوست رسوا بیوفائی کا — بہ مہرِ صد نظر ثابت ہے دعویٰ پارسائی کا
زکوٰۃِ حسن دے، اے جلوۂ بینش کہ مہر آسا — چراغِ خانۂ درویش ہے کاسہ گدائی کا
نہ مارا جان کر بے جرم، قاتل تیری گردن پر — رہا مانندِ خونِ بے گنہ حق آشنائی کا
دہانِ ہر بتِ پیغارہ جو زنجیرِ رسوائی — عدم تک بیوفا چرچا ہے تیری بیوفائی کا
تمنائے زباں محوِ سپاسِ بے زبانی ہے — مٹا جس سے تقاضا شکوۂ بیدست و پائی کا
وہی اک بات ہے جو یاں نفس واں نکہتِ گل ہے — چمن کا جلوہ باعث ہے مری رنگیں نوائی کا

نہ دے نامے کو اتنا طول غالبؔ مختصر لکھ دے

کہ حسرت سنج ہوں عرضِ ستمہائے جدائی کا

شب خمارِ شوقِ ساقی رستخیز اندازہ تھا — تا محیطِ بادہ صورتِ خانۂ خمیازہ تھا
یک قلم وحشت سے درسِ دفترِ امکاں کھلا — جادہ اجزائے دوعالم دشت کا شیرازہ تھا
مانعِ وحشت خرامیہائے لیلیٰ کون ہے؟ — خانۂ مجنونِ صحرا گرد بے دروازہ تھا
پوچھ مت رسوائیِ اندازِ استغنائے حسن — دستِ مرہونِ حنا رخسار رہنِ غازہ تھا

نالۂ دل نے دیئے اوراقِ لختِ دل بہ باد
یادگارِ نالہ اک دیوانِ بے شیرازہ تھا

وہ مری چینِ جبیں سے غمِ پنہاں سمجھا — رازِ مکتوب بہ بے ربطیٔ عنواں سمجھا
یک الف بیش نہیں صیقلِ آئینہ ہنوز — چاک کرتا ہوں میں جب سے کہ گریباں سمجھا
شرحِ اسبابِ گرفتاریِ خاطر مت پوچھ — اس قدر تنگ ہوا کہ میں زنداں سمجھا
ہم نے وحشت کدۂ بزمِ جہاں میں جوں شمع — شعلۂ عشق کو اپنا سر و ساماں سمجھا
تھا گریزاں مژۂ یار سے دل تا دمِ مرگ — دفعِ پیکانِ قضا اس قدر آساں سمجھا
عجز سے اپنے یہ جانا کہ وہ بدخو ہوگا — نبضِ خس سے تپشِ شعلۂ سوزاں سمجھا
بدگمانی نے نہ چاہا اُسے سرگرمِ خرام — رُخ پہ ہر قطرہ عرق دیدۂ حیراں سمجھا

دل دیا جان کے کیوں اس کو وفادار اسدؔ
غلطی کی کہ جو کافر کو مسلماں سمجھا

گلہ ہے شوق کو دل میں بھی تنگیِ جا کا — گہر میں محو ہوا اضطراب دریا کا

یہ جانتا ہوں کہ تو اور پاسخِ مکتوب
مگر ستم زدہ ہوں ذوقِ خامہ فرسا کا

غمِ فراق میں تکلیفِ سیرِ باغ نہ دو
مجھے دماغ نہیں خندہ ہائے بیجا کا

نہ کہہ کہ گریہ بمقدارِ حسرتِ دل ہے
مری نگاہ میں ہے جمع و خرچ دریا کا

دل اس کو پہلے ہی ناز و ادا سے دے بیٹھے
ہمیں دماغ کہاں حسن کے تقاضا کا

حنائے پائے خزاں ہے بہار اگر ہے یہی
دوامِ کلفتِ خاطر ہے عیشِ دنیا کا

ہنوز محرمیِ حسن کو ترستا ہوں
کرے ہے ہر بنِ مو کام چشمِ بینا کا

فلک کو دیکھ کے کرتا ہوں اس کو یاد اسدؔ
جفا میں اُس کی ہے انداز کار فرما کا

اب میں ہوں اور ماتمِ یک شہرِ آرزو
توڑا جو تو نے آئینہ تمثال دار تھا

دیکھی وفائے فرصتِ رنج و نشاطِ دہر
خمیازہ یک درازیِ عمرِ خمار تھا

موجِ سرابِ دشتِ وفا کا نہ پوچھ حال
ہر ذرہ مثلِ جوہرِ تیغ آبدار تھا

ایک ایک قطرے کا مجھے دینا پڑا حساب
خونِ جگر ودیعتِ مژگانِ یار تھا

گلیوں میں میری نعش کو کھینچے پھرو کہ میں
جاں دادۂ ہوائے سرِ رہگذار تھا

کم جانتے تھے ہم بھی غمِ عشق کو پر اب
دیکھا تو کم ہوئے پہ غمِ روزگار تھا

سراپا رہنِ عشق و ناگزیرِ الفتِ ہستی
عبادت برق کی کرتا ہوں اور افسوس حاصل کا

بقدرِ ظرف ہے ساقی خمارِ تشنہ کامی بھی
جو تو دریائے مے ہے تو میں خمیازہ ہوں ساحل کا

مجھے راہِ سخن میں خوفِ گمراہی نہیں غالبؔ
عصائے خضرِ صحرائے سخن ہے خامہ بیدل کا

لبِ خشک در تشنگی مردگاں کا
زیارت کدہ ہوں دل آزردگاں کا

سراپا یک آئینہ دارِ شکستن
ارادہ ہوں یک عالم افسردگاں کا

ہمہ نا امیدی ہمہ بدگمانی
میں دل ہوں فریبِ وفا خوردگاں کا

بصورت تکلف بمعنی تاسف
اسدؔ میں تبسم ہوں پژمردگاں کا

ضعفِ جنوں کو وقتِ تپش در بھی دُور تھا
اک گھر میں مختصر سا بیاباں ضرور تھا

اے وائے غفلتِ نگہِ شوق ورنہ یاں
ہر پارہ سنگ لختِ دلِ کوہِ طور تھا

درسِ تپش ہے برق کو اب اس کے نام سے
وہ دل ہے یہ کہ جس کا تخلص صبور تھا

آئینہ دیکھ اپنا سا منہ لے کے رہ گئے
صاحب کو دل نہ دینے پہ کتنا غرور تھا

قاصد کو اپنے ہاتھ سے گردن نہ ماریئے
اس کی خطا نہیں ہے یہ میرا قصور تھا

ہر رنگ میں جلا اسدؔ فتنہ انتظار
پروانۂ تجلیِ شمعِ ظہور تھا

حریفِ جوششِ دریا نہیں خودداریِ ساحل
جہاں ساقی ہو تو باطل ہے دعویٰ ہوشیاری کا

لطافت بے کثافت جلوہ پیدا کر نہیں سکتی
چمن زنگار ہے آئینۂ بادِ بہاری کا

اسدؔ ساغر کشِ تسلیم ہو گردش سے گردوں کی
کہ ننگِ فہمِ مستاں ہے گلہ بد روزگاری کا

غافل بوہمِ ناز خود آرا ہے ورنہ یاں
بے شانۂ صبا نہیں طرّہ گیاہ کا

بزمِ قدح سے عیشِ تمنا نہ رکھ کہ رنگ
صیدِ ز دام جستہ ہے اِس دام گاہ کا

جان در ہوائے یک نفسِ گرم ہے اسدؔ
پروانہ ہے وکیل ترے داد خواہ کا

رحمت اگر قبول کرے کیا بعید ہے
شرمندگی سے عذر نہ کرنا گناہ کا

مقتل کو کس نشاط سے جاتا ہوں میں کہ ہے
پُر گل خیالِ زخم سے دامن نگاہ کا

خود پرستی سے رہے باہم دگر نا آشنا
بیکسی میری شریک آئینہ تیرا آشنا

ربطِ یک شیرازۂ وحشت ہیں اجزائے بہار
سبزہ بیگانہ، صبا آوارہ، گل نا آشنا

ذرہ ذرہ ساغرِ میخانۂ نیرنگ ہے
گردشِ مجنوں بہ چشمک ہائے لیلیٰ آشنا

کوہکن نقاشِ یک تمثالِ شیریں تھا اسدؔ
سنگ سے سر مار کر ہووے نہ پیدا آشنا

رشک کہتا ہے کہ اس کا غیر سے اخلاص حیف
عقل کہتی ہے کہ وہ بے مہر کس کا آشنا

شوق ہے ساماں طرازِ نازشِ اربابِ عجز
ذرہ صحرا دستگاہ و قطرہ دریا آشنا

میں اور اک آفت کا ٹکڑا وہ دلِ وحشی کہ ہے
عافیت کا دشمن اور آوارگی کا آشنا

شکوہ سنجِ رنگ ہم دیگر نہ رہنا چاہیے
میرا زانو مونس اور آئینہ تیرا آشنا

یک ذرّہ زمین نہیں بیکار باغ کا
یاں جادہ بھی فتیلہ ہے لالے کے داغ کا

بے مے کسے ہے طاقتِ آشوبِ آگہی؟
کھینچا ہے عجزِ حوصلہ نے خطِ ایاغ کا

تازہ نہیں ہے نشۂ فکرِ سخن مجھے
تریاکیِ قدیم ہوں دودِ چراغ کا

بے خونِ دل ہے چشم میں موجِ نگہ غبار
یہ میکدہ خراب ہے مے کے سراغ کا

باغِ شگفتہ تیرا بساطِ نشاطِ دل
ابرِ بہار خمکدہ کس کے دماغ کا

بلبل کے کاروبار پہ ہیں خندہ ہائے گل
کہتے ہیں جس کو عشق خلل ہے دماغ کا[۱]

سو بار بندِ عشق سے آزاد ہم ہوئے
پر کیا کریں کہ دل ہی عدو ہے فراغ کا

بسکہ دشوار ہے ہر کام کا آساں ہونا
آدمی کو بھی میسّر نہیں انساں ہونا

گریہ چاہے ہے خرابی مرے کاشانے کی
در و دیوار سے ٹپکے ہے بیاباں ہونا

وائے دیوانگیٔ شوق کہ ہر دم مجھ کو؟
آپ جانا ادھر اور آپ ہی حیراں ہونا

جلوہ ازبسکہ تقاضائے نگہ کرتا ہے
جوہرِ آئینہ بھی چاہے ہے مژگاں ہونا

عشرتِ قتل گہہ اہلِ تمنّا مت پوچھ
عیدِ نظارہ ہے شمشیر کا عُریاں ہونا

لے گئے خاک میں ہم داغِ تمنائے شباب
تو ہو اور آپ بصد رنگ گلستاں ہونا

عشرتِ پارۂ دل زخمِ تمنا کھانا
لذّتِ ریشِ جگر غرقِ نمکداں ہونا

کی مرے قتل کے بعد اس نے جفا سے توبہ
ہائے اُس زود پشیماں کا پشیماں ہونا

۱؎ یہ شعر غالبؔ کے پہلے مطبوعہ دیوان میں نہیں۔ اور غالباً ۱۸۴۱ء کے بعد لکھا گیا۔

حیف اُس چار گرہ کپڑے کی قسمت غالبؔ
جس کی قسمت میں ہو عاشق کا گریباں ہونا

گر نہ اندوہِ شبِ فرقت بیاں ہو جائیگا
بے تکلف داغِ مہ مُہرِ دہاں ہو جائیگا

زہرہ گر ایسا ہی شامِ ہجر میں ہوتا ہے آب
پرتوِ مہتاب سیلِ خانماں ہو جائیگا

لے تو لُوں سوتے میں اسکے پاؤں کا بوسہ مگر
ایسی باتوں سے وہ کافر بدگماں ہو جائیگا

گر نگاہِ گرم فرماتی رہی تعلیمِ ضبط
شعلہ خس میں جیسے خوں رگ میں نہاں ہو جائیگا

فائدہ کیا سوچ آخر تو بھی ہے دانا اسدؔ
دوستی ناداں کی ہے جی کا زیاں ہو جائیگا

دل کو ہم صرفِ وفا سمجھے تھے کیا معلوم تھا
یعنی یہ پہلے ہی نذرِ امتحاں ہو جائیگا

سب کے دل میں ہے جگہ تیری جو تو راضی ہُوا
مجھ پہ گویا اک زمانہ مہرباں ہو جائیگا

باغ میں مجھ کو نہ لیجا ورنہ میرے حال پر
ہر گلِ تر ایک چشمِ خوں فشاں ہو جائیگا

وائے گر میرا ترا انصاف محشر میں نہ ہو
اب تلک تو یہ توقّع ہے کہ واں ہو جائیگا

پھر مجھے دیدۂ تر یاد آیا
دل جگر تشنۂ فریاد آیا

دم لیا تھا نہ قیامت نے ہنوز
پھر ترا وقتِ سفر یاد آیا

عذرِ واماندگی اے حسرتِ دل!
نالہ کرتا تھا جگر یاد آیا

سادگی ہائے تمنا یعنی
پھر وہ نیرنگِ نظر یاد آیا

کوئی ویرانی سی ویرانی ہے
دشت کو دیکھ کے گھر یاد آیا

آیا وہ جرأتِ فریاد کہاں
دِل سے تنگ آکے جگر یاد آیا

میں نے مجنوں پہ لڑکپن میں اسدؔ
سنگ اٹھایا تھا کہ سر یاد آیا

زندگی یوں بھی گذر ہی جاتی
کیوں ترا راہگذر یاد آیا

کیا ہی رضواں سے لڑائی ہوگی
گھر ترا خُلد میں گر یاد آیا

پھر ترے کوچے کو جاتا ہے خیال
دلِ گم گشتہ مگر یاد آیا

تو دوست کسی کا بھی ستمگر نہ ہُوا تھا
اوروں پہ ہے وہ ظلم کہ مجھ پر نہ ہُوا تھا

چھوڑا مہِ نخشب کی طرح دستِ قضا نے
خورشید ہنوز اُس کے برابر نہ ہُوا تھا

توفیق باندازۂ ہمّت ہے ازل سے
آنکھوں میں ہے وہ قطرہ کہ گوہر نہ ہُوا تھا

جب تک کہ نہ دیکھا تھا قدِ یار کا عالم
میں معتقدِ فتنۂ محشر نہ ہُوا تھا

میں سادہ دِل آزردگیٔ یار سے خوش ہُوں
یعنی سبقِ شوقِ مکرّر نہ ہُوا تھا

دریائے معاصی تنک آبی سے ہُوا خشک
میرا سرِ دامن بھی ابھی تر نہ ہُوا تھا

جاری تھی اسدؔ داغِ جگر سے مرے تحصیل
آتشکدہ جاگیرِ سمندر نہ ہُوا تھا

شب کہ وہ مجلس فروزِ خلوتِ ناموس تھا
رشتۂ ہر شمع خارِ کسوتِ فانوس تھا

حاصلِ الفت نہ دیکھا جز شکستِ آرزو
دِل بدِل پیوستہ گویا یک لبِ افسوس تھا

کیا کہوں بیماریٔ غم کی فراغت کا بیاں
جو کہ کھایا خونِ دِل بے منتِ کیموس تھا

مشہدِ عاشق سے کوسوں تک جو اُگتی ہے حنا
کسقدر یارب ہلاکِ حسرتِ پا بوس تھا

م

گلشن میں بندوبست برنگِ دگر ہے آج
قمری کا طوق حلقۂ بیرونِ در ہے آج

م

آتا ہے ایک پارۂ دل ہر فغاں کے ساتھ
تارِ نفس کمندِ شکارِ اثر ہے آج

اے عافیت کنارہ کر اے انتظام چل!
سیلابِ گریہ درپئے دیوار و در ہے آج

دُور اوفتادۂ چمنِ فکر ہے اسدؔ
مرغِ خیالِ بلبلِ بے بال و پر ہے آج

نفس نہ انجمنِ آرزو سے باہر کھینچ
اگر شراب نہیں انتظارِ ساغر کھینچ

کمالِ گرمئ سعئ تلاشِ دید نہ پوچھ
برنگِ خار مرے آئینے سے جوہر کھینچ

نہ کہہ کہ طاقتِ رسوائیٔ وصال نہیں
اگر یہی عرقِ فتنہ ہے مکرّر کھینچ

تجھے بہانۂ راحت ہے انتظار اے دل!
کیا ہے کس نے اشارہ کہ نازِ بستر کھینچ

بہ نیم غمزہ ادا کر حقِ ودیعتِ ناز
نیامِ پردۂ زخمِ جگر سے خنجر کھینچ

مرے قدح میں ہے صہبائے آتشِ پنہاں
بروئے سفرہ کبابِ دلِ سمندر کھینچ

نہ کی طرف ہے بہ حسرت نظارۂ نرگس
بکوریٔ دل و چشمِ رقیب ساغر کھینچ

خمارِ منتِ ساقی اگر یہی ہے اسدؔ
دلِ گداختہ کے میکدے میں ساغر کھینچ

بلا سے ہیں جو یہ پیشِ نظر در و دیوار
نگاہِ شوق کو ہیں بال و پر در و دیوار

وفورِ اشک نے کاشانے کا کیا یہ رنگ
کہ ہو گئے مرے دیوار و در در و دیوار

نہیں ہے سایہ کہ سن کر نویدِ مقدمِ یار
گئے ہیں چند قدم پیشتر در و دیوار

ہوئی ہے کس قدر ارزانیٔ مئے جلوہ
کہ مست ہے ترے کوچے میں ہر در و دیوار

جو ہے تجھے سرِ سودائے انتظار تو آ
کہ ہیں دکانِ متاعِ نظر در و دیوار

ہجومِ گریہ کا سامان کب کیا میں نے
کہ گر پڑے نہ مرے پاؤں پر در و دیوار

وہ آ رہا مرے ہمسائے میں تو سائے سے
ہوئے فدا در و دیوار پر در و دیوار

نہ پوچھ بیخودیِ عیشِ مقدمِ سیلاب
کہ ناچتے ہیں پڑے سر بسر در و دیوار

نظر میں کھٹکے ہے بن تیرے گھر کی آبادی
ہمیشہ روتے ہیں ہم دیکھ کر در و دیوار

نہ کہہ کسی سے کہ غالب نہیں زمانے میں
حریفِ رازِ محبت مگر در و دیوار

لرزتا ہے مرا دل زحمتِ مہرِ درخشاں پر
میں ہوں وہ قطرۂ شبنم کہ ہو خارِ بیاباں پر

نہ چھوڑی حضرتِ یوسف نے یاں بھی خانہ آرائی
سفیدی دیدۂ یعقوب کی پھرتی ہے زنداں پر

فنا تعلیمِ درسِ بیخودی ہوں اس زمانے سے
کہ مجنوں لام الف لکھتا تھا دیوارِ دبستاں پر

فراغت کس قدر رہتی مجھے تشویشِ مرہم سے
بہم گر صلح کرتے پارہ ہائے دل نمکداں پر

نہیں اقلیمِ الفت میں کوئی طومارِ ناز ایسا
کہ پشتِ چشم سے جس کے نہ ہووے مہر عنواں پر

مجھے اب دیکھ کر ابرِ شفق آلودہ یاد آیا
کہ فرقت میں تری آتش برستی تھی گلستاں پر

بجز پروازِ شوقِ ناز کیا باقی رہا ہوگا
قیامت اک ہوائے تند ہے خاکِ شہیداں پر

م

نہ لڑ ناصح سے غالبؔ کیا ہوا گر اس نے شدّت کی
ہمارا بھی تو آخر زور چلتا ہے گریباں پر

بہ رنگِ کاغذِ آتش زدہ نیرنگِ بیتابی
ہزار آئینہ دل باندھے ہے بالِ یک تپیدن پر

میں اور وہ بے سبب رنج آشنا دشمن کہ رکھتا ہے
شعاعِ مہر سے تہمت نگہ کی چشمِ روزن پر

اسدؔ بسمل ہے کس انداز کا۔ قاتل سے کہتا ہے
کہ مشقِ ناز کر خونِ دو عالم میری گردن پر

جنوں کی دستگیری کس سے ہو گر ہو نہ عُریانی
گریباں چاک کا حق ہو گیا ہے میری گردن پر

فلک سے ہمکو عیشِ رفتہ کا کیا کیا تقاضا ہے
متاعِ بردہ کو سمجھے ہوئے ہیں قرض رہزن پر

فنا کو سونپ اگر مشتاق ہے اپنی حقیقت کا
فروغِ طالعِ خاشاک ہے موقوف گلخن کا

حریفِ مطلبِ مشکل نہیں فسونِ نیاز
دعا قبول ہو یارب کہ عُمرِ خضر دراز

نہ ہو بہ ہرزہ بیاباں نوردِ وہمِ وجود
ہنوز تیرے تصوّر میں ہے نشیب و فراز

وصالِ جلوہ تماشا ہے پر دماغ کہاں
کہ دیجے آئینۂ انتظار کو پرواز

اسدؔ سے ترکِ وفا کا گماں وہ معنی ہے
کہ کھینچیے پرِ طائر سے صورتِ پرواز

زبسکہ جلوۂ صیاد حیرت آرا ہے
اُڑی ہے صفحۂ خاطر سے صورتِ پرواز

ہجومِ فکر سے دل مثلِ موج لرزے ہے
کہ شیشہ نازک و صہبائے آبگینہ گداز

ہر ایک ذرّۂ عاشق ہے آفتاب پرست
گئی نہ خاک ہوئے پر ہوائے جلوۂ ناز

نہ پوچھ وسعتِ مے خانۂ جنوں غالبؔ

جہاں یہ کاسۂ گردوں ہے ایک خاک انداز

نہ گلِ نغمہ ہوں نہ پردۂ ساز
میں ہوں اپنی شکست کی آواز

تو اور آرائشِ خمِ کاکل
میں اور اندیشہ ہائے دور و دراز

لافِ تمکیں فریبِ سادہ دلی
ہم ہیں اور راز ہائے سینہ گداز

ہوں گرفتارِ الفتِ صیاد
ورنہ باقی ہے طاقتِ پرواز

وہ بھی دن ہو کہ اُس ستمگر سے
ناز کھینچوں بجائے حسرتِ ناز

نہیں دل میں مرے وہ قطرۂ خون
جس سے مژگاں ہوئی نہ ہو گلباز

اے ترا جلوہ یک قلم انگیز
اے ترا ظلم سر بسر انداز

تو ہوا جلوہ گر مبارک ہو!
ریزشِ سجدۂ جبینِ نیاز

مجھ کو پوچھا تو کچھ غضب نہ ہوا
میں غریب اور تو غریب نواز

اسد اللہ خاں تمام ہوا

م

اے دریغا وہ رندِ شاہد باز!

رُخِ نگار سے ہے سوزِ جاودانیٔ شمع
ہوئی ہے آتشِ گل آبِ زندگانیٔ شمع

زبانِ اہلِ زباں میں ہے مرگ خاموشی
یہ بات بزم میں روشن ہوئی زبانیٔ شمع

کرے ہے حرف بہ ایمائے شعلہ قصہ تمام
بہ طرزِ اہلِ فنا ہے فسانہ خوانیٔ شمع

غم اُس کو حسرتِ پروانہ کا ہے اے شعلہ
ترے لرزنے سے ظاہر ہے ناتوانیٔ شمع

ترے خیال سے روح اہتزاز کرتی ہے
بجلوہ ریزیٔ باد و بہ پرفشانیٔ شمع

نشاطِ داغِ غمِ عشق کی بہار نہ پوچھ
شگفتگی ہے شہیدِ گلِ خزانی شمع

جلے ہے دیکھ کے بالینِ یار پر مجھ کو
نہ کیوں ہو دل پہ مرے داغِ بدگمانی شمع

نامہ بھی لکھتے ہیں تو بخطِ غبار حیف
رکھتے ہیں مجھ سے اتنی کدورت ہزار حیف

بیمِ رقیب سے نہیں کرتے وداعِ ہوش
مجبوریاں تلک ہوئے اے اختیار حیف

بنبش از نفس بتاں کے کرم نے وفا نہ کی
تھا محملِ نگاہ بہ دوشِ شرار حیف

تھی میرے ہی جلانے کو اے آہِ شعلہ ریز
گھر پر پڑا نہ غیر کے کوئی شرار حیف

جلتا ہے دل کہ کیوں نہ ہم اک بار جل گئے
اے ناتمامیٔ نفسِ شعلہ بار حیف

زخم پر چھڑکیں کہاں طفلانِ بے پروا نمک
کیا مزا ہوتا اگر پتھر میں بھی ہوتا نمک

گردِ راہِ یار ہے سامانِ نازِ زخمِ دل
ورنہ ہوتا ہے جہاں میں کس قدر پیدا نمک

شورِ جولاں تھا کنارِ بحر پر کس کا؟ کہ آج
گردِ ساحل ہے بزخمِ موجۂ دریا نمک

مجھ کو ارزانی رہے، تجھ کو مبارک ہو جیو
نالۂ بلبل کا درد اور خندۂ گل کا نمک

چھوڑ کر جانا تنِ مجروحِ عاشق حیف ہے
دل طلب کرتا ہے زخم اور مانگیں ہیں اعضا نمک

غیر کی منت نہ کھینچوں گا پئے توقیرِ درد
زخم مثلِ خندۂ قاتل ہے سر تا پا نمک

یاد ہیں غالبؔ تجھے وہ دن کہ وجدِ ذوق میں
زخم سے گرتا تو میں پلکوں سے چنتا تھا نمک

آہ کو چاہیے اک عمر اثر ہونے تک — کون جیتا ہے تری زلف کے سر ہونے تک
دامِ ہر موج میں ہے حلقۂ صد کامِ نہنگ — دیکھیں کیا گذرے ہے قطرے پہ گہر ہونے تک
عاشقی صبر طلب اور تمنا بیتاب — دل کا کیا رنگ کروں خونِ جگر ہونے تک
ہم نے مانا کہ تغافل نہ کرو گے لیکن — خاک ہو جائینگے ہم تم کو خبر ہونے تک
پرتوِ خور سے ہے شبنم کو فنا کی تعلیم — میں بھی ہوں ایک عنایت کی نظر ہونے تک
یک نظر بیش نہیں فرصتِ ہستی غافل — گرمیٔ بزم ہے اک رقصِ شرر ہونے تک

غمِ ہستی کا اسد کس سے ہو جز مرگ علاج
شمع ہر رنگ میں جلتی ہے سحر ہونے تک

غم نہیں ہوتا ہے آزادوں کو بیش از یک نفس — برق سے کرتے ہیں روشن شمعِ ماتم خانہ ہم
بسکہ وہ چشم و چراغِ محفلِ اغیار ہے — چپکے چپکے جلتے ہیں جوں شمعِ ماتم خانہ ہم
باوجودِ یک جہاں ہنگامہ پیدائی نہیں — ہیں چراغانِ شبستانِ دلِ پروانہ ہم
محفلیں برہم کرے ہے گنجفہ بازِ خیال — ہیں ورق گردانیٔ نیرنگِ یک بت خانہ ہم
ضعف سے ہے نے قناعت سے یہ ترکِ جستجو — ہیں وبالِ تکیہ گاہِ ہمتِ مردانہ ہم

دائم الحبس اس میں ہیں لاکھوں تمنائیں اسد
جانتے ہیں سینۂ پرخوں کو زنداں خانہ ہم

غنچۂ ناشگفتہ کو دُور سے مت دکھا کہ یوں
بوسے کو پوچھتا ہوں میں۔ مُنہ سے مجھے بتا کہ یوں

پرسشِ طرزِ دلبری کیجئے کیا کہ بن کہے
اس کے ہر اک اشارے سے نکلے ہے یہ ادا کہ یوں

رات کے وقت مے پیئے، ساتھ رقیب کو لئے
آئے وہ یاں خدا کرے پر نہ کرے خدا کہ یوں

بزم میں اُس کے رُوبرو کیوں نہ خموش بیٹھئے
اُس کی تو خامشی میں بھی ہے یہی مُدعا کہ یوں

میں نے کہا کہ "بزمِ ناز چاہیئے غیر سے تہی"
سن کے ستم ظریف نے مجھ کو اٹھا دیا کہ "یوں"

غیر سے رات کیا بنی یہ جو کہا، تو دیکھئے
سامنے آن بیٹھنا۔ اور یہ دیکھنا کہ یوں

مجھ سے کہا جو یار نے، جاتے ہیں ہوش کس طرح
دیکھ کے میری بیخودی۔ چلنے لگی ہوا کہ یوں

کب مجھے کوئے یار میں رہنے کی وضع یاد تھی
آئینہ دار بن گئی۔ حیرتِ نقشِ پا کہ یوں

گر ترے دل میں ہو خیال وصل میں شوق کا زوال
موج محیطِ آب میں مارے ہے دست و پا کہ یوں

جو یہ کہے کہ ریختہ کیونکہ ہو رشکِ فارسی
گفتۂ غالبؔ ایک بار پڑھ کے اُسے سنا کہ یوں

ہم سے کھل جاؤ بوقتِ مے پرستی ایک دن
ورنہ ہم چھیڑیں گے رکھ کر عذرِ مستی ایک دن

قرض کی پیتے تھے مے لیکن سمجھتے تھے کہ ہاں
رنگ لائے گی ہماری فاقہ مستی ایک دن

غرّۂ اوجِ بنائے عالم امکاں نہ ہو
اِس بلندی کے نصیبوں میں ہے پستی ایک دن

نغمہائے غم کو بھی اے دِل غنیمت جانئے
بے صدا ہو جائے گا یہ سازِ ہستی ایک دن

دَھول دھپّا اس سراپا ناز کا شیوہ نہیں
ہم ہی کر بیٹھے تھے غالبؔ پیش دستی ایک دن

جہاں تیرا نقشِ قدم دیکھتے ہیں
خیاباں خیاباں ارم دیکھتے ہیں

دِل آشفتگاں خالِ کنجِ دہن کے
سویدا میں سیرِ عدم دیکھتے ہیں

ترے سروِ قامت سے اک قدِ آدم
قیامت کے فتنے کو کم دیکھتے ہیں

تماشا کر اے محوِ آئینہ داری!
تجھے کس تمنّا سے ہم دیکھتے ہیں

بنا کر فقیروں کا ہم بھیس غالبؔ
تماشائے اہلِ کرم دیکھتے ہیں

مانعِ دشت نوردی کوئی تدبیر نہیں
ایک چکّر ہے مرے پاؤں میں زنجیر نہیں

شوق اس دشت میں دوڑائے ہے مجھ کو کہ جہاں
جادہ غیر از نگہِ دیدۂ تصویر نہیں

حسرتِ لذّتِ آزار رہی جاتی ہے
جادۂ راہِ وفا جز دمِ شمشیر نہیں

رنجِ نومیدیٔ جاوید گوارا رہیو
خوش ہوں گر نالہ زبونی کشِ تاثیر نہیں

سر کھجاتا ہے جہاں زخمِ سر اچھا ہو جائے
لذّتِ سنگ باندازۂ تقریر نہیں

جب کرمِ رخصتِ بیباکی و گستاخی دے
کوئی تقصیر بجز خجلتِ تقصیر نہیں

غالبؔ اپنا یہ عقیدہ ہے بقولِ ناسخؔ
آپ بے بہرہ ہے جو معتقدِ میرؔ نہیں

تیرے توسن کو صبا باندھتے ہیں
ہم بھی مضموں کی ہوا باندھتے ہیں

تیری فرصت کے مقابل اے عمر!
برق کو پا بہ حنا باندھتے ہیں

قیدِ ہستی سے رہائی معلوم
اشک کو بے سر و پا باندھتے ہیں

آہ کا کس نے اثر دیکھا ہے
ہم بھی اک اپنی ہوا باندھتے ہیں

نشۂ رنگ سے ہے واشدِ گل
مست کب بندِ قبا باندھتے ہیں

غلطی ہائے مضامیں مت پوچھ
لوگ نالے کو رسا باندھتے ہیں

اہلِ تدبیر کی واماندگیاں
آبلوں پر بھی حنا باندھتے ہیں

سادہ پُرکار ہیں خوباں غالبؔ
ہم سے پیمانِ وفا باندھتے ہیں

حسد سے دل اگر افسردہ ہے گرمِ تماشا ہو
کہ چشمِ تنگ شاید کثرتِ نظارہ سے وا ہو

بقدرِ حسرتِ دل چاہئے ذوقِ معاصی بھی
بھروں یک گوشۂ دامن گر آبِ ہفت دریا ہو

اگر وہ سرو قد گرمِ خرامِ ناز آ جاوے
کفِ ہر خاکِ گلشن شکلِ قمری نالہ فرسا ہو

جزِ دل سراغِ دردِ بدل خفتگاں نہ پوچھ
آئینہ عرض کر خط و خالِ بیاں نہ پوچھ

ہندوستان سایۂ گل پائے تخت تھا — سامانِ بادشاہیٔ وصلِ بتاں نہ پوچھ

ہر داغِ تازہ یک دلِ داغِ انتظار ہے — عرضِ فضائے سینۂ دردِ امتحاں نہ پوچھ

ہے سبزہ زار ہر در و دیوارِ غمکدہ — م — جس کی بہار یہ ہو پھر اس کی خزاں نہ پوچھ

ناچار بیکسی کی بھی حسرت اٹھائیے — م — دشواریٔ رہ و ستمِ ہمرہاں نہ پوچھ

کہتا تھا کل وہ نامہ رساں سے بسوزِ دل

دردِ جدائیٔ اسداللہ خاں نہ پوچھ

صد جلوہ روبرو ہے جو مژگاں اٹھائیے — طاقت کہاں کہ دید کا احساں اٹھائیے

ہستی فریبِ نامۂ موجِ سراب ہے — یک عمر نازِ شوخیٔ عنواں اٹھائیے

ہے سنگ پر براتِ معاشِ جنونِ عشق — یعنی ہنوز منتِ طفلاں اٹھائیے

ضبطِ جنوں سے ہر سرِ مو ہے ترانہ خیز — یک نالہ بیٹھیے تو نیستاں اٹھائیے

دیوار بارِ منتِ مزدور سے ہے خم — اے خانماں خراب نہ احساں اٹھائیے

یا میرے زخمِ رشک کو رسوا نہ کیجیے — یا پردۂ تبسمِ پنہاں اٹھائیے

انگور سعیٔ بے سر و پائی سے سبز ہے

غالب بدوشِ دل خمِ مستاں اٹھائیے

ہے بزمِ بتاں میں سخن آزردہ لبوں سے — تنگ آئے ہم ایسے خوشامد طلبوں سے

ہے دورِ قدح وجہِ پریشانیٔ صہبا — یک بار لگا دو خمِ مے میرے لبوں سے

رندانِ درِ میکدہ گستاخ ہیں زاہد — زنہار نہ ہونا طرف ان بے ادبوں سے

بیدادِ وفا دیکھ کہ جاتی رہی آخر

ہر چند مری جاں کو تھا ربط لبوں سے

غمِ دنیا سے گر پائی بھی فرصت سر اٹھانے کی — فلک کا دیکھنا تقریب تیرے یاد آنے کی

کھلے گا کس طرح مضموں مرے مکتوب کا یارب! — قسم کھائی ہے اس کافر نے کاغذ کے جلانے کی

لکدکوبِ حوادث کا تحمل کر نہیں سکتی — مری طاقت کہ ضامن تھی بتوں کے ناز اٹھانے کی

لپٹنا پرنیاں میں شعلۂ آتش کا آساں ہے — ولے مشکل ہے حکمت دل میں سوزِ غم چھپانے کی

انہیں منظور اپنے زخمیوں کا دیکھ آنا تھا — اُٹھے تھے سیرِ گل کو دیکھنا شوخی بہانے کی

ہماری سادگی تھی التفاتِ ناز پر مرنا — ترا آنا نہ تھا ظالم، مگر تمہید جانے کی

کہوں کیا خوبیٔ اوضاعِ ابنائے زماں غالب

بدی کی اس نے جس سے ہم نے کی تھی بارہا نیکی

بساطِ عجز میں تھا ایک دل یک قطرہ خوں وہ بھی

سو رہتا ہے بہ اندازِ چکیدن سرنگوں وہ بھی

ہے اس شوخ سے آزردہ ہم چندے تکلف سے

تکلف برطرف۔ تھا ایک اندازِ جنوں وہ بھی

مے عشرت کی خواہش ساقیٔ گردوں سے کیا کیجے

لیے بیٹھا ہے اک دو چار جامِ واژگوں وہ بھی

مجھے معلوم ہے جو تو نے میرے حق میں سوچا ہے

کہیں ہو جائے جلد اے گردشِ گردونِ دُوں وہ بھی

نہ اتنا برّشِ تیغِ جفا پر ناز فرماؤ
مرے دریائے بیتابی میں ہے اک موجِ خوں وہ بھی

خیالِ مرگ کب تسکین دلِ آزردہ کو بخشے
مرے دامِ تمنّا میں ہے اک صیدِ زبوں وہ بھی

نہ کرتا کاش نالہ مجھ کو کیا معلوم تھا ہمدم
کہ ہوگا باعثِ افزائشِ دردِ دروں وہ بھی

نظر راحت پہ میری - کر نہ وعدہ شب کے آنے کا
کہ میری خواب بندی کے لئے ہوگا فسوں وہ بھی

مرے دل میں ہے غالبؔ شوقِ وصل و شکوۂ ہجراں
خدا وہ دن کرے جو اس سے میں یہ بھی کہوں وہ بھی

کیا تنگ ہم ستم زدگاں کا جہان ہے
جس میں کہ ایک بیضۂ مور آسمان ہے

ہے کائنات کو حرکت تیرے ذوق سے
پرتو سے آفتاب کے ذرّے میں جان ہے

کی اُس نے گرم سینۂ اہلِ ہوس میں جا
آوے نہ کیوں پسند کہ ٹھنڈا مکان ہے

بیٹھا ہے جو کہ سایۂ دیوارِ یار میں
فرمانروائے کشورِ ہندوستان ہے

کیا خوب تم نے غیر کو بوسہ نہیں دیا
بس چپ رہو ہمارے بھی منہ میں زبان ہے

حالانکہ ہے یہ سیلئ خارا سے لالہ رنگ
غافل کو میرے شیشے پہ مے کا گمان ہے

ہستی کا اعتبار بھی غم نے مٹا دیا
کس سے کہوں کہ داغ جگر کا نشان ہے

ہے بارے اعتمادِ وفاداری اس قدر
غالبؔ ہم اس میں خوش ہیں کہ نامہرباں ہے

سرگشتگی میں عالمِ ہستی سے یاس ہے
تسکیں کو دے نوید کہ مرنے کی آس ہے

لیتا نہیں مرے دلِ آوارہ کی خبر
اب تک وہ جانتا ہے کہ میرے ہی پاس ہے

کیجے بیاں سرورِ تپِ غم کہاں تلک
ہر مُو مرے بدن پہ زبانِ سپاس ہے

پی جس قدر ملے شبِ مہتاب میں شراب
اس بلغمی مزاج کو گرمی ہی راس ہے

ہے وہ غرورِ حسن سے بیگانۂ وفا
ہر چند اس کے پاس دلِ حق شناس ہے

کیا غم ہے اس کو جس کا علی سا امام ہو
اتنا بھی اے فلک زدہ کیوں بیحواس ہے

ہر اک مکاں کو ہے مکیں سے شرف اسدؔ
مجنوں جو مر گیا ہے تو جنگل اداس ہے

گر خامشی سے فائدہ اخفائے حال ہے
خوش ہوں کہ میری بات سمجھنی محال ہے

کس کو سناؤں حسرتِ اظہار کا گلہ
دل فردِ جمع و خرچ زباں ہائے لال ہے

کس پردے میں ہے آئینہ پرداز اے خدا!
رحمت کہ عذرخواہِ لبِ بے سوال ہے

ہے ہے خدا نخواستہ وہ اور دشمنی!
اے شوقِ منفعل یہ تجھے کیا خیال ہے؟

وحشت پہ میری عرصۂ آفاق تنگ تھا
دریا زمین کو عرقِ انفعال ہے

مشکیں لباس کعبہ علیؑ کے قدم سے جان
نافِ زمین ہے۔ نہ کہ نافِ غزال ہے

ہستی کے مت فریب میں آ جائیو اسدؔ
عالم تمام حلقۂ دامِ خیال ہے

نظر بہ نقصِ گدایاں کمالِ بے ادبی ہے — کہ خارِ خشک کو بھی دعوئے چمن نسبی ہے
ہوا وصال سے شوقِ دلِ حریص زیادہ — لبِ قدح پہ کفِ بادہ جوشِ تشنہ لبی ہے
خوشا وہ دل کہ سراپا طلسمِ بیخبری ہو — جنون و یاس و الم رزقِ مدعا طلبی ہے
تم اپنے شکوے کی باتیں نہ کھود کھود کے پوچھو — حذر کرو مرے دل سے کہ اس میں آگ دبی ہے

اسدؔ یہ درد و الم بھی تو مغتنم ہے کہ آخر
نہ گریۂ سحری ہے نہ آہِ نیم شبی ہے

رفتارِ عمر قطعِ رہِ اضطراب ہے — اس سال کے حساب کو برق آفتاب ہے
مینائے مے ہے سروِ نشاطِ بہار سے — بالِ تذرو جلوۂ موجِ شراب ہے
نظارہ کیا حریف ہو اس برقِ حسن کا — جوشِ بہار جلوے کو جس کے نقاب ہے
میں نامراد دل کی تسلی کو کیا کروں — مانا کہ تیرے رخ سے نگہ کامیاب ہے
گذرا اسدؔ مسرتِ پیغامِ یار سے — قاصد پہ مجھ کو رشکِ سوال و جواب ہے

زخمی ہوا ہے پاشنہ پائے ثبات کا — نے بھاگنے کی گوں نہ اقامت کی تاب ہے

جادادِ بادہ نوشیٔ رنداں ہے شش جہت
غافل گماں کرے ہے کہ گیتی خراب ہے

ہے آرمیدگی میں نکوہش بجا مجھے
صبحِ وطن ہے خندۂ دنداں نما مجھے

کرتا ہے بسکہ باغ میں تو بے حجابیاں
آنے لگی ہے نکہتِ گل سے حیا مجھے

کھلتا کسی پہ کیوں مرے دل کا معاملہ
شعروں کے انتخاب نے رسوا کیا مجھے

تا چند پست فطرتیِ طبعِ آرزو
یا رب ملے بلندیِ دستِ دعا مجھے

یکبار امتحانِ ہوس بھی ضرور ہے
اے جوشِ عشق بادۂ مرد آزما مجھے

ڈھونڈے ہے اُس مغنّیِ آتش نفس کو جی
جس کی صدا ہو جلوۂ برقِ فنا مجھے

مستانہ طے کرے ہوں رہِ وادیِ خیال
تا بازگشت سے نہ رہے مدعا مجھے

جنوں تہمت کشِ تسکیں نہ ہو گر شادمانی کی
نمک پاشِ خراشِ دل ہے لذت زندگانی کی

کشاکش ہائے ہستی سے کرے کیا سعیِ آزادی
ہوئی زنجیر موجِ آب کو فرصت روانی کی

پس از مردن بھی دیوانہ زیارت گاہِ طفلاں ہے
شرارِ سنگ نے تربت پہ میری گل فشانی کی

نکوہش ہے سزا فریادیِ بیدادِ دلبر کی
مبادا خندۂ دنداں نما ہو صبحِ محشر کی

رگِ لیلیٰ کو خاکِ دشتِ مجنوں ریشگی بخشے
اگر بووے بجائے دانہ دہقاں نوکِ نشتر کی

پرِ پروانہ شاید بادبانِ کشتیِ مے تھا
ہوئی مجلس کی گرمی سے روانی دورِ ساغر کی

غرور لطفِ ساقی نشۂ بیباکی مستاں　　نمِ دامانِ عصیاں ہے طراوت موجِ کوثر کی

کروں بیدادِ ذوقِ پرفشانی عرض کیا قدرت　م　کہ طاقت اڑ گئی اڑنے سے پہلے میرے شہپر کی

کہاں تک روؤں اسکے خیمے کے پیچھے قیامت ہے　م　مری قسمت میں یارب کیا نہ تھی دیوار پتھر کی

اسد جز آب بخشیدن ز دریا خضر کو کیا تھا
ڈبوتا چشمۂ حیواں میں گر کشتی سکندر کی

آ کہ مری جان کو قرار نہیں ہے　　طاقتِ بیدادِ انتظار نہیں ہے

دیتے ہیں جنت حیات دہر کے بدلے　　نشہ بہ اندازۂ خمار نہیں ہے

گریہ نکالے ہے تری بزم سے مجھ کو　　ہائے کہ رونے پہ اختیار نہیں ہے

ہم سے عبث ہے گمانِ رنجشِ خاطر　　خاک میں عشاق کے غبار نہیں ہے

دل سے اٹھا لطفِ جلوہ ہائے معانی　　غیرِ گل آئینہ بہار نہیں ہے

قتل کا میرے کیا ہے عہد تو بارے　　وائے اگر عہد استوار نہیں ہے

تو نے قسم مے کشی کی کھائی ہے غالب
تیری قسم کا کچھ اعتبار نہیں ہے

ہجومِ غم سے یاں تک سرنگونی مجھ کو حاصل ہے
کہ تارِ دامن و تارِ نظر میں فرق مشکل ہے

بہ سیلِ اشک لختِ دل ہے دامنگیر مژگاں کا
غریقِ بحر جویائے خس و خاشاکِ ساحل ہے

۴ رفوئے زخم سے مطلب ہے لذّتِ زخمِ سوزن کی
سمجھیو مت کہ پاسِ درد سے دیوانہ غافل ہے

وہ گل جس گلستاں میں جلوہ فرمائی کرے غالبؔ
چٹکنا غنچۂ دل کا صدائے خندۂ دل ہے

تو وہ بدخو کہ تحیّر کو تماشا جانے
غم وہ افسانہ کہ آشفتہ بیانی مانگے

نقشِ نازِ بتِ طنّاز بہ آغوشِ رقیب
پائے طاؤس پے خامۂ مانی مانگے

وہ تپِ عشق تمنا ہے کہ پھر صورتِ شمع
شعلہ تا نبضِ جگر ریشہ دوانی مانگے

پا بہ دامن ہو رہا ہوں بسکہ میں صحرا نورد
خارِ پا ہیں جوہرِ آئینۂ زانو مجھے

دیکھنا حالت مرے دل کی ہم آغوشی کے وقت
ہے نگاہِ آشنا، تیرا سرِ ہر مُو مجھے

ہوں سراپا سازِ آہنگِ شکایت کچھ نہ پوچھ
ہے یہی بہتر کہ لوگوں میں نہ چھیڑے تو مجھے

کثرتِ جور و ستم سے ہو گیا ہوں بیدماغ
خوبرویوں نے بنایا غالبؔ بدخو مجھے

نہ ہوئی گر مرے مرنے سے تسلّی نہ سہی
امتحاں اور بھی باقی ہو تو یہ بھی نہ سہی

خار خارِ المِ حسرتِ دیدار تو ہے
شوق گلچینِ گلستانِ تسلّی نہ سہی

مے پرستاں خمِ مے منہ سے لگائے ہی بنے
ایک دن گر نہ ہُوا بزم میں ساقی نہ سہی

نفسِ قیس کہ ہے چشم و چراغِ صحرا
گر نہیں شمعِ سیہ خانۂ لیلیٰ نہ سہی

ایک ہنگامے پہ موقوف ہے گھر کی رونق
نوحۂ غم ہی سہی نغمۂ شادی نہ سہی

نہ ستائش کی تمنّا نہ صلے کی پروا
گر نہیں ہیں مرے اشعار میں معنی نہ سہی

عشرتِ صحبت خوباں ہی غنیمت سمجھو
نہ ہوئی غالبؔ اگر عمرِ طبیعی نہ سہی

گلشن کو تری صحبت ازبسکہ خوش آئی ہے
ہر غنچہ کا گل ہونا آغوش کشائی ہے

واں کنگرِ استغنا ہر دم ہے بلندی پر
یاں نالے کو اور اُلٹا دعوائے رسائی ہے

ازبسکہ سکھاتا ہے غم ضبط کے اندازے
جو داغ نظر آیا اک چشم نمائی ہے

وہ دیکھ کے حسن اپنا مغرور ہوا غالبؔ
صد جلوۂ آئینہ یک صبح جدائی ہے

سیماب پشتِ گرمی آئینہ دے ہے ہم
حیراں کئے ہوئے ہیں دلِ بیقرار کے

آغوشِ گل کشودہ برائے وداع ہے
اے عندلیب چل کہ چلے دن بہار کے

ہم مشتقِ فکرِ وصل و غمِ ہجر سے اسدؔ
لائق نہیں رہے ہیں غمِ روزگار کے

ہجومِ نالہ حیرت عاجزِ عرضِ یک افغاں ہے
خموشی ریشۂ صد نیستاں سے خس بہ دنداں ہے

تکلّف برطرف ہے جانستاں تر لطفِ بدخویاں
نگاہِ بے حجابِ یار تیغِ تیزِ عریاں ہے

ہوئی یہ کثرتِ غم سے تلف کیفیتِ شادی
کہ صبحِ عید مجھ کو بدتر از چاکِ گریباں ہے

دِل و دیں نقد لا ساقی سے گر سودا کیا چاہے
کہ اِس بازار میں ساغر متاعِ دستگرداں ہے
غم آغوشِ بلا میں پرورش دیتا ہے عاشق کو
چراغِ روشن اپنا قلزمِ صرصر کا مرجاں ہے

عاشق نقابِ جلوۂ جانانہ چاہئے — فانوسِ شمع کو پرِ پروانہ چاہئے
ہے وصل ہجر عالمِ تمکین و ضبط میں — معشوقِ شوخ و عاشقِ دیوانہ چاہئے
پیدا کریں دماغ تماشائے سرو و گل — حسرت کشوں کو ساغر و مینا نہ چاہئے
دِیوانگاں ہیں حاملِ رازِ نہانِ عشق — اے بے تمیز گنج کو ویرانہ چاہئے
اِس لب سے مِل ہی جائیگا بوسہ کبھی تو ہاں — شوقِ فضول و جرأتِ رندانہ چاہئے
ساقی! بہار موسمِ گل ہے سرور بخش — پیماں سے ہم گذر گئے پیمانہ چاہئے
جادہ ہے طرزِ گفتگوئے یار اے اسدؔ
یاں جز فسوں نہیں اگر افسانہ چاہئے

چاک کی خواہش اگر وحشت بہ عریانی کرے — صبح کی مانند زخمِ دِل گریبانی کرے
میکدہ گر چشمِ مستِ یار سے پائے شکست — موئے شیشہ دیدۂ ساغر کی مژگانی کرے

خطِ عارض سے لکھا ہے زلف کو الفت کا عہد — یک قلم منظور ہے جو کچھ پریشانی کرے

جلوے کا تیرے وہ عالم ہے اگر کیجے خیال — دیدۂ دل کو زیارت گاہِ حیرانی کرے

ہے شکستن سے بھی دل نومید یارب کب تلک
آبگینہ کوہ پر عرضِ گراں جانی کرے

ہر قدم دورئ منزل ہے نمایاں مجھ سے — میری رفتار سے بھاگے ہے بیاباں مجھ سے

غمِ عشاق نہ ہو سادگی آموزِ بتاں — کس قدر خانۂ آئینہ ہے ویراں مجھ سے

درسِ عنوانِ تماشا بہ تغافل خوشتر — ہے نگہ رشتۂ شیرازۂ مژگاں مجھ سے

وحشتِ آتشِ دل سے شبِ تنہائی میں — صورتِ دود رہا سایہ گریزاں مجھ سے

اثرِ آبلہ سے جادۂ صحرائے جنوں — صورتِ رشتۂ گوہر ہے چراغاں مجھ سے

بیکسی ہائے شبِ ہجر کی وحشت ہے ہے — سایہ خورشیدِ قیامت میں ہے پنہاں مجھ سے

بیخودی بسترِ تمہیدِ فراغت ہو جو — پُر ہے سائے کی طرح میرا شبستاں مجھ سے

شوقِ دیدار میں گر تو مجھے گردن مارے — ہو نگہ مثلِ گلِ شمع پریشاں مجھ سے

گردشِ ساغرِ صد جلوۂ رنگیں تجھ سے — آئینہ دارئ یک دیدۂ حیراں مجھ سے

اے اسدؔ! دسترسِ وصلِ تمنا معلوم — کاش ہو قدرتِ برچیدنِ داماں مجھ سے

نگہِ گرم سے اک آگ ٹپکتی ہے اسدؔ
ہے چراغاں خس و خاشاکِ گلستاں مجھ سے

تپش سے میری وقفِ کشمکش ہر تارِ بستر ہے
مرا سر رنجِ بالیں ہے مرا تن بارِ بستر ہے م

خوشا اقبالِ رنجوری عیادت کو تم آئے ہو
فروغِ شمعِ بالیں طالعِ بیدارِ بستر ہے

سرشکِ سر بہ صحرا دادہ نور العین دامن ہے
دلِ بے دست و پا افتادہ برخوردارِ بستر ہے

بہ طوفاں گاہِ جوشِ اضطراب و شامِ تنہائی
شعاعِ آفتابِ صبحِ محشر تارِ بستر ہے

ابھی آتی ہے بو بالش سے اسکی زلفِ مشکیں کی
ہماری دید کو خوابِ زلیخا عارِ بستر ہے

کہوں کیا دل کی کیا حالت ہے ہجرِ یار میں غالب م
کہ بیتابی سے ہر اک تارِ بستر خارِ بستر ہے

کرے[1] ہے بادہ ترے لب سے کسبِ رنگِ فروغ
خطِ پیالہ سراسر نگاہِ گلچیں ہے

بجا[1] ہے گر نہ سنے نالہ ہائے بلبلِ زار
کہ گوشِ گل نمِ شبنم سے پنبہ آگیں ہے

کبھی تو اس دلِ شوریدہ کی بھی داد ملے
کہ ایک عمر سے حسرت پرستِ بالیں ہے م

اسد ہے نزع میں چل بے وفا برائے خدا م
مقامِ ترکِ حجاب و وداعِ تمکیں ہے

یاد ہے شادی میں بھی ہنگامۂ یارب مجھے
سبحۂ زاہد ہوا ہے خندہ زیرِ لب مجھے

ہے کشادِ خاطرِ وابستہ در رہنِ سخن
تھا طلسمِ قفلِ ابجد خانۂ مکتب مجھے

یارب اس آشفتگی کی داد کس سے چاہئے
رشک آسائش پہ ہے زندانیوں کی اب مجھے

[1] یہ دو اشعار جو دیوان غالب کے عام نسخوں میں ملتے ہیں۔ نسخۂ حمیدیہ کے صفحات ۲۲۳ اور ۲۲۴ پر بطور غیر مطبوعہ اشعار کے شائع ہوئے ہیں باقی دو اشعار نسخۂ حمیدیہ میں موجود نہیں اور غالباً اس کی ترتیب کے بعد لکھے گئے۔

شومئ طالع سے ہوں ذوقِ معاصی میں اسیر
نامۂ اعمال ہے تاریکئ کوکب مجھے

طبع ہے مشتاقِ لذت ہائے حسرت کیا کروں
آرزو سے ہے شکستِ آرزو مطلب مجھے

دل لگا کر آپ بھی غالبؔ مجھی سے ہو گئے
عشق سے آتے تھے مانع میرزا صاحب مجھے

زبسکہ مشقِ تماشا جنوں علامت ہے
کشاد و بستِ مژہ سیلئ ندامت ہے

بہ پیچ و تابِ ہوس سلکِ عافیت مت توڑ
نگاہِ عجز سرِ رشتۂ سلامت ہے

وفا مقابل و دعوئے عشق بے بنیاد
جنونِ ساختہ و فصلِ گل قیامت ہے

نہ جانوں کیونکہ مٹے داغِ طعنِ بدعہدی
تجھے کہ آئینہ بھی ورطۂ ملامت ہے

اسدؔ! بہارِ تماشائے گلستانِ حیات
وصالِ لالہ عذارانِ سرو قامت ہے

شوخئ مضرابِ جولاں آبیارِ نغمہ ہے
برگ ریزِ ناخنِ مطرب بہارِ نغمہ ہے

سازِ عیشِ بیدلی ہے خانہ ویرانی مجھے
سیلِ یاں کوکِ صدائے آبشارِ نغمہ ہے

نشہ ہا شادابِ رنگ و سازہا مستِ طرب!
شیشۂ مے سروِ سبزِ جوئبارِ نغمہ ہے

ہم نشیں مت کہہ کہ برہم کر نہ بزمِ عیشِ دوست
واں تو میرے نالے کو بھی اعتبارِ نغمہ ہے

خود فروشیہائے ہستی بسکہ جائے خندہ ہے
تا شکستِ قیمتِ دلہا صدائے خندہ ہے

عرضِ نازِ شوخئ دنداں برائے خندہ ہے
دعوئے جمعیتِ احباب جائے خندہ ہے

ہے عدم میں غنچہ محوِ عبرتِ انجامِ گل / یک جہاں زانو تأمل در قفائے خندہ ہے
کلفتِ افسردگی کو عیشِ بیتابی حرام / ورنہ دنداں در دل افشردن بنائے خندہ ہے
نقشِ عبرت در نظر یا نقدِ عشرت در بساط / دو جہاں وسعت بہ قدرِ یک فضائے خندہ ہے

سوزشِ باطن کے ہیں احباب منکر ورنہ یاں
دل محیطِ گریہ و لب آشنائے خندہ ہے
م

جب تک دہانِ زخم نہ پیدا کرے کوئی / مشکل کہ تجھ سے راہِ سخن وا کرے کوئی
سر بر ہوئی نہ وعدۂ صبر آزما سے عمر / فرصت کہاں کہ تیری تمنا کرے کوئی
عالم غبارِ وحشتِ مجنوں ہے سر بسر / کب تک خیالِ طرۂ لیلیٰ کرے کوئی
افسردگی نہیں طرب انشائے التفات / ہاں درد بن کے دل میں مگر جا کرے کوئی
رونے سے اے ندیم! ملامت نہ کر مجھے / آخر کبھی تو عقدۂ دل وا کرے کوئی
تمثالِ جلوہ عرض کر اے حسن کب تلک / آئینۂ خیال کو دیکھا کرے کوئی
چاکِ جگر سے جب رہِ پرسش نہ وا ہوئی / کیا فائدہ کہ جیب کو رسوا کرے کوئی
بیکاریٔ جنوں کو ہے سر پیٹنے کا شغل / جب ہاتھ ٹوٹ جائیں تو پھر کیا کرے کوئی
لختِ جگر سے ہے رگِ ہر خار شاخِ گل / تا چند باغبانیٔ صحرا کرے کوئی
ہے وحشتِ طبیعتِ ایجاد یاس خیز / یہ درد وہ نہیں کہ نہ پیدا کرے کوئی
ناکامیٔ نگاہ ہے برقِ نظارہ سوز / تو وہ نہیں کہ تجھ کو تماشا کرے کوئی
عرضِ سرشک پر ہے فضائے زمانہ تنگ / صحرا کہاں کہ دعوتِ دریا کرے کوئی

ہر سنگ و خشت ہے صدفِ گوہرِ شکست — نقصان نہیں جنوں سے جو سودا کرے کوئی

حسنِ فروغِ شمعِ سخن دُور ہے اسدؔ
پہلے دلِ گداختہ پیدا کرے کوئی

باغ تجھ بن گلِ نرگس سے ڈراتا ہے مجھے — چاہوں گر سیرِ چمن آنکھ دکھاتا ہے مجھے
نالہ سرمایۂ یک عالم و عالم کفِ خاک! — آسمان بیضۂ قمری نظر آتا ہے مجھے
میں ہوں اور حیرتِ جاوید مگر ذوقِ خیال — بہ فسونِ نگہ ناز ستاتا ہے مجھے
جوہرِ تیغ بہ سر چشمۂ دیگر معلوم — ہوں میں وہ سبزہ کہ زہراب اُگاتا ہے مجھے
مُدعا محوِ تماشائے شکستِ دل ہے — آئینہ خانے میں کوئی لئے جاتا ہے مجھے
باغ پا کر خفقانی یہ ڈراتا ہے مجھے — سایۂ شاخِ گُل افعی نظر آتا ہے مجھے

زندگی میں تو وہ محفل سے اٹھا دیتے تھے
دیکھوں اب مر گئے پر کون اُٹھاتا ہے مجھے

کوہ کے ہوں بارِ خاطر گر صدا ہو جائیے — بے تکلّف اے شرارِ جستہ کیا ہو جائیے
یاد رکھئے ناز ہائے التفاتِ اوّلیں — آشیانِ طائرِ رنگِ رسا ہو جائیے
بیضہ آسا ننگِ بال و پر ہے یہ کُنجِ قفس — از سرِ نو زندگی ہو گر رہا ہو جائیے
لطفِ عشقِ ہر یک اندازِ دگر دکھلائیگا — بے تکلّف یک نگاہِ آشنا ہو جائیے

داد از دستِ جفائے صدمۂ ضرب المثل
گر ہمہ افتادگی جوں نقشِ پا ہو جائیے

کارگاہِ ہستی میں لالہ داغ ساماں ہے — برقِ خرمنِ راحت خونِ گرمِ دہقاں ہے

غنچہ تا شگفتن ہا، برگِ عافیت معلوم — باوجودِ دلجمعی خوابِ گل پریشاں ہے

م
ہم سے رنجِ بیتابی کس طرح اٹھایا جائے
داغِ پشتِ دستِ عجز شعلہ خس بدنداں ہے

آمدِ سیلابِ طوفانِ صدائے آب ہے — نقشِ پا جو کان میں رکھتا ہے انگلی جادہ سے

بزمِ مے وحشت کدہ ہے کس کی چشمِ مست کا — شیشے میں نبضِ پری پنہاں ہے موجِ بادہ سے

خیمۂ لیلیٰ سیاہ و خانۂ مجنوں خراب — جوشِ ویرانی ہے عشقِ داغ بیروں دادہ سے

بزمِ ہستی وہ تماشا ہے کہ جس کو ہم اسدؔ
دیکھتے ہیں چشم از خوابِ عدم نکشادہ سے

جس جا نسیم شانہ کشِ زلفِ یار ہے — نافہ دماغِ آہوئے دشتِ تتار ہے

ہے ذرہ ذرہ تنگیٔ جا سے غبارِ شوق — گر دام یہ ہے وسعتِ صحرا شکار ہے

کس کا سراغِ جلوہ ہے حیرت کو اے خدا — آئینہ فرشِ ششِ جہت انتظار ہے

چھڑکے ہے شبنم آئینۂ برگِ گُل پر آب — اے عندلیب وقتِ وداعِ بہار ہے

دل مت گنوا خبر نہ سہی سیر ہی سہی — اے بے دماغ آئینہ تمثال دار ہے

بے پردہ سوئے وادیٔ مجنوں گزر نہ کر — ہر ذرّے کے نقاب میں دل بیقرار ہے

اے عندلیب یک کفِ خس بہرِ آشیاں — طوفانِ آمد آمدِ فصلِ بہار ہے

دل مدعی و دیدہ بنا مدعا علیہ — م — نظارے کا مقدمہ پھر روبکار ہے

پیچ آپڑی ہے وعدۂ دلدار کی مجھے م وہ آئے یا نہ آئے پہ یاں انتظار ہے

غفلت کفیلِ عمر و اسدؔ ضامنِ نشاط

اے مرگِ ناگہاں تجھے کیا انتظار ہے

خموشیوں میں تماشا ادا نکلتی ہے نگاہ دل سے تری سُرمہ سا نکلتی ہے

برنگِ شیشہ ہوں یک گوشۂ دلِ خالی کبھی پری مری خلوت میں آ نکلتی ہے

فشارِ تنگیِ خلوت سے بنتی ہے شبنم صبا جو غنچے کے پردے میں جا نکلتی ہے

نہ پوچھ سینۂ عاشق سے آبِ تیغِ نگاہ

کہ زخمِ روزنِ در سے ہوا نکلتی ہے

آئینہ کیوں نہ دوں کہ تماشا کہیں جسے ایسا کہاں سے لاؤں کہ تجھ سا کہیں جسے

ہے انتظار سے شرر آبادِ رستخیز مژگانِ کوہکن رگِ خارا کہیں جسے

حسرت نے لا رکھا تری بزمِ خیال میں گلدستۂ نگاہ سویدا کہیں جسے

کس فرصتِ وصال پہ ہے گل کو عندلیب زخمِ فراق خندۂ بیجا کہیں جسے

درکار ہے شگفتنِ گلہائے عیش کو صبحِ بہار پنبۂ مینا کہیں جسے

پھونکا ہے کس نے گوشِ محبت میں اے خدا افسونِ انتظار تمنا کہیں جسے

یارب ہمیں تو خواب میں بھی مت دکھائیو یہ محشرِ خیال کہ دنیا کہیں جسے

سر پر ہجومِ دردِ غریبی سے ڈالیے وہ ایک مشتِ خاک کہ صحرا کہیں جسے

ہے چشمِ تر میں حسرتِ دیدار سے نہاں شوقِ عناں گسیختہ دریا کہیں جسے

غالبؔ بُرا نہ مان جو واعظ بُرا کہے
ایسا بھی کوئی ہے کہ سب اچھا کہیں جسے

شبنم بہ گلِ لالہ نہ خالی ز ادا ہے | داغِ دلِ بیدرد نظرگاہِ حیا ہے
دل خوں شدۂ کشمکشِ حسرتِ دیدار | آئینہ بدستِ بُتِ بدمستِ حنا ہے
تمثال میں تیری ہے وہ شوخی کہ بصد ذوق | آئینہ بہ اندازِ گل آغوش کشا ہے
قمری کفِ خاکستر و بلبل قفسِ رنگ | اے نالہ نشانِ جگرِ سوختہ کیا ہے
مجبوریٔ دعوائے گرفتاریٔ الفت | دستِ تہِ سنگ آمدہ پیمانِ وفا ہے
اے پرتوِ خورشیدِ جہاں تاب ادھر بھی | سائے کی طرح ہم پہ عجب وقت پڑا ہے
معلوم ہوا حالِ شہیدانِ گذشتہ | تیغِ ستم آئینۂ تصویر نما ہے
بیگانگیٔ خلق سے بیدل نہ ہو غالبؔ | کوئی نہیں تیرا تو مری جان خدا ہے

شعلے سے نہ ہوتی ہوسِ شعلہ نے جو کی | جی کسقدر افسردگیٔ دل پہ جلا ہے
خونے تری افسردہ کیا وحشتِ دل کو | معشوقی و بے حوصلگی طُرفہ بلا ہے

ناکردہ گناہوں کی بھی حسرت کی ملے داد
یا رب اگر ان کردہ گناہوں کی سزا ہے

مستی بہ ذوقِ غفلتِ ساقی ہلاک ہے | موجِ شراب یک مژۂ خوابناک ہے
جز زخمِ تیغِ ناز نہیں دل میں آرزو | جیبِ خیال بھی ترے ہاتھوں سے چاک ہے

جوشِ جنوں سے کچھ نظر آتا نہیں اسدؔ
صحرا ہماری آنکھ میں اِک مشتِ خاک ہے

جو نہ نقدِ داغِ دل کی کرے شعلہ پاسبانی — تو فسردگی نہاں ہے بہ کمینِ بے زبانی
بفراز گاہِ عبرت چہ بہار و کو تماشا — کہ نگاہ ہے سیہ پوش بعزائے زندگانی
بہ فراقِ رفتہ یاراں خط و حرف مُو پریشاں — دلِ غافل از حقیقت ہمہ ذوقِ قصّہ خوانی
نہ وفا کو آبرو ہے نہ جفا تمیز جُو ہے — چہ حسابِ جانفشانی چہ غرورِ دلستانی
شر و شورِ آرزو سے تب و تابِ عجز بہتر — نہ کرے اگر ہوس پر غمِ بیدلی گرانی
مجھے انتعاشِ غم نے پئے عرضِ حال بخشی — ہوسِ غزل سرائی تپشِ فسانہ خوانی
مجھے اس سے کیا توقع بہ زمانۂ جوانی — مطلع — کبھی کودکی میں جس نے نہ سنی مری کہانی
دلِ ناامید کیونکر بہ تسلّی آشنا ہو — جو امیدوار رہئے نہ بمرگِ ناگہانی
مجھے بادۂ طرب سے بہ خمارگاہِ قسمت — جو ملی تو تلخ کامی جو ہوئی تو سرگرانی
نہ ستم کر اب تو مجھ پر کہ وہ دن گئے کہ ہاں تھی — مجھے طاقت آزمائی تجھے الفت آزمائی
یونہی دکھ کسی کو دینا نہیں خوب ورنہ کہتا — کہ مرے عدو کو یارب ملے میری زندگانی

یہی بار بار جی میں مرے آئے ہے کہ غالبؔ
کروں خوانِ گفتگو پر دل و جاں کی میہمانی

میرے بعد

حُسن غمزے کی کشاکش سے چھٹا میرے بعد
بارے آرام سے ہیں اہلِ جفا میرے بعد

منصبِ شیفتگی کے کوئی قابل نہ رہا
ہوئی معزولیِ انداز و ادا میرے بعد

شمع بجھتی ہے تو اس میں سے دُھواں اُٹھتا ہے
شعلۂ عشق سیہ پوش ہوا میرے بعد

خوں ہے دل خاک میں احوالِ بتاں پر یعنی
اُن کے ناخن ہوئے محتاجِ حنا میرے بعد

درخورِ عرض نہیں جوہرِ بیداد کو جا
نگہِ ناز ہے سُرمے سے خفا میرے بعد

ہے جنوں اہلِ جنوں کے لئے آغوشِ وداع
چاک ہوتا ہے گریباں سے جدا میرے بعد

کون ہوتا ہے حریفِ مےِ مرد افگنِ عشق
ہے مکرّر لبِ ساقی پہ صلا میرے بعد

غم سے مرتا ہوں کہ اتنا نہیں دنیا میں کوئی
کہ کرے تعزیتِ مہر و وفا میرے بعد

تھی نگہ میری نہاں خانۂ دل کی نقاب
بے خطر جیتے ہیں اربابِ ریا میرے بعد

تھا میں گلدستۂ احباب کی بندش کی گیاہ
متفرق ہوئے میرے رفقا میرے بعد

آئے ہے بیکسیِ عشق پہ رونا غالبؔ
کس کے گھر جائے گا سیلابِ بلا میرے بعد

نوحہ

درد سے میرے ہے تجھ کو بیقراری ہائے ہائے
کیا ہوئی ظالم تری غفلت شعاری ہائے ہائے

تیرے دل میں گر نہ تھا آشوبِ غم کا حوصلہ
تو نے پھر کیوں کی تھی میری غمگساری ہائے ہائے

کیوں مری غمخوارگی کو تجھ کو آیا تھا خیال ؟
دشمنی اپنی تھی میری دوستداری ہائے ہائے

عمر بھر کا تو نے پیمانِ وفا باندھا تو کیا
عمر کو بھی تو نہیں ہے پائداری ہائے ہائے

شرمِ رسوائی سے جا چھپنا نقابِ خاک میں
ختم ہے الفت کی تجھ پر پردہ داری ہائے ہائے

گلفشانی ہائے نازِ جلوہ کو کیا ہو گیا
خاک پر ہوتی ہے تیری لالہ کاری ہائے ہائے

زہر لگتی ہے مجھے آب و ہوائے زندگی
یعنی تجھ سے تھی اسے ناسازگاری ہائے ہائے

ہاتھ ہی تیغ آزما کا کام سے جاتا رہا
دل پہ اک لگنے نہ پایا زخمِ کاری ہائے ہائے

خاک میں ناموسِ پیمانِ محبت مل گئے
اٹھ گئی دنیا سے راہ و رسمِ یاری ہائے ہائے

کس طرح کاٹے کوئی شب ہائے تارِ برشگال
ہے نظر خو کردۂ اختر شماری ہائے ہائے

گوش مہجورِ پیام و چشم محرومِ جمال
ایک دل تس پر یہ ناامیدواری ہائے ہائے

گر مصیبت تھی تو غربت میں اُٹھا لیتے اسد
میری دلی ہی میں ہونی تھی یہ خواری ہائے ہائے

عشق نے پکڑا نہ تھا غالب ابھی الفت کا رنگ م رہ گیا تھا دل میں جو کچھ ذوقِ خواری ہائے ہائے

قطعہ

شب کہ برقِ سوزِ دل سے زہرۂ ابر آب تھا م شعلۂ جوالہ ہر یک حلقۂ گرداب تھا
واں کرم کو عذرِ بارش تھا عناں گیرِ خرام م گریے سے یاں پنبۂ بالش کفِ سیلاب تھا

واں خود آرائی کو تھا موتی پرونے کا خیال — یاں ہجومِ اشک میں تارِ نگہ نایاب تھا

جلوۂ گل نے کیا تھا واں چراغاں آبِ جو — م یاں رواں مژگانِ چشمِ تر سے خونِ ناب تھا

یاں سرِ پُرشور بے خوابی سے تھا دیوارِ جُو — م واں وہ فرقِ ناز محوِ بالشِ کمخواب تھا

یاں نفس کرتا تھا روشن شمعِ بزمِ بیخودی — م جلوۂ گل واں بساطِ صحبتِ احباب تھا

فرش سے تا عرش واں طوفاں تھا موجِ رنگ کا — م یاں زمیں سے آسماں تک سوختن کا باب تھا

واں ہجومِ نغمہ ہائے سازِ عشرت تھا اسدؔ — ناخنِ غم یاں سرِ تارِ نفس مضراب تھا

ناگہاں اس رنگ سے خوں نابہ ٹپکانے لگا — م دل کہ ذوقِ کاوشِ ناخن سے لذت یاب تھا

شب کہ ذوقِ گفتگو سے تیری دل بیتاب تھا — شوخیٔ وحشت سے افسانہ فسونِ خواب تھا

نالۂ دل میں شب اندازِ اثر نایاب تھا — تھا سپندِ بزمِ وصلِ غیر گو بیتاب تھا

مقدمِ سیلاب سے دل کیا نشاط آہنگ ہے — م خانۂ عاشق مگر سازِ صدائے آب تھا

نازشِ ایامِ خاکستر نشینی کیا کہوں — م پہلوئے اندیشہ وقفِ بسترِ سنجاب تھا

کچھ نہ کی اپنے جنونِ نارسا نے ورنہ یاں — م ذرّہ ذرّہ روکشِ خورشیدِ عالم تاب تھا

آج کیوں پروا نہیں اپنے اسیروں کی تجھے — م کل تلک تیرا بھی دل مہر و وفا کا باب تھا

یاد کر وہ دن کہ ہر اک حلقہ تیرے دام کا — م انتظارِ صید میں اک دیدۂ بیخواب تھا

م
میں نے روکا رات غالبؔ کو وگرنہ دیکھتے
اس کے سیلِ گریہ میں گردوں کفِ سیلاب تھا

قصیدہ در منقبت

سازِ یک ذرّہ نہیں فیضِ چمن سے بیکار
سایۂ لالۂ بے داغ سویدائے بہار

مستیٔ بادِ صبا سے ہے بعرضِ سبزہ
ریزۂ شیشۂ مے جوہرِ تیغِ کہسار

سبزہ ہے جامِ زمرّد کی طرح داغِ پلنگ م
تازہ ہے ریشۂ نارنج صفت روئے شرار

حسرتِ جلوۂ ساقی ہے کہ ہر پارۂ ابر
سینہ بیتابی سے ملتا ہے بہ تیغِ کہسار

مستیٔ ابر سے گلچین طرب ہے حسرت
کہ اس آغوش میں ممکن ہے دو عالم کا فشار

کوہ و صحرا ہمہ معموریٔ شوقِ بلبل
راہِ خوابیدہ ہوئی خندۂ گل سے بیدار

سونپے ہے فیضِ ہوا صورتِ مژگانِ یتیم
سرنوشتِ دو جہاں ابر بہ یک سطرِ غبار

کفِ ہر خاک بگردوں شدہ قمری پرواز
دامِ ہر کاغذِ آتش زدہ طاؤس شکار

کاٹ کر پھینکئے ناخن تو بہ اندازِ ہلال
قوتِ نامیہ اس کو بھی نہ چھوڑے بیکار

میکدے میں ہو اگر آرزوئے گل چینی
بھول جا یک قدحِ بادہ بطاقِ گلزار

موجِ گل ڈھونڈ بہ خلوت کدۂ غنچۂ باغ
گم کرے گوشۂ میخانہ میں گر تو دستار

کھینچے گر مانیٔ اندیشہ چمن کی تصویر
سبز مثلِ خطِ نوخیز ہو خطِّ پرکار

لعل سے کی ہے پئے زمزمۂ مدحتِ شاہ
طوطیٔ سبزۂ کہسار نے پیدا منقار

وہ شہنشاہ کہ جس کے پئے تعمیرِ سرا
چشمِ جبریل ہوئی قالبِ خشتِ دیوار

فلک العرش ہجومِ خمِ دوشِ مزدور
رشتۂ فیضِ ازل سازِ طنابِ معمار

سبزۂ نہ چمن و یک خطِ پشتِ لبِ بام — رفعتِ ہمتِ صد عارف و یک اوجِ حصار
واں کی خاشاک سے حاصل ہو جسے یک پرِ کار — وہ رہے مروحۂ بالِ پری سے بیزار
ذرہ اُس گرد کا خورشید کو آئینۂ ناز — گردِ اس دشت کی امید کو احرامِ بہار
خاکِ صحرائے نجف جوہرِ سیرِ عرفا — چشمِ نقشِ قدم آئینۂ بختِ بیدار
آفرینش کو ہے واں سے طلبِ مستیٔ ناز — عرضِ خمیازۂ ایجاد ہے ہر موجِ غبار
فیض سے تیرے ہے اے شمعِ شبستانِ بہار — دلِ پروانہ چراغاں، پرِ بلبل گلزار
شکلِ طاؤس کرے آئینہ خانہ پرواز — ذوق میں جلوے کی تیرے بہ ہوائے دیدار
تیری اولاد کے غم میں ہے بروئے گردوں — سلکِ اختر میں مہِ نو مژۂ گوہر بار
مدح میں تیری نہاں زمزمۂ نعتِ نبیؐ — جام سے تیرے عیاں بادۂ جوشِ اسرار
ہم عبادت کو ترا نقشِ قدم مُہرِ نماز — ہم ریاضت کو ترے حوصلے سے استظہار
تہمتِ بیخودیٔ کفر نہ کھینچے یارب! — کمیٔ ربطِ نیاز و حظِ نازِ بسیار
ہے اسیرِ ستم کشمکشِ دامِ وفا — دلِ وارستۂ ہفتاد و دو ملت بیزار
جوہرِ دستِ دعا آئینہ یعنی تاثیر — یک طرف نازشِ مژگاں و دگر سو غمِ خار
مردمک سے ہو عزا خانۂ اقبال نگاہ — خاکِ در کی تری جو چشم نہ ہو آئینہ دار
دشمنِ آلِ نبی کو بطرب خانۂ دہر — عرضِ خمیازۂ سیلاب ہو طاقِ دیوار

دیدہ تا دل اسدؔ آئینۂ یک پرتوِ شوق
فیضِ معنی سے خطِ ساغرِ راقم سرشار۔

قصیدہ فی المنقبت

توڑے ہے عجزِ تنک حوصلہ بر روئے زمین — سجدۂ تمثال وہ آئینہ کہیں جس کو جبیں

دہر جز جلوۂ یکتائی معشوق نہیں — ہم کہاں ہوتے اگر حسن نہ ہوتا خود بیں

توڑے ہے نالہ سرِ رشتۂ پاسِ انفاس — سر کرے ہے دلِ حیرت زدہ شغلِ تسکیں

بیدلی ہائے تماشا کہ نہ عبرت ہے نہ ذوق — بیکسی ہائے تمنا کہ نہ دنیا ہے نہ دیں

ہرزہ ہے نغمۂ زیر و بمِ ہستی و عدم — لغو ہے آئینہ فرقِ جنون و تمکیں

یاس، تمثالِ بہار آئینۂ استغنا — وہم آئینۂ پیدائی تمثالِ یقیں

مثلِ مضمونِ وفا باد بدستِ تسلیم — صورتِ نقشِ قدم خاک بفرقِ تمکیں

لافِ دانش غلط و نفعِ عبادت معلوم — دُردِ یک ساغرِ غفلت ہے چہ دنیا و چہ دیں

نقشِ معنی ہمہ خمیازۂ عرضِ صورت — سخنِ حق ہمہ پیمانۂ ذوقِ تحسیں

عشق بے ربطیٔ شیرازۂ اجزائے حواس — وصل زنگارِ رخِ آئینۂ حسنِ یقیں

کوہکن گرسنہ مزدورِ طرب گاہِ رقیب — بیستوں آئینہ خوابِ گرانِ شیریں

موجِ خمیازۂ یک نشہ چہ اسلام و چہ کفر — کجیٔ یک خطِ مسطر چہ توہم چہ یقیں

قبلہ و ابروئے بت یک رہِ خوابیدۂ شوق — کعبہ و بتکدہ یک محملِ خوابِ سنگیں

کس نے دیکھا نفسِ اہلِ وفا آتش خیز — کس نے پایا اثرِ نالۂ دلہائے حزیں

سامعِ زمزمۂ اہلِ جہاں ہوں لیکن — نہ سر و برگِ ستائش نہ دماغِ نفریں

نہ تمنا، نہ تماشا، نہ تحیّر، نہ نگاہ
گردِ جوہر میں ہے آئینۂ دل پردہ نشیں

شورِ اوہام سے مت ہو شبِ خونِ انصاف
گفتگو بے مزہ و زخمِ تمنّا نمکیں

نقشِ لاحول لکھ اے خامۂ ہذیاں تحریر!
"یا علیؑ" عرض کر اے فطرتِ وسواس قریں

کس سے ممکن ہے تری مدح بغیر از واجب
شعلۂ شمع مگر شمع پہ باندھے آئیں

ہو وہ سرمایۂ ایجادِ جہاں گرمِ خرام
ہر کفِ خاک ہے واں گردۂ تصویرِ زمیں

مظہرِ فیضِ خدا جان و دلِ ختمِ رسل
قبلۂ آلِ نبی، کعبۂ ایجادِ یقیں

نسبتِ نام سے اس کی ہے یہ رتبہ کہ رہے
ابداً پشتِ فلک خم شدۂ نازِ زمیں

جلوہ پرواز ہو نقشِ قدم اُس کا جس جا
وہ کفِ خاک ہے ناموسِ دو عالم کی امیں

فیضِ خلق اس کا ہی شامل ہے کہ ہوتا ہے سدا
بوئے گل سے نفسِ بادِ صبا عطر آگیں

بُرشِ تیغ کا اس کی ہے جہاں میں چرچا
قطع ہو جائے نہ سر رشتۂ ایجاد کہیں

کفر سوز اُس کا وہ جلوہ ہے کہ جس سے ٹوٹے
رنگِ عاشق کی طرح رونقِ بتخانۂ چیں

جاں پناہا! دل و جاں فیض رسانا! شاہا!
وصیِ ختمِ رسل تو ہے بفتوائے یقیں

جسمِ اطہر کو ترے دوشِ پیمبر منبر
نامِ نامی کو ترے ناصیۂ عرشِ نگیں

تیری مدحت کیلئے ہیں دل و جاں کام و زباں
تیری تسلیم کو ہیں لوح و قلم دست و جبیں

آستاں پر ترے ہے جوہرِ آئینۂ سنگ
رقمِ بندگیِ حضرتِ جبریلِ امیں

تیرے در کے لئے اسبابِ نثار آمادہ
خاکیوں کو جو خدا نے دیئے جان و دل و دیں

کس سے ہو سکتی ہے مداحیِ ممدوحِ خدا
کس سے ہو سکتی ہے آرائشِ فردوسِ بریں

جنسِ بازارِ معاصی اسد اللہ اسد — کہ سوا تیرے کوئی اس کا خریدار نہیں
شوخیٔ عرضِ مطالب میں ہے گستاخ طلب — ہے ترے حوصلۂ فضل پہ از بسکہ یقیں
دے دعا کو میری وہ مرتبۂ حسنِ قبول — کہ اجابت کہے ہر حرف پہ سو بار آمیں
غمِ شبیر سے ہو سینہ یہاں تک لبریز — کہ رہیں خونِ جگر سے مری آنکھیں رنگیں
طبع کو الفتِ دلدل میں یہ سرگرمیٔ شوق — کہ جہاں تک چلے اُس سے قدم اور مجھ سے جبیں
دلِ الفت نسب و سینۂ توحید فضا — نگہ جلوہ پرست و نفسِ صدق گزیں
صرفِ اعدا، اثرِ شعلۂ دودِ دوزخ — وقفِ احباب گلُ و سنبلِ فردوسِ بریں

متفرق

اسدؔ ہم وہ جنوں جولاں گدائے بے سر و پا ہیں — کہ ہے سر پنجۂ مژگانِ آہو پشتِ خار اپنا

نہ ہوگا یک بیاباں ماندگی سے ذوق کم میرا — حبابِ موجۂ رفتار ہے نقشِ قدم میرا
محبت تھی چمن سے لیکن اب یہ بد دماغی ہے — کہ موجِ بوئے گل سے ناک میں آتا ہے دم میرا

قطرۂ مے بسکہ حیرت سے نفس پرور ہوا / خطِ جامِ مے سراسر رشتۂ گوہر ہوا
اعتبارِ عشق کی خانہ خرابی دیکھنا / غیر نے کی آہ لیکن وہ خفا مجھ پر ہوا

سرمۂ مفتِ نظر ہوں مری قیمت یہ ہے / کہ رہے چشمِ خریدار پہ احساں میرا
رخصتِ نالہ مجھے دے کہ مبادا ظالم / م / تیرے چہرے سے ہو ظاہر غمِ پنہاں میرا

ستمکش مصلحت سے ہوں کہ خوباں تجھ پہ عاشق ہیں / تکلّف برطرف مل جائیگا تجھ سا رقیب آخر

صفائے حیرتِ آئینہ ہے سامانِ زنگ آخر / تغیّرِ آبِ برجا ماندہ کا پاتا ہے رنگ آخر
نہ کی سامانِ عیش و جاہ نے تدبیر وحشت کی / م / ہُوا جامِ زمرّد بھی مجھے داغِ پلنگ آخر

وسعتِ سعیٔ کرم دیکھ کہ سرتاسرِ خاک / گذرے ہے آبلہ پا ابرِ گہربار ہنوز
یک قلم کاغذِ آتش زدہ ہے صفحۂ دشت / نقشِ پا میں ہے تپِ گرمیٔ رفتار ہنوز

نہ لیوے گر خسِ جوہر طراوت سبزۂ خط سے / لگا دے خانۂ آئینہ میں روئے نگار آتش
فروغِ حسن سے ہوتی ہے حلِ مشکلِ عاشق / نہ نکلے شمع کے پا سے نکالے گر نہ خار آتش

جادۂ رہ خُور کو وقتِ شام ہے تارِ شعاع
چرخ وا کرتا ہے ماہِ نو سے آغوشِ وداع

گر تجھ کو ہے یقینِ اجابت - دعا نہ مانگ
یعنی بغیر یک دلِ بے مدعا نہ مانگ

آتا ہے داغِ حسرتِ دل کا شمار یاد
مجھ سے مرے گنہ کا حساب اے خدا نہ مانگ

بقدرِ حوصلۂ عشق جلوہ ریزی ہے
وگرنہ خانۂ آئینہ کی فضا معلوم

بہ نالہ حاصلِ دلبستگی فراہم کر
متاعِ خانۂ زنجیر جُز صدا معلوم

اسدؔ فریفتۂ انتخابِ طرزِ جفا
وگرنہ دلبریٔ وعدہ وفا معلوم

دیر و حرم آئینۂ تکرارِ تمنا
وا ماندگیٔ شوق تراشے ہے پناہیں

مت مردمکِ دیدہ میں سمجھو یہ نگاہیں
م
ہیں جمع سویدائے دلِ چشم میں آہیں

قیامت ہے کہ سن لیلےٰ کا دشتِ قیس میں آنا
تعجّب سے وہ بولا یوں بھی ہوتا ہے زمانے میں؟

دلِ نازک پہ اس کے رحم آتا ہے مجھے غالبؔ
نہ کر سرگرم اس کافر کو الفت آزمانے میں

برشگالِ دیدۂ عاشق ہے دیکھا چاہیے
کھل گئی مانندِ گل سو جا سے دیوارِ چمن

الفتِ گل سے غلط ہے دعویٔ وارستگی
سرو ہے با وصفِ آزادی گرفتارِ چمن

معافِ بیہدہ گوئی ہیں ناصحانِ عزیز ۔ دلے بہ دستِ نگارے نہ دادہ رکھتے ہیں
زمانہ سخت کم آزار ہے بجانِ اسد
وگرنہ ہم تو توقع زیادہ رکھتے ہیں

دل لگا کر لگ گیا اُن کو بھی تنہا بیٹھنا م بارے اپنے دردِ دل کی ہم نے پائی داد یاں
ہے مری وحشت عدوئے اعتبارات جہاں
ہیں زوال آمادہ اجزا آفرینش کے تمام ۔ مہرِ گردوں ہے چراغِ رہگذارِ باد یاں

از مہر تا بہ ذرہ دل و دل ہے آئینہ ۔ طوطی کو شش جہت سے مقابل ہے آئینہ

حاصل سے ہاتھ دھو بیٹھ اے آرزو خرامی ۔ دل جوشِ گریہ میں ہے ڈوبی ہوئی اسامی
اُس شمع کی طرح سے جس کو کوئی بجھا دے م میں بھی جلے ہوؤں میں ہوں داغِ ناتمامی

رحم کر ظالم کہ کیا بودِ چراغِ کشتہ ہے ۔ نبضِ بیمارِ وفا دودِ چراغِ کشتہ ہے
دل لگی کی آرزو بے چین رکھتی ہے ہمیں م ورنہ یاں بے رونقی سودِ چراغِ کشتہ ہے

تغافل دوست ہوں۔ میرا دماغِ عجز عالی ہے ۔ اگر پہلو تہی کیجے۔ تو جا میری بھی خالی ہے
رہا آباد عالم اہلِ ہمت کے نہ ہونے سے ۔ بھرے ہیں جس قدر جام و سبو میخانہ خالی ہے

خطر ہے رشتۂ الفت رگِ گردن نہ ہو جائے ۔ غرورِ دوستی آفت ہے تو دشمن نہ ہو جائے
سمجھ اس فصل میں کوتاہیِ نشو و نما غالب ۔ اگر گل سرو کے قامت پہ پیراہن نہ ہو جائے

حسنِ بے پروا خریدارِ متاعِ جلوہ ہے
آئینہ زانوئے فکرِ اختراعِ جلوہ ہے
تاکجا اے آگہی رنگِ تماشا باختن
چشمِ واگر دیدہ آغوشِ وداعِ جلوہ ہے

غم و عشرت قدمبوسِ دلِ تسلیم آئیں ہے
دعائے مدعا گم کردگانِ عشق "آمیں" ہے
لبِ عیسےٰ کی جنبش کرتی ہے گہوارہ جنبانی
قیامت کشتۂ لعلِ بتاں کا خوابِ سنگیں ہے

رُباعیات

بعد از اتمامِ بزمِ عیدِ اطفال
ایامِ جوانی رہے ساغر کشِ حال
آپہنچے ہیں تا سوادِ اقلیمِ عدم
اے عمرِ گذشتہ ایک قدم استقبال

شب زلف و رخِ عرق فشاں کا غم تھا
کیا شرح کروں کہ طرفہ تر عالم تھا
رویا میں ہزار آنکھ سے صبح تلک
ہر قطرۂ اشک دیدۂ پُرنم تھا

دل تھا کہ جو جانِ دردِ تمہید سہی
بے تابیِ رشک و حسرتِ دید سہی
ہم اور فسردن اے تجلی افسوس!
تکرار روا نہیں تو تجدید سہی

ہے خلق حسد قماش لڑنے کے لئے
وحشت کدہ تلاش لڑنے کے لئے
یعنی ہر بار صورتِ کاغذِ باد
ملتے ہیں یہ بدمعاش لڑنے کے لئے

اے کثرتِ فہم بے شمار اندیشہ ہے اصلِ خرد سے شرمسار اندیشہ
یک قطرۂ خون و دعوتِ صد نشتر یک وہم و عبادتِ ہزار اندیشہ

مشکل ہے زبس کلام میرا اے دِل! سُن سُن کے اِسے سخنورانِ کامل
آساں کہنے کی کرتے ہیں فرمائش گویم مُشکل وگرنہ گویم مُشکل!

اِلتجا

یا علی دانی کہ رویم سوئے تست از ہرنوردم ہرچہ آغازم مخاطب دانمت در ہر خطاب
مُوئے آتش دیدہ را مانم کہ بہرِ خویشتنم حلقۂ دامِ فنا گردیدہ ام از پیچ و تاب
غافل از رفتارِ عمر و فارغ از تکمیلِ عشق کردہ آغوشِ وداعِ دِل نشیمن گاہِ خواب
نقدِ آگاہی بوہم فرصتے درباختہ دستِ خالی برسر و دل پائمالِ اضطراب
خود تو میدانی کہ گردیدۂ دشتِ اُمید تشنہ ترمے گردد از بے آبیٔ موجِ سراب
دل زکار اُفتادہ و پا واماندہ و دست از ہم شکست قطعِ منزل کے تواں کردن بہ ایں حالِ خراب
مُدعا را بر زباں آوردن از بیگانگی است جُز نگاہت شاہدِ ما را کفن بادا نقاب
ذوقِ مطلب از تو و من از تو و مطلب ز تو خود تو مے بخشی و مے فہمی زبانِ اضطراب
شُعلۂ شوقے ہوس دارم ز سودائے جنوں کاتشِ افسردہ را بخشد بہارِ التہاب
دین و دُنیا را بلا گردانِ نازت کردہ ام جلوۂ رنگیں تر از صد گُلشنِ خلد انتخاب

حرمتِ جانِ محمدؐ یک نظر کُن سُوئے من
یا علیؓ یا مُرتضےؓ یا بوالحسنؓ یا بُوترابؓ

خمخانۂ شباب

۱۸۲۱ء تا ۱۸۲۷ء

آتے ہیں غیب سے یہ مضامیں خیال میں
غالبؔ صریرِ خامہ نوائے سروش ہے

غزلیات

دھمکی میں مر گیا جو نہ بابِ نبرد تھا
عشقِ نبرد پیشہ طلب گارِ مرد تھا

تھا زندگی میں موت کا کھٹکا لگا ہُوا
اُڑنے سے پیشتر بھی مرا رنگ زرد تھا

تالیفِ نسخہ ہائے وفا کر رہا تھا مَیں
مجموعۂ خیال ابھی فرد فرد تھا

دِل تا جگر کہ ساحلِ دریائے خوں ہے، اب
اِس رہگذر میں جلوۂ گُل آگے گرد تھا

جاتی ہے کوئی کشمکش اندوہِ عشق کی؟
دِل بھی اگر گیا تو وہی دل کا درد تھا

احباب چارہ سازیٔ وحشت نہ کر سکے
زنداں میں بھی خیال بیاباں نورد تھا

یہ لاشِ بے کفن اسدِؔ خستہ جاں کی ہے
حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا

ستائش گر ہے زاہد اس قدر جس باغِ رضواں کا
وہ اک گلدستہ ہے ہم بیخودوں کے طاقِ نسیاں کا

بیاں کیا کیجئے بیدادِ کاوشہائے مژگاں کا
کہ ہر اک قطرۂ خوں دانہ ہے تسبیحِ مرجاں کا

نہ آئی سطوتِ قاتل بھی مانع میرے نالوں کو
لیا دانتوں میں جو تنکا ہوا ریشہ نیستاں کا

دکھاؤں گا تماشا دی اگر فرصت زمانے نے
مرا ہر داغِ دل اِک تخم ہے سروِ چراغاں کا

کیا آئینہ خانے کا وہ نقشہ تیرے جلوے نے
کرے جو پرتوِ خورشید عالم شبنمستاں کا

مری تعمیر میں مضمر ہے اک صورت خرابی کی
ہیولےٰ برقِ خرمن کا ہے خونِ گرمِ دہقاں کا

اُگا ہے گھر میں ہر سو سبزہ۔ ویرانی تماشا کو
مدار اب کھودنے پر گھاس کے ہے میرے درباں کا

خموشی میں نہاں خوں گشتہ لاکھوں آرزوئیں ہیں
چراغِ مُردہ ہوں میں بے زباں گورِ غریباں کا

ہنوز اِک پرتوِ نقشِ خیالِ یار باقی ہے
دلِ افسردہ گویا حجرہ ہے یُوسف کے زنداں کا

بغل میں غیر کی آج آپ سوئے ہیں کہیں ورنہ
سبب کیا خواب میں آکر تبسم ہائے پنہاں کا؟

نہیں معلوم کس کس کا لہو پانی ہوا ہو گا

قیامت ہے سرشک آلودہ ہونا تیری مژگاں کا

نظر میں ہے ہماری جادۂ راہِ فنا غالبؔ
کہ یہ شیرازہ ہے عالم کے اجزائے پریشاں کا

محرم نہیں ہے تو ہی نواہائے راز کا
یاں ورنہ جو حجاب ہے پردہ ہے ساز کا

رنگِ شکستہ صبحِ بہارِ نظارہ ہے
یہ وقت ہے شگفتنِ گلہائے ناز کا

تو اور سوئے غیر نظرہائے تیز تیز!
میں اور دُکھ تری مژہ ہائے دراز کا

صرفہ ہے ضبطِ آہ میں میرا۔ وگرنہ میں
طعمہ ہوں ایک ہی نفسِ جاں گداز کا

ہیں بسکہ جوشِ بادہ سے شیشے اچھل رہے
ہر گوشۂ بساط ہے سر شیشہ باز کا

کاوش کا دل کرے ہے تقاضا کہ ہے ہنوز
ناخن پہ قرض اُس گرہِ نیم باز کا

تاراجِ کاوشِ غمِ ہجراں ہُوا اسدؔ
سینہ کہ تھا دفینہ گہرہائے راز کا

دوست غمخواری میں میری سعی فرمائیں گے کیا؟
زخم کے بھرنے تلک ناخن نہ بڑھ آئیں گے کیا؟

بے نیازی حد سے گزری بندہ پرور کب تلک
ہم کہیں گے حالِ دل اور آپ فرمائیں گے کیا؟

حضرتِ ناصح گر آئیں دیدہ و دل فرشِ راہ
کوئی مجھ کو یہ تو سمجھا دے کہ سمجھائیں گے کیا؟

آج واں تیغ و کفن باندھے ہوئے جاتا ہوں میں
عذر میرے قتل کرنے میں وہ اب لائیں گے کیا؟

گر کیا ناصح نے ہم کو قید اچھا یوں سہی
یہ جنونِ عشق کے انداز چھٹ جائیں گے کیا؟

خانہ زادِ زلف ہیں زنجیر سے بھاگیں گے کیوں؟
ہیں گرفتارِ وفا زنداں سے گھبرائیں گے کیا؟

ہے اب اس معمورے میں قحطِ غمِ الفت اسدؔ
ہم نے یہ مانا کہ دلی میں رہیں کھائیں گے کیا؟

ہوس کو ہے نشاطِ کار کیا کیا — نہ ہو مرنا تو جینے کا مزا کیا
تجاہل پیشگی سے مدعا کیا ؟ — کہاں تک اے سراپا ناز "کیا کیا"؟
نوازش ہائے بے جا دیکھتا ہوں — شکایت ہائے رنگیں کا گلا کیا
نگاہِ بے محابا چاہتا ہوں — تغافل ہائے تمکیں آزما کیا
فروغِ شعلۂ خس یک نفس ہے — ہوس کو پاسِ ناموسِ وفا کیا
نفس موجِ محیطِ بیخودی ہے — تغافل ہائے ساقی کا گلا کیا
دماغِ عطرِ پیراہن نہیں ہے — غمِ آوارگی ہائے صبا کیا
دلِ ہر قطرہ ہے سازِ انا البحر — ہم اُس کے ہیں ہمارا پوچھنا کیا
محابا کیا ہے ؟ میں ضامن اِدھر دیکھ — شہیدانِ نگہ کا خوں بہا کیا
سُن اے غارتگرِ جنسِ وفا سُن! — شکستِ قیمتِ دل کی صدا کیا
کیا کس نے جگرداری کا دعویٰ؟ — شکیبِ خاطرِ عاشق بھلا کیا
یہ قاتل وعدۂ صبر آزما کیوں؟ — یہ کافر فتنۂ طاقت ربا کیا

بلائے جاں ہے غالبؔ اسکی ہر بات
عبارت کیا، اِشارت کیا، ادا کیا ۱۸۲۷ء

دل مرا سوزِ نہاں سے بے محابا جل گیا — ق — آتشِ خاموش کی مانند گویا جل گیا
دل میں ذوقِ وصل و یادِ یار تک باقی نہیں — آگ اس گھر میں لگی ایسی کہ جو تھا جل گیا
میں عدم سے بھی پرے ہوں ورنہ غافل بارہا — میری آہِ آتشیں سے بالِ عنقا جل گیا
عرض کیجے جوہرِ اندیشہ کی گرمی کہاں — کچھ خیال آیا تھا وحشت کا کہ صحرا جل گیا
دل نہیں تجھ کو دکھاتا ورنہ داغوں کی بہار — اس چراغاں کا کروں کیا کارفرما جل گیا

میں ہوں اور افسردگی کی آرزو غالبؔ کہ دل

دیکھ کر طرزِ تپاکِ اہلِ دنیا جل گیا

عرضِ نیازِ عشق کے قابل نہیں رہا ق — جس دل پہ ناز تھا مجھے وہ دل نہیں رہا
بر روئے شش جہت درِ آئینہ باز ہے — یاں امتیازِ ناقص و کامل نہیں رہا
جاتا ہوں داغِ حسرتِ ہستی لئے ہوئے — ہوں شمعِ کشتہ درخورِ محفل نہیں رہا
مرنے کی اے دل اور ہی تدبیر کر کہ میں — شایانِ دست و بازوئے قاتل نہیں رہا
وا کر دئے ہیں شوق نے بندِ نقابِ حسن — غیر از نگاہ اب کوئی حائل نہیں رہا
گو میں رہا رہینِ ستم ہائے روزگار — لیکن ترے خیال سے غافل نہیں رہا
دل سے ہوائے کشتِ وفا مٹ گئی کہ واں — حاصل سوائے حسرتِ حاصل نہیں رہا

بیدادِ عشق سے نہیں ڈرتا مگر اسدؔ
جس دل پہ ناز تھا مجھے وہ دل نہیں رہا — ۱۸۳۳ ق

عشرتِ قطرہ ہے دریا میں فنا ہو جانا — درد کا حد سے گزرنا ہے دوا ہو جانا
تجھ سے قسمت میں مری صورتِ قفلِ ابجد — تھا لکھا بات کے بنتے ہی جدا ہو جانا
دل ہوا کشمکشِ چارۂ زحمت میں تمام — مٹ گیا گھسنے میں اس عقدے کا وا ہو جانا
اب جفا سے بھی ہیں محروم ہم اللہ اللہ! — اس قدر دشمنِ اربابِ وفا ہو جانا؟
ضعف سے گریہ مبدّل بہ دمِ سرد ہوا — باور آیا ہمیں پانی کا ہوا ہو جانا
دل سے مٹنا تری انگشتِ حنائی کا خیال — ہو گیا گوشت سے ناخن کا جدا ہو جانا
ہے مجھے ابرِ بہاری کا برس کر کھلنا — روتے روتے غمِ فرقت میں فنا ہو جانا
گر نہیں نکہتِ گل کو ترے کوچے کی ہوس؟ — کیوں ہے گردِ رہِ جولانِ صبا ہو جانا؟
تاکہ تجھ پہ کھلے اعجازِ ہوائے صیقل — دیکھ برسات میں سبز آئینے کا ہو جانا

بخشے ہے جلوۂ گل ذوقِ تماشا غالبؔ
چشم کو چاہیے ہر رنگ میں وا ہو جانا

پھر ہوا وقت کہ ہو بال کشا موجِ شراب — دے بطِ مے کو دل و دستِ شنا موجِ شراب
پوچھ مت وجہ سیہ مستیٔ اربابِ چمن — سایۂ تاک میں ہوتی ہے ہوا موجِ شراب
جو ہوا غرقۂ مے بختِ رسا رکھتا ہے — سر سے گزرے پہ بھی ہے بالِ ہما موجِ شراب
ہے یہ برسات وہ موسم کہ عجب کیا ہے اگر — موجِ ہستی کو کرے فیضِ ہوا موجِ شراب
چار موج اٹھتی ہے طوفانِ طرب سے ہر سو — موجِ گل، موجِ شفق، موجِ صبا، موجِ شراب
جس قدر روحِ نباتی ہے جگر تشنۂ ناز — دے ہے تسکیں بدمِ آبِ بقا، موجِ شراب
بسکہ دوڑے ہے رگِ تاک میں خوں ہو ہو کر — شہپرِ رنگ سے ہے بال کشا موجِ شراب
موجۂ گل سے چراغاں ہے گزرگاہِ خیال — ہے تصور میں زبس جلوہ نما موجِ شراب
نشے کے پردے میں ہے محوِ تماشائے دماغ — بسکہ رکھتی ہے سرِ نشو و نما موجِ شراب
ایک عالم پہ ہے طوفانیٔ کیفیتِ فصل — موجۂ سبزۂ نوخیز سے تا موجِ شراب
شرحِ ہنگامۂ ہستی ہے زہے موسمِ گل — ہے تصور میں زبس جلوہ نما موجِ شراب

ہوش اڑتے ہیں مرے جلوۂ گل دیکھ اسدؔ
پھر ہوا وقت کہ ہو بال کشا موجِ شراب

جاتا ہوں جدھر سب کی اُٹھے ہے اُدھر انگشت — ق — یکدست جہاں مجھ سے پھرا ہے مگر انگشت
گرمی ہے زباں کی سببِ سوختنِ جاں ! — ق — ہے شمعِ شہادت کے لئے سر بسر انگشت
شوخی تیری کہے دیتی ہے احوال ہمارا — رازِ دلِ صد پارہ کی ہے پردہ در انگشت
کس لیتے ہیں باریکی و نرمی ہے کہ جوں گل — آتی نہیں پنجے میں بس اس کے نظر انگشت

افسوس کہ دنداں کا کیا رزق فلک نے — جن لوگوں کی تھی درخورِ عقدِ گہر انگشت
کافی ہے نشانی تری چھلّے کا نہ دینا — خالی مجھے دکھلا کے بوقتِ سفر انگشت

لکھتا ہوں اسدؔ سوزشِ دل سے سخنِ گرم
تا رکھ نہ سکے کوئی مرے حرف پر انگشت

آمدِ خط سے ہوا ہے سرد جو بازارِ دوست — ق — دُودِ شمعِ کشتہ تھا شاید خطِ رخسارِ دوست
برقِ خرمنِ زارِ گوہر ہے نگاہِ تیز یاں — ق — اشک ہو جاتے ہیں خشک از گرمیِ رفتارِ دوست
ہے سوا نیزے پہ اُس کے قامتِ نوخیز سے — ق — آفتابِ صبحِ محشر ہے گلِ رخسارِ دوست
اے دلِ ناعاقبت اندیش ضبطِ شوق کر — کون لا سکتا ہے تابِ جلوۂ دیدارِ دوست
خانہ ویراں سازیِ حیرت تماشا کیجیے — صورتِ نقشِ قدم ہوں رفتۂ رفتارِ دوست
عشق میں بیدادِ رشکِ غیر نے مارا مجھے — کُشتۂ دشمن ہوں آخر گرچہ تھا بیمارِ دوست
چشمِ ما روشن کہ اس بیدرد کا دل شاد ہے — دیدۂ پُرخوں ہمارا ساغرِ سرشارِ دوست
قطعہ ۱ غیر یوں کرتا ہے پُرسش مجھ سے اُس کے ہجر میں — بے تکلّف دوست ہو جیسے کوئی غمخوارِ دوست
۲ تاکہ میں جانوں کہ ہے اُس کی رسائی واں تلک — مجھ کو دیتا ہے پیامِ وعدۂ دیدارِ دوست
۳ جبکہ میں کرتا ہوں اپنا شکوۂ ضعفِ دماغ — سر کرے ہے وہ حدیثِ زلفِ عنبر بارِ دوست
۴ چپکے چپکے مجھ کو روتے دیکھ پاتا ہے اگر — ہنس کے کرتا ہے بیانِ شوخیِ گفتارِ دوست
مہربانی ہائے دشمن کی شکایت کیجیے — یا بیاں کیجے سپاسِ لذّتِ آزارِ دوست

یہ غزل اپنی مجھے جی سے پسند آئی ہے آپ
ہے ردیفِ شعر میں غالبؔ زبس تکرارِ دوست

رہا گر کوئی تا قیامت سلامت — پھر اک روز مرنا ہے حضرت سلامت

جگر کو مرے عشق خوں نابہ مشرب — لکھے ہے "خداوندِ نعمت سلامت"
دو عالم کی ہستی پہ خطِ وفا کھینچ — دل و دستِ اربابِ ہمت سلامت
علی اللرغمِ دشمن شہیدِ وفا ہوں — مبارک مبارک سلامت سلامت
نہیں گر بہ کامِ دلِ خستہ گردوں — جگر چاہیئے جوشِ حسرت سلامت
نہیں گر سرو برگِ ادراکِ معنی — تماشائے نیرنگِ صورت سلامت
نہ اوروں کی سنتا نہ کہتا ہوں اپنی — سرِ خستہ دشوارِ وحشت سلامت
وفورِ بلا ہے ہجومِ وفا ہے — سلامت ملامت، ملامت سلامت
نہ فکرِ سلامت نہ بیمِ ملامت — زخود رفتگی ہائے حیرت سلامت

رہے غالبِ خستہ مغلوبِ گردوں
یہ کیا بے نیازی ہے حضرت سلامت

کیوں جل گیا نہ تابِ رخِ یار دیکھ کر — جلتا ہوں اپنی طاقتِ دیدار دیکھ کر
آتش پرست کہتے ہیں اہلِ جہاں مجھے — سرگرمِ نالہائے شرر بار دیکھ کر
کیا آبروئے عشق جہاں عام ہو جفا — رکتا ہوں تم کو بے سبب آزار دیکھ کر
آتا ہے میرے قتل کو پر جوشِ رشک سے — مرتا ہوں اس کے ہاتھ میں تلوار دیکھ کر
ثابت ہوا ہے گردنِ مینا پہ خونِ خلق — لرزے ہے موجِ مے تری رفتار دیکھ کر
وا حسرتا کہ یار نے کھینچا ستم سے ہاتھ — ہم کو حریصِ لذتِ آزار دیکھ کر
بک جاتے ہیں ہم آپ متاعِ سخن کے ساتھ — لیکن عیارِ طبعِ خریدار دیکھ کر
زنار باندھ سبحۂ صد دانہ توڑ ڈال — رہرو چلے ہے راہ کو ہموار دیکھ کر
ان آبلوں سے پاؤں کے گھبرا گیا تھا میں — جی خوش ہوا ہے راہ کو پُر خار دیکھ کر
کیا بدگماں ہے مجھ سے۔ کہ آئینے میں مرے — طوطی کا عکس سمجھے ہے زنگار دیکھ کر

گرنی تھی ہم پہ برقِ تجلّی نہ طور پر
دیتے ہیں بادہ ظرفِ قدح خوار دیکھ کر

سر پھوڑنا وہ غالبِ شوریدہ حال کا
یاد آگیا مجھے تری دیوار دیکھ کر

ہے نازِ مفلساں زرِ از دست رفتہ پر
ہوں گل فروشِ شوخیِ داغِ کہن ہنوز

فارغ مجھے نہ جان کہ مانندِ صبح و مہر
ہے داغِ عشق زینتِ جیبِ کفن ہنوز

میخانۂ جگر میں یہاں خاک بھی نہیں
خمیازہ کھینچے ہے بتِ بیداد فن ہنوز

کب فقیروں کو رسائی بُتِ مےخوار کے پاس
تونبے بو دیجیے میخانے کی دیوار کے پاس

مژدہ اے ذوقِ اسیری کہ نظر آتا ہے
دامِ خالی قفسِ مرغِ گرفتار کے پاس

جگرِ تشنۂ آزار تسلّی نہ ہوا
جوئے خوں ہم نے بہائی بُنِ ہر خار کے پاس

مُند گئیں کھولتے ہی کھولتے آنکھیں ہے ہے
خوب وقت آئے تم اس عاشقِ بیمار کے پاس

میں بھی رُک رُک کے نہ مرتا جو زباں کے بدلے
دشنہ اک تیز سا ہوتا مرے غمخوار کے پاس

دہنِ شیر میں جا بیٹھیے لیکن اے دل
نہ کھڑے ہوجیے خوبانِ دل آزار کے پاس

دیکھ کر تجھ کو چمن بسکہ نمو کرتا ہے
خود بخود پہنچے ہے گل گوشۂ دستار کے پاس

مر گیا پھوڑ کے سر غالبِ وحشی ہے ہے
بیٹھنا اس کا وہ آکر تری دیوار کے پاس

ہے کس قدر ہلاکِ فریبِ وفائے گل
بلبل کے کاروبار پہ ہیں خندہ ہائے گل

آزادیِ نسیم مبارک کہ ہر طرف
ٹوٹے پڑے ہیں حلقۂ دامِ ہوائے گل

جو تھا سو موجِ رنگ کے دھوکے میں مر گیا
اے وائے نالۂ لبِ خونیں نوائے گل

خوشحال اُس حریفِ سیہ مست کا کہ جو
رکھتا ہو مثلِ سایۂ گل سر بپائے گل

ایجاد کرتی ہے اُسے تیرے لئے بہار
میرا رقیب ہے نفسِ عطر سائے گل

شرمندہ رکھتے ہیں مجھے بادِ بہار سے
مینائے بے شراب و دلِ بے ہوائے گل

سطوت سے تیرے جلوۂ حسنِ غیور کی
خوں ہے مری نگاہ میں رنگِ ادائے گل

تیرے ہی جلوے کا ہے یہ دھوکا کہ آج تک
بے اختیار دوڑے ہے گل در قفائے گل

غالب مجھے ہے اُس سے ہم آغوشی آرزو
جس کا خیال ہے گلِ جیبِ قبائے گل

وہ فراق اور وہ وصال کہاں
وہ شب و روز و ماہ و سال کہاں

فرصتِ کاروبارِ شوق کسے
ذوقِ نظارۂ جمال کہاں

دل تو دل وہ دماغ بھی نہ رہا
شورِ سودائے خط و خال کہاں

تھی وہ اک شخص کے تصوّر سے
اب وہ رعنائیِ خیال کہاں

ایسا آساں نہیں لہو رونا
دل میں طاقت جگر میں حال کہاں

ہم سے چھوٹا قمار خانۂ عشق
واں جو جائیں گرہ میں مال کہاں

فکرِ دنیا میں سر کھپاتا ہوں
میں کہاں اور یہ وبال کہاں

مضمحل ہو گئے قویٰ غالب
وہ عناصر میں اعتدال کہاں

ق

حلقے ہیں چشمہائے کشادہ بسوئے دل
ہر تارِ زلف کو نگہِ سرمہ سا کہوں

عہدے سے مدحِ ناز کے باہر نہ آسکا
گر اک ادا ہو تو اُسے اپنی قضا کہوں

میں اور صد ہزار نوائے جگر خراش
تو اور ایک وہ نشنیدن کہ کیا کہوں

ظالم مرے گماں سے مجھے منفعل نہ چاہ
ہے ہے خدا نہ کردہ تجھے بے وفا کہوں

نہیں ہے زخم کوئی بخیے کے درخور مرے تن میں
ہوا ہے تار اشکِ یاس رشتہ چشمِ سوزن میں

ہوئی ہے مانعِ ذوقِ تماشا خانہ ویرانی
(ق) کفِ سیلاب باقی ہے برنگِ پنبہ روزن میں

ودیعت خانۂ بیدادِ کاوش ہائے مژگاں ہوں
نگینِ نامِ شاہد ہے مرے ہر قطرہ خوں تن میں

بیاں کس سے ہو ظلمت گستری میرے شبستاں کی
شبِ مہ ہو جو رکھ دیں پنبہ دیواروں کے روزن میں

نکوہش مانعِ بے ربطئ شورِ جنوں آئی
ہوا ہے خندۂ احباب بخیہ جیب و دامن میں

ہوئے اُس مہروش کے جلوۂ تمثال کے آگے
پرافشاں جوہر آئینے میں مثلِ ذرّہ روزن میں

نہ جانوں نیک ہوں یا بد ہوں پر صحبت مخالف ہے
جو گل ہوں تو ہوں گلخن میں جو خس ہوں تو ہوں گلشن میں

ہزاروں دل دیئے جوشِ جنونِ عشق نے مجھ کو
سیہ ہو کر سویدا ہو گیا ہر قطرہ خوں تن میں

(ق) اسدؔ زندانئ تاثیرِ الفت ہائے خوباں ہوں

خمِ دستِ نوازش ہو گیا ہے طوق گردن میں

آبرو کیا خاک اُس گل کی جو گلشن میں نہیں
ہے گریباں ننگِ پیراہن جو دامن میں نہیں

ضعف سے اے گریہ! کچھ باقی مرے تن میں نہیں
رنگ ہو کر اُڑ گیا جو خوں کہ دامن میں نہیں

ہو گئے ہیں جمع اجزائے نگاہِ آفتاب
ذرّے اُس کے گھر کی دیواروں کے روزن میں نہیں

کیا کہوں تاریکیٔ زندانِ غم اندھیر ہے
پنبہ نورِ صبح سے کم جس کے روزن میں نہیں

رونقِ ہستی ہے عشقِ خانہ ویراں ساز سے
انجمن بے شمع ہے گر برق خرمن میں نہیں

زخم سلوانے سے مجھ پر چارہ جوئی کا ہے طعن
غیر سمجھا ہے کہ لذّت زخمِ سوزن میں نہیں

بسکہ ہیں ہم اک بہارِ ناز کے مارے ہوئے
جلوۂ گل کے سوا گرد اپنے مدفن میں نہیں

قطرہ قطرہ اک ہیولیٰ ہے نئے ناسور کا
خوں بھی ذوقِ درد سے فارغ مرے تن میں نہیں

لے گئی ساقی کی نخوت قلزم آشامی مری
موجِ مے کی آج رگِ مینا کی گردن میں نہیں

ہو فشارِ ضعف میں کیا ناتوانی کی نمود

قد کے جھکنے کی بھی گنجائش مرے تن میں نہیں

تھی وطن میں شان کیا غالب کہ ہو غربت میں قدر
بے تکلف ہوں وہ مشتِ خس کہ گلخن میں نہیں

۶۱۸۲۷

مہرباں ہو کے بلالو مجھے چاہو جس وقت
میں گیا وقت نہیں ہوں کہ پھر آ بھی نہ سکوں

ضعف میں طعنۂ اغیار کا شکوہ کیا ہے
بات کچھ سر تو نہیں ہے کہ اٹھا بھی نہ سکوں

زہر ملتا ہی نہیں مجھ کو ستمگر! ورنہ
کیا قسم ہے ترے ملنے کی کہ کھا بھی نہ سکوں

ق.گ.ب ۶۱۸۳۳

عشق تاثیر سے نومید نہیں
جاں سپاری شجرِ بید نہیں

سلطنت دست بدست آئی ہے
جامِ مے خاتمِ جمشید نہیں

ہے تجلی تری سامانِ وجود
ذرہ بے پرتوِ خورشید نہیں

رازِ معشوق نہ رسوا ہو جائے
ورنہ مر جانے میں کچھ بھید نہیں

گردشِ رنگِ طرب سے ڈر ہے
غمِ محرومیٔ جاوید نہیں

کہتے ہیں جیتے ہیں امید پہ لوگ
ہم کو جینے کی بھی امید نہیں

ذکر میرا بہ بدی بھی اُسے منظور نہیں
غیر کی بات بگڑ جائے تو کچھ دور نہیں

وعدۂ سیرِ گلستاں ہے خوشا طالعِ شوق
مژدۂ قتل مقدر ہے جو مذکور نہیں

شاہدِ ہستیٔ مطلق کی کمر ہے عالم
لوگ کہتے ہیں کہ "ہے" پر ہمیں منظور نہیں

قطرہ اپنا بھی حقیقت میں ہے دریا لیکن
ہم کو تقلیدِ تنک ظرفیٔ منصور نہیں

حسرت اے ذوقِ خرابی کہ وہ طاقت نہ رہی
عشقِ پُر عربدہ کی گوں تنِ رنجور نہیں

میں جو کہتا ہوں "کہ ہم لینگے قیامت میں تمہیں"
کس رعونت سے وہ کہتے ہیں کہ "ہم حور نہیں"

ظلم کر ظلم اگر لطف دریغ آتا ہو
تو تغافل میں کسی رنگ سے معذور نہیں

صاف دُردی کشِ پیمانۂ جم ہیں ہم لوگ
وائے وہ بادہ کہ افشردۂ انگور نہیں

ہوں ظہوری کے مقابل میں خفائی غالب
میرے دعوے پہ یہ حجت ہے کہ مشہور نہیں ۱۸۲۷ء

نالہ جز حسنِ طلب اے ستم ایجاد نہیں
ہے تقاضائے جفا شکوۂ بیداد نہیں

عشق و مزدوریٔ عشرت گہِ خسرو کیا خوب!
ہم کو تسلیم نکونامیٔ فرہاد نہیں

کم نہیں وہ بھی خرابی میں۔ پہ وسعت معلوم!
دشت میں ہے مجھے وہ عیش کہ گھر یاد نہیں

اہلِ بینش کو ہے طوفانِ حوادث مکتب
لطمۂ موج کم از سیلیٔ استاد نہیں

وائے محرومیٔ تسلیم و بدا حالِ وفا
جانتا ہے کہ ہمیں طاقتِ فریاد نہیں

رنگِ تمکینِ گل و لالہ پریشاں کیوں ہے؟
گر چراغانِ سرِ رہگذرِ باد نہیں

سبدِ گل کے تلے بند کرے ہے گلچیں
مژدہ اے مرغ! کہ گلزار میں صیاد نہیں

نفی سے کرتی ہے اثبات تراوش گویا
دی ہے جائے دہن اس کو دمِ ایجاد نہیں

کم نہیں جلوہ گری میں ترے کوچے سے بہشت
یہی نقشہ ہے ولے اس قدر آباد نہیں

کرتے کس منہ سے ہو غربت کی شکایت غالب
تم کو بے مہریٔ یارانِ وطن یاد نہیں؟ ۱۸۲۷ء

یہ ہم جو ہجر میں دیوار و در کو دیکھتے ہیں
کبھی صبا کو کبھی نامہ بر کو دیکھتے ہیں

وہ آئیں گھر میں ہمارے خدا کی قدرت ہے
کبھی ہم ان کو کبھی اپنے گھر کو دیکھتے ہیں

نظر لگے نہ کہیں ان کے دست و بازو کو
یہ لوگ کیوں مرے زخمِ جگر کو دیکھتے ہیں

ترے جواہرِ طرفِ کلہ کو کیا دیکھیں
ہم اوجِ طالعِ لعل و گہر کو دیکھتے ہیں

دیوانگی سے دوش پہ زنّار بھی نہیں
یعنی ہماری جیب میں اک تار بھی نہیں

دل کو نیازِ حسرتِ دیدار کر چکے
دیکھا تو ہم میں طاقتِ دیدار بھی نہیں

ملنا اگر ترا نہیں آساں تو سہل ہے
دشوار تو یہی ہے کہ دشوار بھی نہیں

شوریدگی کے ہاتھ سے ہے سر وبالِ دوش
صحرا میں اے خدا! کوئی دیوار بھی نہیں

بے عشق عمر کٹ نہیں سکتی ہے اور یاں
طاقت بقدرِ لذتِ آزار بھی نہیں

گنجائشِ عداوتِ اغیار اک طرف
یاں دل میں ضعف سے ہوسِ یار بھی نہیں

ڈر نالہائے زار سے میرے۔ خدا کو مان
آخر نوائے مرغِ گرفتار بھی نہیں

دل میں ہے یار کی صفِ مژگاں سے رُوکشی
حالانکہ طاقتِ خلشِ خار بھی نہیں

اس سادگی پہ کون نہ مر جائے اے خدا!
لڑتے ہیں اور ہاتھ میں تلوار بھی نہیں

دیکھا اسدؔ کو خلوت و جلوت میں بارہا
دیوانہ گر نہیں ہے تو ہشیار بھی نہیں

مزے جہان کے اپنی نظر میں خاک نہیں
سوائے خونِ جگر۔ سو۔ جگر میں خاک نہیں

مگر غبار ہوئے پر ہوا اڑا لے جائے
وگرنہ تاب و تواں بال و پر میں خاک نہیں

یہ کس بہشت شمائل کی آمد آمد ہے
کہ غیرِ جلوۂ گل رہگذر میں خاک نہیں

بھلا اسے نہ سہی۔ کچھ مجھی کو رحم آتا
اثر مرے نفسِ بے اثر میں خاک نہیں

خیالِ جلوۂ گل سے خراب ہیں میکش
شراب خانے کے دیوار و در میں خاک نہیں

ہوا ہوں عشق کی غارت گری سے شرمندہ　　سوائے حسرتِ تعمیر گھر میں خاک نہیں

ہمارے شعر ہیں اب صرف دل لگی کے اسدؔ
کھلا کہ فائدہ عرضِ ہنر میں خاک نہیں

وارستہ اس سے ہیں کہ محبت ہی کیوں نہ ہو　　کیجے ہمارے ساتھ عداوت ہی کیوں نہ ہو

چھوڑا نہ مجھ میں ضعف نے رنگ اختلاط کا　　ہے دل پہ بار نقشِ محبت ہی کیوں نہ ہو

ہے مجھ کو تجھ سے تذکرۂ غیر کا گلہ　　ہر چند بر سبیلِ شکایت ہی کیوں نہ ہو

پیدا ہوئی ہے کہتے ہیں ہر درد کی دوا　　یوں ہو تو چارۂ غمِ الفت ہی کیوں نہ ہو

ڈالا نہ بے کسی نے کسی سے معاملہ　　اپنے سے کھینچتا ہوں خجالت ہی کیوں نہ ہو

ہے آدمی بجائے خود اک محشرِ خیال　　ہم انجمن سمجھتے ہیں خلوت ہی کیوں نہ ہو

ہنگامۂ زبونیٔ ہمت ہے انفعال　　حاصل نہ کیجے دہر سے عبرت ہی کیوں نہ ہو

وارستگی بہانۂ بے گانگی نہیں　　اپنے سے کر، نہ غیر سے، وحشت ہی کیوں نہ ہو

مٹتا ہے فوتِ فرصتِ ہستی کا غم کہیں　　عمرِ عزیز صرفِ عبادت ہی کیوں نہ ہو

اس فتنہ خو کے در سے اب اٹھتے نہیں اسدؔ
اس میں ہمارے سر پہ قیامت ہی کیوں نہ ہو

دھوتا ہوں جب میں پینے کو اس سیم تن کے پانو　　رکھتا ہے ضد سے کھینچ کے باہر لگن کے پانو

دی سادگی سے جان پڑوں کوہ کن کے پانو　　ہیہات کیوں نہ ٹوٹ گئے پیرزن کے پانو

بھاگے تھے ہم بہت، سو اسی کی سزا ہے یہ　　ہو کر اسیر دابتے ہیں راہزن کے پانو

مرہم کی جستجو میں پھرا ہوں جو دور دور　　تن سے سوا فگار ہیں اس خستہ تن کے پانو

اللہ رے ذوقِ دشت نوردی کہ بعدِ مرگ　　ہلتے ہیں خود بخود مرے اندر کفن کے پانو

ہے جوشِ گل بہار میں یاں تک کہ ہر طرف — اُڑتے ہوئے اُلجھتے ہیں مرغِ چمن کے پانو
بے چارہ کتنی دور سے آیا ہے شیخ جی — کعبے میں کیوں دبائیں نہ ہم برہمن کے پانو
شب کو کسی کے خواب میں آیا نہ ہو کہیں — دُکھتے ہیں آج اس بتِ نازک بدن کے پانو

غالب مرے کلام میں کیونکر مزا نہ ہو؟
پیتا ہوں دھو کے خسروِ شیریں سخن کے پانو

واں پہنچکر جو غش آتا پئے ہم ہے ہم کو — صد رہ آہنگِ زمیں بوسِ قدم ہے ہمکو
دل کو میں اور مجھے دل محوِ وفا رکھتا ہے — کس قدر ذوقِ گرفتاریٔ ہم ہے ہم کو
ضعف سے نقشِ پئے مور ہے طوقِ گردن — تیرے کوچے سے کہاں طاقتِ رم ہے ہم کو
جان کر کیجے تغافل کہ کچھ اُمید بھی ہو — یہ نگاہِ غلط انداز تو سم ہے ہم کو
رشکِ ہم طرحی و دردِ اثرِ بانگِ حزیں — نالۂ مرغِ سحر تیغِ دو دم ہے ہمکو
سر اڑانے کے جو وعدے کو مکرر چاہا — ہنس کے بولے کہ "ترے سر کی قسم ہے ہمکو"
دل کے خوں کرنے کی کیا وجہ؟ ولیکن ناچار — پاسِ بے رونقیٔ دیدہ اہم ہے ہمکو
تم وہ نازک کہ خموشی کو فغاں کہتے ہو — ہم وہ عاجز کہ تغافل بھی ستم ہے ہمکو
لکھنؤ آنے کا باعث نہیں کھلتا یعنی — ہوسِ سیر و تماشا سو وہ کم ہے ہم کو
مقطعِ سلسلۂ شوق نہیں ہے یہ شہر — عزمِ سیرِ نجف و طوفِ حرم ہے ہم کو

لئے جاتی ہے کہیں ایک توقع غالب
جادۂ رہ کششِ کافِ کرم ہے ہمکو — ۱۸۲۷ء

ایک جا حرفِ وفا لکھا تھا سو بھی مٹ گیا — ق — ظاہرا کاغذ ترے خط کا غلط بردار ہے

اُے سرِ شوریدہ! نازِ عشق و پاسِ آبرو ق
یک طرف سودا و یک سو منتِ دستار ہے

جی جلے ذوقِ فنا کی ناتمامی پر نہ کیوں
ہم نہیں جلتے نفس ہر چند آتش بار ہے

آگ سے پانی میں بجھتے وقت اُٹھتی ہے صدا
ہر کوئی واماندگی میں نالے سے ناچار ہے

ہے وہی بدمستیٔ ہر ذرہ کا خود عذر خواہ
جس کے جلوے سے زمیں تا آسماں سرشار ہے

مجھ سے مت کہہ "تو ہمیں کہتا تھا اپنی زندگی"
زندگی سے بھی مرا جی اِن دنوں بیزار ہے

آنکھ کی تصویر سرنامے پہ کھینچی ہے کہ تا
تجھ پہ کھل جاوے کہ اس کو حسرتِ دیدار ہے

بسختی ہائے قیدِ زندگی معلوم آزادی ق
شرر دربندِ دامِ رشتۂ رگہائے خارا ہے

اسدؔ باس تمنا سے نہ رکھ اُمید آزادی ق
گدازِ آرزو ہا آبیارِ آرزو ہا ہے

مری ہستی فضائے حیرت آبادِ تمنا ہے
جسے کہتے ہیں نالہ وہ اسی عالم کا عنقا ہے

خزاں کیا؟ فصلِ گل کہتے ہیں کسکو؟ کوئی موسم ہو
وہی ہم ہیں قفس ہے اور ماتم بال و پر کا ہے

وفائے دلبراں ہے اتفاقی۔ ورنہ اے ہمدم!
اثر فریادِ دلہائے حزیں کا کس نے دیکھا ہے

نہ لائے شوخیٔ اندیشہ تابِ رنجِ نومیدی
کفِ افسوس ملنا عہدِ تجدیدِ تمنا ہے

ہو سکے کیا خاک دست و بازوئے فرہاد سے ق
بے ستوں خوابِ گرانِ خسروِ پرویز ہے

ان ستم کیشوں کے کھائے ہیں زبس تیرِ نگاہ ق
پردۂ بادام یک غربالِ حسرت بیز ہے

ہے بہارِ تیز رو گلگونِ نکہت پر سوار
یک شکستِ رنگِ گل صد جنبشِ مہمیز ہے

کیوں نہ ہو چشمِ بتاں محوِ تغافل کیوں نہ ہو؟
یعنی اس بیمار کو نظارے سے پرہیز ہے

مرتے مرتے دیکھنے کی آرزو رہ جائے گی
وائے ناکامی کہ اس کافر کا خنجر تیز ہے

(ق) عارض گل دیکھ روئے یار یاد آیا اسد
جوشش فصل بہاری اشتیاق انگیز ہے

مسجد کے زیر سایہ خرابات چاہیے
بھوں پاس آنکھ قبلۂ حاجات چاہیے

عاشق ہوئے ہیں آپ بھی اک اور شخص پر
آخر ستم کی کچھ تو مکافات چاہیے

دے داد اے فلک! دل حسرت پرست کی
ہاں کچھ نہ کچھ تلافیٔ مافات چاہیے

سیکھے ہیں مہ رخوں کے لیے ہم مصوری
تقریب کچھ تو بہر ملاقات چاہیے

مے سے غرض نشاط ہے کس روسیاہ کو
اک گونہ بیخودی مجھے دن رات چاہیے

ہے رنگ لالہ و گل و نسریں جدا جدا
ہر رنگ میں بہار کا اثبات چاہیے

سر پائے خم پہ چاہیے ہنگام بیخودی
رو سوئے قبلہ وقت مناجات چاہیے

یعنی بہ حسب گردش پیمانۂ صفات
عارف ہمیشہ مست مئے ذات چاہیے

نشو و نما ہے اصل سے غالب فروع کو
خاموشی ہی سے نکلے ہے جو بات چاہیے

عشق مجھ کو نہیں۔ وحشت ہی سہی
میری وحشت تری شہرت ہی سہی

قطع کیجے نہ تعلق ہم سے
کچھ نہیں ہے تو عداوت ہی سہی

میرے ہونے میں ہے کیا رسوائی؟
اے وہ مجلس نہیں خلوت ہی سہی

ہم بھی دشمن تو نہیں ہیں اپنے
غیر کو تجھ سے محبت ہی سہی

اپنی ہستی ہی سے ہو جو کچھ ہو
آگہی گر نہیں غفلت ہی سہی

عمر ہر چند کہ ہے برق خرام
دل کے خوں کرنے کی فرصت ہی سہی

ہم کوئی ترک وفا کرتے ہیں!
نہ سہی عشق مصیبت ہی سہی

کچھ تو دے اَے فلک ناانصاف! آہ و فریاد کی رخصت ہی سہی
ہم بھی تسلیم کی خو ڈالیں گے بے نیازی تری عادت ہی سہی
یار سے چھیڑ چلی جائے اسدؔ
گر نہیں وصل تو حسرت ہی سہی

دیکھنا قسمت کہ آپ اپنے پہ رشک آجائے ہے
میں اُسے دیکھوں بھلا کب مجھ سے دیکھا جائے ہے
ہاتھ دھو دل سے یہی گرمی گر اندیشے میں ہے
آبگینہ تندیٔ صہبا سے پگھلا جائے ہے
غیر کو یارب وہ کیوں کر منع گستاخی کرے
گر حیا بھی اس کو آتی ہے تو شرما جائے ہے
شوق کو یہ لت کہ ہر دم نالہ کھینچے جائیے
دل کی وہ حالت کہ دم لینے سے گھبرا جائے ہے
دُور چشم بد تری بزمِ طرب سے واہ واہ
نغمہ ہو جاتا ہے واں گر نالہ میرا جائے ہے
گرچہ ہے طرزِ تغافل پردہ دارِ رازِ عشق
پر ہم ایسے کھوئے جاتے ہیں کہ وہ پا جائے ہے
اس کی بزم آرائیاں سُن کر دلِ رنجور یاں
مثلِ نقشِ مدعائے غیر بیٹھا جائے ہے
ہو کے عاشق وہ پری رُخ اور نازک بن گیا
رنگ کھلتا جائے ہے جتنا کہ اڑتا جائے ہے

نقش کو اس کے مصور پر بھی کیا کیا ناز ہیں
کھینچتا ہے جس قدر اتنا ہی کھنچتا جائے ہے

سایہ میرا مجھ سے مثلِ دود بھاگے ہے اسدؔ
پاس مجھ آتش بجاں کے کس سے ٹھہرا جائے ہے

گرمِ فریاد رکھا شکلِ نہالی نے مجھے
تب اماں ہجر میں دی بردِ لیالی نے مجھے
نسیہ و نقدِ دو عالم کی حقیقت معلوم
لے لیا مجھ سے مری ہمتِ عالی نے مجھے
کثرت آرائیِ وحدت ہے پرستاریِ وہم
کر دیا کافر ان اصنامِ خیالی نے مجھے
ہوسِ گل کا تصور میں بھی کھٹکا نہ رہا
عجب آرام دیا بے پر و بالی نے مجھے

سادگی پر اس کی مر جانے کی حسرت دل میں ہے
بس نہیں چلتا کہ پھر خنجر کفِ قاتل میں ہے
دیکھنا تقریر کی لذت کہ جو اس نے کہا
میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے
گرچہ ہے کس کس برائی سے ولے با ایں ہمہ
ذکر میرا مجھ سے بہتر ہے کہ اس محفل میں ہے
بس ہجومِ ناامیدی! خاک میں مل جائیگی
یہ جو اک لذت ہماری سعیِ بے حاصل میں ہے
رنجِ رہ کیوں کھینچیے؟ واماندگی کو عشق ہے
اٹھ نہیں سکتا ہمارا جو قدم منزل میں ہے

جلوہ زارِ آتشِ دوزخ ہمارا دل سہی
فتنۂ شورِ قیامت کس کے آب و گل میں ہے

گ۔ب　ہے دلِ شوریدۂ غالب طلسمِ پیچ و تاب
(ق)　۱۸۳۳ء　رحم کر اپنی تمنا پر کہ کس مشکل میں ہے

دل سے تری نگاہ جگر تک اتر گئی　　دونوں کو اک ادا میں رضامند کر گئی
شق ہو گیا ہے سینہ خوشا لذتِ فراق　م　تکلیفِ پردہ داریٔ زخمِ جگر گئی
وہ بادۂ شبانہ کی سرمستیاں کہاں　　اٹھیے بس اب کہ لذتِ خوابِ سحر گئی
اڑتی پھرے ہے خاک مری کوئے یار میں　　بارے اب اے ہوا ہوسِ بال و پر گئی
دیکھو تو دلفریبیٔ اندازِ نقشِ پا　　موجِ خرامِ یار بھی کیا گل کتر گئی
ہر بوالہوس نے حسن پرستی شعار کی　　اب آبروئے شیوۂ اہلِ نظر گئی
نظارے نے بھی کام کیا واں نقاب کا　　مستی سے ہر نگہ ترے رخ پر بکھر گئی
فردا و دی کا تفرقہ یک بار مٹ گیا　　کل تم گئے کہ ہم پہ قیامت گذر گئی

گ۔ب　مارا زمانے نے اسداللہ خاں تمہیں
ق　۱۸۳۳ء　وہ ولولے کہاں وہ جوانی کدھر گئی؟

پھر کچھ اک دل کو بے قراری ہے　　سینہ جویائے زخمِ کاری ہے
پھر جگر کھودنے لگا ناخن　　آمدِ فصلِ لالہ کاری ہے
قبلۂ مقصدِ نگاہِ نیاز　　پھر وہی پردۂ عماری ہے
چشم دلالِ جنسِ رسوائی!　　دل خریدارِ ذوقِ خواری ہے
وہی صد رنگ نالہ فرسائی　　وہی صد گونہ اشکباری ہے

دل ہوائے خرامِ ناز سے پھر — محشرستانِ بیقراری ہے
جلوہ پھر عرضِ ناز کرتا ہے — روزِ بازارِ جاں سپاری ہے
پھر اسی بے وفا پہ مرتے ہیں — پھر وہی زندگی ہماری ہے
پھر کھلا ہے درِ عدالتِ ناز — گرم بازارِ فوجداری ہے
ہو رہا ہے جہان میں اندھیر — زلف کی پھر سرشتہ داری ہے
پھر دیا پارۂ جگر نے سوال — ایک فریاد و آہ و زاری ہے
پھر ہوئے ہیں گواہِ عشق طلب — اشکباری کا حکم جاری ہے
دل و مژگاں کا جو مقدمہ تھا — آج پھر اس کی روبکاری ہے

بے خودی بے سبب نہیں غالب
کچھ تو ہے جس کی پردہ داری ہے

بے اعتدالیوں سے سبک سب میں ہم ہوئے — جتنے زیادہ ہو گئے اتنے ہی کم ہوئے
پنہاں تھا دامِ سخت قریب آشیان کے — اڑنے نہ پائے تھے کہ گرفتار ہم ہوئے
ہستی ہماری اپنی فنا پر دلیل ہے — یاں تک مٹے کہ آپ ہی اپنی قسم ہوئے
سختی کشانِ عشق کی پوچھے ہے کیا خبر — وہ لوگ رفتہ رفتہ سراپا الم ہوئے
تیری وفا سے کیا ہو تلافی؟ کہ دہر میں — تیرے سوا بھی ہم پہ بہت سے ستم ہوئے
لکھتے رہے جنوں کی حکایاتِ خونچکاں — ہرچند اس میں ہاتھ ہمارے قلم ہوئے
اللہ ری تیری تندیٔ خو جس کے بیم سے — اجزائے نالہ دل میں مرے رزقِ ہم ہوئے
اہلِ ہوس کی فتح ہے ترکِ نبردِ عشق — جو پاؤں اٹھ گئے وہی ان کے علم ہوئے
نالے عدم میں چند ہمارے سپرد تھے — جو واں نہ کھنچ سکے سو وہ یاں آ کے دم ہوئے

چھوڑی اسد نہ ہم نے گدائی میں دل لگی

سائل ہوئے تو عاشقِ اہلِ کرم ہوئے

ظلمت کدے میں میرے شبِ غم کا جوش ہے
اِک شمع ہے دلیلِ سحر سو خموش ہے

نے مژدۂ وصال نہ نظارۂ جمال
مدّت ہوئی کہ آشتیِ چشم و گوش ہے

ہو کر شہیدِ عشق میں پائے ہزار جسم
ہر موج گردِ راہ میرے سر کو دوش ہے

مے نے کیا ہے حسنِ خود آرا کو بے حجاب
اَے شوق یاں اجازتِ تسلیمِ ہوش ہے

گوہر کو عقدِ گردنِ خوباں میں دیکھنا
کیا اوج پر ستارۂ گوہر فروش ہے

دیدار بادہ حوصلہ ساقی نگاہ مست
بزمِ خیال میکدۂ بے خروش ہے

اَے تازہ واردانِ بساطِ ہوائے دل
ق زنہار اگر تمہیں ہوسِ نائے و نوش ہے

دیکھو مجھے جو دیدۂ عبرت نگاہ ہو
میری سنو جو گوشِ نصیحت نیوش ہے

ساقی بجلوہ دشمنِ ایمان و آگہی
مطرب بہ نغمہ رہزنِ تمکین و ہوش ہے

یا شب کو دیکھتے تھے کہ ہر گوشۂ بساط
دامانِ باغبان و کفِ گل فروش ہے

لطفِ خرامِ ساقی و ذوقِ صدائے چنگ
یہ جنتِ نگاہ وہ فردوسِ گوش ہے

یا صبح دم جو دیکھیے آ کر تو بزم میں
نے وہ سرور و سوز نہ جوش و خروش ہے

داغِ فراقِ صحبتِ شب کی جلی ہوئی
اِک شمع رہ گئی ہے سو وہ بھی خموش ہے

آتے ہیں غیب سے یہ مضامیں خیال میں
غالب صریرِ خامہ نوائے سروش ہے ۱۸۲۷ء

عجب نشاط سے جلاد کے چلے ہیں ہم آگے
کہ اپنے سائے سے سر پاؤں سے ہے دو قدم آگے

قضا نے تھا مجھے چاہا خرابِ بادۂ الفت

فقط "خراب" لکھا بس نہ چل سکا قلم آگے

غمِ زمانہ نے جھاڑی نشاطِ عشق کی مستی
وگرنہ ہم بھی اٹھاتے تھے لذتِ الم آگے

خدا کے واسطے داد اس جنونِ شوق کی دینا
کہ اس کے در پہ پہنچتے ہیں نامہ بر سے ہم آگے

یہ عمر بھر جو پریشانیاں اٹھائی ہیں ہم نے
تمہارے آئیو اے طرّہ ہائے خم بہ خم آگے

دل و جگر میں پرافشاں جو ایک موجۂ خوں ہے
ہم اپنے زعم میں سمجھے ہوئے تھے اس کو دم آگے

قسم جنازے پہ آنے کی میرے کھاتے ہیں غالب
ہمیشہ کھاتے تھے جو مری جان کی قسم آگے

جس بزم میں تو ناز سے گفتار میں آوے
جاں کالبدِ صورتِ دیوار میں آوے

سائے کی طرح ساتھ پھریں سرو و صنوبر
تو اس قدِ دلکش سے جو گلزار میں آوے

تب نازِ گراں مایگیٔ اشک بجا ہے
جب لختِ جگر دیدۂ خونبار میں آوے

دے مجھ کو شکایت کی اجازت کہ ستمگر
کچھ تجھ کو مزا بھی مرے آزار میں آوے

اس چشمِ فسوں گر کا اگر پائے اشارہ
طوطی کی طرح آئینہ گفتار میں آوے

کانٹوں کی زباں سوکھ گئی پیاس سے یارب!
اک آبلہ پا وادیٔ پُرخار میں آوے

مر جاؤں نہ کیوں رشک سے؟ جب وہ تنِ نازک
آغوشِ خمِ حلقۂ زنار میں آوے

غارت گرِ ناموس نہ ہو گر ہوسِ زر
کیوں شاہدِ گل باغ سے بازار میں آوے

تب چاکِ گریباں کا مزہ ہے دلِ ناداں
جب اک نفَس الجھا ہوا ہر تار میں آوے

آتشکدہ ہے سینہ مرا رازِ نہاں سے
اے وائے اگر معرضِ اظہار میں آوے
گنجینۂ معنی کا طلسم اسکو سمجھئے
جو لفظ کہ غالب مرے اشعار میں آوے

کب وہ سنتا ہے کہانی میری
اور پھر وہ بھی زبانی میری
خلشِ غمزۂ خوں ریز نہ پوچھ!
دیکھ خوں نابہ فشانی میری
کیا بیاں کرکے مرا روئیں گے یار
مگر آشفتہ بیانی میری
ہوں ز خود رفتۂ بیدائے خیال
بھول جانا ہے نشانی میری
متقابل ہے مقابل میرا
رک گیا دیکھ روانی میری
قدرِ سنگِ سرِ رہ رکھتا ہوں
سخت ارزاں ہے گرانی میری
گرد بادِ رہِ بیتابی ہوں
صرصرِ شوق ہے بانی میری
دہن اس کا جو نہ معلوم ہوا
کھل گئی ہیچمدانی میری
کر دیا ضعف نے عاجز غالب
ننگِ پیری ہے جوانی میری

۱۸۲۷ء

جس زخم کی ہو سکتی ہو تدبیر رفو کی
لکھ دیجیو یا رب اسے قسمت میں عدو کی
اچھا ہے سر انگشتِ حنائی کا تصور
دل میں نظر آتی تو ہے اک بوند لہو کی
کیوں ڈرتے ہو عشاق کی بے حوصلگی سے
یاں تو کوئی سنتا نہیں فریاد کسو کی
دشنے نے کبھی منہ نہ لگایا ہو جگر کو
خنجر نے کبھی بات نہ پوچھی ہو گلو کی
صد حیف وہ ناکام کہ اک عمر سے غالب
حسرت میں رہے ایک بتِ عربدہ جو کی

چاہیے اچھوں کو جتنا چاہیے
یہ اگر چاہیں تو پھر کیا چاہیے

صحبتِ رنداں سے واجب ہے حذر
جائے مے اپنے کو کھینچا چاہیے

چاہنے کو تیرے کیا سمجھا تھا دل
بارے اب اس سے بھی سمجھا چاہیے

چاک مت کر جیب بے ایامِ گل
کچھ ادھر کا بھی اشارا چاہیے

دوستی کا پردہ ہے بیگانگی
منہ چھپانا ہم سے چھوڑا چاہیے

دشمنی نے میری کھویا غیر کو
کس قدر دشمن ہے دیکھا چاہیے

اپنی رسوائی میں کیا چلتی ہے سعی
یار ہی ہنگامہ آرا چاہیے

منحصر مرنے پہ ہو جسکی امید
ناامیدی اس کی دیکھا چاہیے

غافل ان مہ طلعتوں کیواسطے
چاہنے والا بھی اچھا چاہیے

چاہتے ہیں خوبرویوں کو اسد
آپ کی صورت تو دیکھا چاہیے

وہ آ کے خواب میں تسکینِ اضطراب تو دے
ولے مجھے تپشِ دل مجالِ خواب تو دے

کرے ہے قتل لگاوٹ میں تیرا رو دینا
تری طرح کوئی تیغِ نگہ کو آب تو دے

دکھا کے جنبشِ لب ہی تمام کر ہم کو
نہ دے جو بوسہ تو منہ سے کہیں جواب تو دے

پلا دے اوک سے ساقی جو ہم سے نفرت ہے
پیالہ گر نہیں دیتا نہ دے شراب تو دے

اسد خوشی سے مرے ہاتھ پاؤں پھول گئے

کہا جو اُس نے "ذرا میرے پاؤں داب تو دے" (ق)

فریاد کی کوئی لَے نہیں ہے
نالہ پابندِ نَے نہیں ہے

کیوں بوتے ہیں باغباں تونبے
گر باغ گدائے مَے نہیں ہے

ہرچند ہر ایک شے میں تو ہے
پر تجھ سی تو کوئی شے نہیں ہے

ہاں کھائیو مت فریبِ ہستی
ہرچند کہیں کہ "ہے" نہیں ہے

شادی سے گزر کہ غم نہ ہووے
اُردی جو نہ ہو تو دے نہیں ہے

کیوں ردِ قدح کرے ہے زاہد
مَے ہے یہ مگس کی قے نہیں ہے

ہستی ہے نہ کچھ عدم ہے غالب
آخر تو کیا ہے؟ "اے نہیں ہے"

ہم رشک کو اپنے بھی گوارا نہیں کرتے
مرتے ہیں ولے اُن کی تمنا نہیں کرتے

در پردہ انہیں غیر سے ہے ربطِ نہانی
ظاہر کا یہ پردہ ہے کہ پردا نہیں کرتے

یہ باعثِ نو اُمیدئ اربابِ ہوس ہے
غالب کو بُرا کہتے ہو اچھا نہیں کرتے

دیکھ کر در پردہ گرمِ دامن افشانی مجھے
کر گئی وابستۂ تن میری عریانی مجھے

بن گیا تیغِ نگاہِ یار کا سنگِ فساں
مرحبا میں کیا مبارک ہے گرانجانی مجھے

کیوں نہ ہو بے التفاتی اسکی خاطر جمع ہے
جانتا ہے محوِ پرسش ہائے پنہانی مجھے

میرے غم خانے کی قسمت جب رقم ہونے لگی
لکھدیا منجملۂ اسبابِ ویرانی مجھے

بدگماں ہوتا ہے وہ کافر نہ ہوتا کاش کے
اِس قدر ذوقِ نوائے مُرغِ بُستانی مجھے

وائے واں بھی شورِ محشر نے نہ دم لینے دیا — لے گیا تھا گور میں ذوقِ تن آسانی مجھے
وعدہ آنے کا وفا کیجے یہ کیا انداز ہے — تم نے کیوں سونپی ہے میرے گھر کی دربانی مجھے
ہاں نشاطِ آمدِ فصلِ بہاری واہ وا! — پھر ہوا ہے تازہ سودائے غزل خوانی مجھے
دی مرے بھائی کو حق نے از سرِ نو زندگی
میرزا یوسف ہے غالب یوسفِ ثانی مجھے

چشمِ خوباں خامشی میں بھی نوا پرداز ہے — سرمہ تو کہوے کہ دودِ شعلہ آواز ہے
پیکرِ عشاق سازِ طالعِ ناساز ہے — نالہ گویا گردشِ سیارہ کی آواز ہے
دست گاہِ دیدۂ خونبارِ مجنوں دیکھنا
یک بیاباں جلوۂ گل فرشِ پا انداز ہے

کبھی نیکی بھی اسکے جی میں گر آجائے ہے مجھ سے
جفائیں کر کے اپنی یاد شرما جائے ہی مجھ سے
خدایا جذبۂ دل کی مگر تاثیر الٹی ہے
کہ جتنا کھینچتا ہوں اور کھنچتا جائے ہی مجھ سے
وہ بدخو اور میری داستانِ عشق طولانی
عبارت مختصر۔ قاصد بھی گھبرا جائے ہی مجھ سے
ادھر وہ بدگمانی ہے۔ ادھر یہ ناتوانی ہے
نہ پوچھا جائے ہے اس سے نہ بولا جائے ہے مجھ سے
سنبھلنے دے مجھے اے ناامیدی! کیا قیامت ہے؟
کہ دامانِ خیالِ یار چھوٹا جائے ہے مجھ سے

تکلف برطرف نظارگی میں بھی سہی لیکن
وہ دیکھا جائے کب یہ ظلم دیکھا جائے ہے مجھ سے

ہوئے ہیں پاؤں ہی پہلے نبرد عشق میں زخمی
نہ بھاگا جائے ہے مجھ سے نہ ٹھہرا جائے ہے مجھ سے

قیامت ہے کہ ہووے مدعی کا ہم سفر غالب
وہ کافر جو خدا کو بھی نہ سونپا جائے ہے مجھ سے

لاغر اتنا ہوں کہ گر تو بزم میں جا دے مجھے
میرا ذمہ دیکھ کر گر کوئی بتلا دے مجھے

کیا تعجب ہے کہ اس کو دیکھ کر آ جائے رحم
واں تلک کوئی کسی حیلے سے پہنچا دے مجھے

منہ نہ دکھلاوے نہ دکھلا پر بہ انداز عتاب
کھول کر پردہ ذرا آنکھیں ہی دکھلا دے مجھے

یاں تلک میری گرفتاری سے وہ خوش ہے کہ میں
زلف گر بن جاؤں تو شانے میں الجھا دے مجھے

رونے سے اور عشق میں بیباک ہو گئے
دھوئے گئے ہم اتنے کہ بس پاک ہو گئے

صرف بہائے مے ہوئے آلات میکشی
تھے یہ ہی دو حساب سو یوں پاک ہو گئے

رسوائے دہر گو ہوئے آوارگی سے تم
بارے طبیعتوں کے تو چالاک ہو گئے

کہتا ہے کون نالۂ بلبل کو بے اثر
پردے میں گل کے لاکھ جگر چاک ہو گئے

پوچھے ہے کیا وجود و عدم اہل شوق کا
آپ اپنی آگ کے خس و خاشاک ہو گئے

کرنے گئے تھے اُس سے تغافل کا ہم گلہ
کی ایک ہی نگاہ کہ بس خاک ہو گئے

اس رنگ سے اُٹھائی کل اُسنے اسد کی نعش
دشمن بھی جس کو دیکھ کے غمناک ہو گئے

مدت ہوئی ہے یار کو مہماں کئے ہوئے
جوشِ قدح سے بزم چراغاں کئے ہوئے

کرتا ہوں جمع پھر جگرِ لخت لخت کو
عرصہ ہوا ہے دعوتِ مژگاں کئے ہوئے

پھر وضعِ احتیاط سے رُکنے لگا ہے دم
برسوں ہوئے ہیں چاکِ گریباں کئے ہوئے

پھر گرمِ نالہائے شرربار ہے نفس
مدت ہوئی ہے سیرِ چراغاں کئے ہوئے

پھر پرسشِ جراحتِ دل کو چلا ہے عشق
سامانِ صد ہزار نمکداں کئے ہوئے

پھر بھر رہا ہے خامۂ مژگاں بہ خونِ دل
سازِ چمن طرازیِ داماں کئے ہوئے

باہم دگر ہوئے ہیں دل و دیدہ پھر رقیب
نظارہ و خیال کا ساماں کئے ہوئے

دل پھر طوافِ کوئے ملامت کو جائے ہے
پندار کا صنمکدہ ویراں کئے ہوئے

پھر شوق کر رہا ہے خریدار کی طلب
عرضِ متاعِ عقل و دل و جاں کئے ہوئے

دوڑے ہے پھر ہر ایک گل و لالہ پر خیال
صد گلستاں نگاہ کا ساماں کئے ہوئے

پھر چاہتا ہوں نامۂ دلدار کھولنا
جاں نذرِ دلفریبیِ عنواں کئے ہوئے

مانگے ہے پھر کسی کو لبِ بام پر ہوس
زُلفِ سیاہ رُخ پہ پریشاں کئے ہوئے

چاہے ہے پھر کسی کو مقابل میں آرزو
سُرمے سے تیز دشنۂ مژگاں کئے ہوئے

اِک نوبہارِ ناز کو تاکے ہے پھر نگاہ
چہرہ فروغِ مے سے گلستاں کئے ہوئے

پھر جی میں ہے کہ در پہ کسی کے پڑے رہیں
سر زیرِ بارِ منتِ درباں کئے ہوئے

جی ڈھونڈتا ہے پھر وہی فرصت کہ رات دن
بیٹھے رہیں تصورِ جاناں کئے ہوئے

غالب ہمیں نہ چھیڑ کہ پھر جوشِ اشک سے
بیٹھے ہیں ہم تہیۂ طوفاں کئے ہوئے

بہر بہر رہا ہون خامہ مژگان بخون دل
ساز چمن طرازی دامان کئی ہوے

باہم دگر ہوی ہین دل و دیدہ بہر رقیب
نظارہ و خیال کا سامان کئی ہوے

دل بہر طواف کوی ملامت کو جای ہے
پندار کا صنم کدہ ویران کئی ہوے

بہر شوق کر رہا ہے خریدار کی طلب
عرض متاع عقل و دل و جان کئی ہوے

دوڑی ہے بہر ایک گل و لالہ پر خیال
صد گلستان نگاہ کا سامان کئی ہوے

بہر چاہتا ہون نامہ دلدار کہولنا
جان نذر دلفریبی عنوان کئی ہوے

مانگی ہے بہر کسو کو لب بام پر ہوس
زلف سیاہ رخ پہ پریشان کئی ہوے

چاہی ہے بہر کسو کو مقابل مین آرزو
سرمہ سی تیز دشنہ مژگان کئی ہوے

اک نوبہار ناز کو تاکی ہے بہر نگاہ
چہرہ فروغ مے سی گلستان کئی ہوے

جی ڈہونڈتا ہے بہر وہی فرصت کہ رات دن
بیٹہی رہین تصور جانان کئی ہوے

بہر جی مین ہے کہ در پہ کسو کی پڑی رہین
سر زیر بار منت دربان کئی ہوے

غالب ہمین نہ چھیڑ کہ بہر جوش اشک سے
بیٹہی ہین ہم تہیۂ طوفان کئی ہوے

تمام شد غزلیات

چکنی ڈلی

ہے جو صاحب کے کفِ دست پہ یہ چکنی ڈلی
زیب دیتا ہے اُسے جس قدر اچھا کہیے

خامہ انگشت بہ دنداں کہ اِسے کیا لکھیے
ناطقہ سر بہ گریباں کہ اُسے کیا کہیے

مُہرِ مکتوبِ عزیزانِ گرامی لکھیے
حرزِ بازوے شگرفارانِ خودآرا کہیے

مسی آلودہ سر اُنگشتِ حسیناں لکھیے
داغِ طرفِ جگرِ عاشقِ شیدا کہیے

خاتمِ دستِ سلیماںؑ کے مشابہ لکھیے
سرِ پستانِ پریزاد سے مانا کہیے

اخترِ سوختۂ قیس سے نسبت دیجے
خالِ مشکیں۔ رُخِ دل کشِ لیلا کہیے

حجر الاسودِ دیوارِ حرم کیجیے عرض
نافہ آہوئے بیابانِ ختن کا کہیے

وضع میں اس کو اگر سمجھیے قافِ تریاق
رنگ میں سبزۂ نوخیزِ مسیحا کہیے

صومعے میں اُسے ٹھہرائیے گر مُہرِ نماز
میکدے میں اسے خشتِ خمِ صہبا کہیے

کیوں اسے قفلِ درِ گنجِ محبت لکھیے؟
کیوں اسے نقطۂ پرکارِ تمنّا کہیے؟

کیوں اسے گوہرِ نایاب تصوّر کیجے؟
کیوں اسے مردمکِ دیدۂ عنقا کہیے؟

کیوں اُسے تکمۂ پیراہنِ لیلا لکھیے؟
کیوں اسے نقشِ پئے ناقۂ سلمیٰ کہیے؟

بندہ پرور کے کفِ دست کو دل کیجیے فرض
اور اس چکنی سپاری کو سویدا کہیے

کلکتہ ۱۸۳۰ء ق

تنہائی کی وادی میں

رہیے اب ایسی جگہ چل کر جہاں کوئی نہ ہو ٭ ہم سخن کوئی نہ ہو اور ہم زباں کوئی نہ ہو
بے در و دیوار سا اک گھر بنایا چاہیے ٭ کوئی ہمسایہ نہ ہو اور پاسباں کوئی نہ ہو
پڑیے گر بیمار تو کوئی نہ ہو تیمار دار
اور اگر مر جائیے تو نوحہ خواں کوئی نہ ہو

کلکتہ کی یاد

کلکتے کا جو ذکر کیا تو نے ہمنشیں ٭ اک تیر میرے سینہ میں مارا کہ ہائے ہائے
وہ سبزہ زار ہائے مطرّا کہ ہے غضب ٭ وہ نازنیں بتان خود آرا کہ ہائے ہائے
صبر آزما وہ اُن کی نگاہیں کہ حف نظر ٭ طاقت رُبا وہ اُن کا اشارہ کہ ہائے ہائے
وہ میوہ ہائے تازہ و شیریں کہ واہ واہ!
وہ بادہ ہائے ناب گوارا کہ ہائے ہائے

قطعہ

گئے وہ دن کہ ناوانستہ غیروں کی وفاداری ٭ کیا کرتے تھے تم تقریر ہم خاموش رہتے تھے
بس اب بگڑے پہ کیا شرمندگی جانے دو مل جاؤ ٭ قسم لو ہم سے گر یہ بھی کہیں "کیوں ہم نہ کہتے تھے"

متفرقات[1]

مُند گئیں کھولتے ہی کھولتے آنکھیں غالبؔ
یار لائے مرے بالیں پہ اُسے پر کس وقت

لو ہم مریضِ عشق کے تیمار دار ہیں
اچھا اگر نہ ہو تو مسیحا کا کیا علاج

مجھ کو دیارِ غیر میں مارا وطن سے دُور
رکھ لی مرے خدا نے مری بیکسی کی شرم

وہ حلقہائے زُلفِ کمیں میں ہیں اے خدا!
رکھ لیجو میرے دعوئے وارستگی کی شرم

ہو گئی ہے غیر کی شیریں بیانی کارگر
عشق کا اس کو گماں ہم بے زبانوں پر نہیں

واں اس کو ہولِ دل ہے تو یاں میں ہوں شرمسار
یعنی یہ میری آہ کی تاثیر سے نہ ہو

اپنے کو دیکھتا نہیں۔ ذوقِ ستم کو دیکھ
آئینہ تاکہ دیدۂ نخچیر سے نہ ہو

سیاہی جیسے گر جائے دمِ تحریر کاغذ پر
مری قسمت میں یوں تصویر ہے شبہائے ہجراں کی

---

[1] افسوس ہے کہ ان متفرق اشعار کے متعلق ہم تصدیق نہیں کر سکے کہ وہ ١٨٢٧ء سے پہلے یا بعد میں لکھے گئے۔ انشاءاللہ آئندہ ایڈیشن میں اس بات کی تصریح کر دی جائے گی ؁

تاہم کو شکایت کی بھی باقی نہ رہے جا — سن لیتے ہیں گو ذکر ہمارا نہیں کرتے
غالب ترا احوال سنا دینگے ہم ان کو — وہ سن کے بلا لیں یہ اجارا نہیں کرتے

گھر میں تھا کیا؟ کہ ترا غم اُسے غارت کرتا — وہ جو رکھتے تھے ہم اک حسرتِ تعمیر سو ہے

پینس میں گزرتے ہیں جو کوچے سے وہ میرے — کندھا بھی کہاروں کو بدلنے نہیں دیتے

زندگی اپنی جب اس شکل سے گزری غالب — ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ خدا رکھتے تھے

اُگ رہا ہے در و دیوار پہ سبزہ غالب — ہم بیاباں میں ہیں اور گھر میں بہار آئی ہے

نہ پوچھ نسخۂ مرہم جراحتِ دل کا — کہ اس میں ریزۂ الماس جزوِ اعظم ہے
بہت دنوں میں تغافل نے تیرے پیدا کی — وہ اک نگہ کہ بظاہر نگاہ سے کم ہے

ہوں میں بھی تماشائی نیرنگِ تمنا — مطلب نہیں کچھ اس سے کہ مطلب ہی بر آوے

رباعیات [۱]

آتشبازی ہے جیسے شغلِ اطفال ہے سوزِ جگر کا بھی اسی طور کا حال
تھا موجدِ عشق بھی قیامت کوئی لڑکوں کے لئے گیا ہے کیا کھیل نکال

دل سخت نژند ہو گیا ہے گو یا اس سے گلہ مند ہو گیا ہے گویا
پر یار کے آگے بول سکتے ہی نہیں غالب منہ بند ہو گیا ہے گویا

دکھ جی کے پسند ہو گیا ہے غالب دل رک رک کر بند ہو گیا ہے غالب
واللہ کہ شب کو نیند آتی ہی نہیں سونا سوگند ہو گیا ہے غالب

بھیجی ہے جو مجھ کو شاہِ جمجاہ نے دال ہے لطف و عنایاتِ شہنشاہ پہ دال
یہ شاہ پسند دال بے بحث و جدال ہے دولت و دین و دانش و داد کی دال

---

۱ نسخۂ شیرانی کے اخیر کے چند صفحات غائب ہیں۔ اور قرینِ قیاس ہے کہ اُن میں قطعات اور رباعیات ہونگیں۔ اُن صفحات کی کمی کی وجہ سے یقینی طور پر نہیں کہا جا سکتا۔ کہ خمخانۂ شباب کی کون سی رباعیاں اور کون سے قطعے نسخۂ شیرانی کی کتابت کے وقت لکھے جا چکے تھے۔ اور کون سے بعد میں لکھے گئے۔

ہیں شہ[ف] میں صفاتِ ذوالجلالی باہم
آثارِ جلالی و جمالی باہم
ہوں شاد نہ کیوں سافل و عالی باہم
ہے اب کی شبِ قدر و دوالی باہم

ف یہ معلوم نہیں کہ یہ رباعیات اور ردیف واوٗ کی دوسری غزل کب لکھی گئیں۔ اُن میں یا تو ظفر کے والد اکبر شاہ ثانی کی طرف اشارہ ہے۔ یا ظفر کی طرف موخّر الذکر صورت میں مرزا پر بادشاہ کی عنایات ۱۸۵۱ء سے پہلے ہی شروع ہو گئی ہوں گی۔

بہارِ عجم

ا ۔ لالۂ صحرا } ۱۸۲۷ تا ۱۸۳۸
ب ۔ گلِ رعنا }

ج ۔ بادۂ شیراز ۱۸۳۸ تا ۱۸۴۷

زخمہ بر تارِ رگِ جاں مے زنم کس چہ داند تا چہ دستاں میزنم
زخمہ بر تارم پریشاں مے رود کایں نواہائے پریشاں میزنم

راز دانِ خوئے دہرم کردہ اند
خندہ بر دانا و ناداں مے زنم

لالۂ صحرا

غزلیات

به شغلِ انتظارِ مہوشاں در خلوتِ شبہا
سرِ تارِ نظر شد رشتۂ تسبیحِ کوکبہا

بروئے برگِ گل تا قطرۂ شبنم نہ پنداری
بہار از حسرتِ فرصت بدنداں میگزد لبہا

بخلوتخانۂ کامِ نہنگِ "لا" زدم خود را
ستوہ آمد دل از ہنگامۂ غوغائے مطلبہا

کند گر فکرِ تعمیرِ خرابیہائے ما گردوں
نیاید خشت مثلِ استخواں بیروں ز قالبہا

خوشا بے رنگیٔ دل دستگاہِ شوق را نازم
نمی بالد بخود بیش ایں قطرہ از طوفانِ مشربہا

ندارد حسن در ہر حال از مشاطگی غفلت
بود تہ بندیٔ خط سبزۂ خط در تہِ لبہا

خوشا رندی و جوشِ زندہ رود و مشربِ عذبش
بہ لب خشکی چہ میری در سرِ البستانِ مذہبہا

تو خوی پنداری و دانی کہ جاں بُردم بمیدانی
کہ آتش در نہادم آب شد از گرمیٔ تبہا

مبادا ہمچو تارِ سبحہ از ہم بگسلد غالب
نفس با ایں ضعیفی بر نتابد شورِ یاربہا

برنمی آید ز چشم از جوشِ حیرانی مرا
شد نگہ زنّارِ تسبیحِ سلیمانی مرا

دامن افشانم بکیفِ بادہ و رندی تنم
وحشتی کُو تا بروں آرد ز عریانی مرا

ده که پیش از من بپابوس کسے خواهد رسید
سجدۂ شوقے که می بالد به پیشانی مرا

باهمه خرسندی از وے شکوه ها دارم همی
تا نماند صیدِ پرسشهائے پنهانی مرا

تشنه لب بر ساحلِ دریا ز غیرت جاں دهم
گر بموج افتد گمانِ چینِ پیشانی مرا

با سراج الدین احمد چاره جز تسلیم نیست
ورنه غالب نیست آهنگِ غزلخوانی مرا
(کلکته)

تا کیم دودِ شکایت ز بیاں برخیزد
بزن آتش که شنیدن ز میاں برخیزد

می رمی از من و خلقے بگمانست ز تو
بے محابا شو و بنشیں که گماں برخیزد

گر دهم شرحِ عتابے که بدلها داری
دود از کارگهِ شیشه گراں برخیزد

باقدت سرو چو شخصیست که ناگه یکبار
بے خود از جا ز هجومِ خفقاں برخیزد

بچه گیرند عیارِ هوس و عشق دگر
رسمِ بیداد مباد از جهاں برخیزد

کشتۂ دعوئ پیدائی خویشیم همه
وائے گر پرده ازیں رازِ نهاں برخیزد

زنهار از تعبِ دوزخِ جاوید مترس
خوش بهاریست کز و بیم خزاں برخیزد

جزوے از عالمم و از همه عالم بیشم
همچو موئے که بتاں را ز میاں برخیزد

عمرها چرخ بگردد که جگر سوخته
چوں من از دودهٔ آذر نفساں برخیزد

گر دهم شرحِ ستمهائے عزیزاں غالب
رسمِ امید همانا ز جهاں برخیزد
(کلکته)

شبهائے غم که چهره به خوناب شسته ایم
از دیده نقشِ وسوسهٔ خواب شسته ایم

افسونِ گریه برد ز خوبیت عتاب را
از شعلهٔ تو دود بهفت آب شسته ایم

زاهد خوشست صحبت از آلودگی مترس
کایں خرقه بارها به مئے ناب شسته ایم

اے در عتابِ رفته ز بیرنگی سرشک
غافل که امشب از مژه خوناب شسته ایم

پیمانه را ز باده بخوں پاک کرده ایم
کاشانه را ز رخت بسیلاب شسته ایم

غرقِ محیطِ وحدتِ صرفیم و در نظر — از روئے بحر موجہ و گرداب شستہ ایم
بے دست و پا بہ بحرِ توکل فتادہ ایم — از خویش گردِ زحمتِ اسباب شستہ ایم
در مسلخِ وفا ز حیا آب گشتہ ایم — خوں از جبین و دست ز قصاب شستہ ایم

غالب رسیدہ ایم بہ کلکتہ و بہ مے
از سینہ داغِ دوریِ احباب شستہ ایم

قصیدہ در منقبت

نازم بہ گرانمائگیِ دل کہ ز سودا — ہر قطرۂ خوں یافتہ پروازِ سویدا
اجزائے وجودم ز گدازے کہ ز جان یافت — پالودہ بداں شیوہ کہ دل گشت سراپا
در جیبِ رفیقاں گلِ شاداب فشاندم — ہر چند تفِ تشنگیم سوخت بہ صحرا
در بزمِ حریفاں رگِ مہتاب کشودم — گر خود ہمہ گردوں نمکم ریخت بہ صہبا
نفریں نزند سیلیِ صرصر بچراغم — تحسین نہ ماند ز رگِ سازِ من آوا
از بسکہ سیہ مستِ مے جنبشِ کلکم — در پردۂ ہر نقش دلم میرود از جا
بے راہ اگر گام زنم خردہ مگیرید — در عربدہ راہم ز دراز یست بہ پہنا
نظارۂ خوباں و مے و نغمہ حرامست — دیدیم و شنیدیم سمعنا و اطعنا
با ایں ہمہ ہر جا کنند آہنگِ خرابی — سرگرمِ شوقے کہ بود حوصلہ فرسا
با نغمۂ مطرب نتواں شد متعصب — از جلوۂ ساقی نتواں کرد تبرا
شوقست کہ چوں نشاۂ توحید رساند — از دار برد پایۂ منصور بہ بالا
شوقست کہ فرہاد از و مردہ بہ سختی — شوقست کہ مجنوں شد از و بادیہ پیما
شوقست کہ مرآئنہ را داد بہ صیقل — شوقست کہ طوطیِ طبعم شدہ گویا

شوقست کز اعجازِ اثرہائے قبولش — آئینۂ پیدائی حرف ست دعاہا
قانع بہ سخن نیستم و باک ندارم — ز خویش سپاس ست و نہ از غیر محابا
نظّارگیٔ جلوۂ اسرارِ خیالم — در آئینۂ چشمِ حسود و دلِ اعدا
ز آویزشِ دوناں ز سخن باز نمانم — سیلاب مرا زیں خس و خاشاک چہ پروا

شوقم ہمہ راز ست و من و عربدہ ہرگز
سوزم ہمہ ساز ست و من و شکوہ مبادا

۷

گر ہر دو گزیں ہمہ رعنائی و ہم ست — شاد آنکہ بہ نیرنگ نہ گردید فریبا
اندیشہ و صد گلکدہ گل بردہ بدامن — امّا ہمہ از نقش و نگارِ پرِ عنقا
آں وعظِ فقیہانۂ زاہد کہ نزیبد — بر صفحۂ دیں نقشِ رواجِ غمِ دنیا
واں نغمۂ مستانۂ رنداں کہ نیرزد — دم سردیٔ امروز بہ سرگرمیٔ فردا
آں حسن و دمِ ناز ز افسونِ ادائے — جاں باز دمیدن بہ تنِ صورتِ دیبا
واں عشق و گہِ عجز بہ امیدِ نگاہے — از خویش گزشتن بہ سرِ راہِ تمنّا
گردیدنِ ہفت اختر و نہ چرخ بہر سو — زیں عربدہ بالیدنِ آثار بہر جا
گل کردنِ صد رنگ بہار از جگرِ خاک — برجستنِ یکدستہ شرار از رگِ خارا
ہنگامۂ ابلیس نشاں دادنِ گندم — افسانۂ آوارگیٔ آدم و حوا
دانستہ شود ہرچہ ز اسرارِ تعیّن — سنجیدہ شود ہرچہ ز آثارِ من و ما
از خامۂ نقاش بروں نامدہ ہرگز — ہر نقش کہ بینی ز پسِ پردہ ہویدا
وحدت ہمہ حدّیست معیّن کہ خود از وے — ہستی ہمہ جزئیست حقیقی کہ مر او را

طرفے نتواں بست بسر گرمیٔ اوہام ہر گز نتواں کرد پراگندہ براجزا
آئینہ بہ بینش نظر و جلوہ فراواں دل پُرہوس و صاحبِ خلوتکدہ تنہا
پیدا و نہاں مشغلہ حبِ ظہورست چوں پردہ براُفگند نہ نہانست نہ پیدا

تحفۂ دیر

تعالی اللہ بنارس چشمِ بد دُور بہشتِ خرّم و فردوسِ معمور
تناسخ مشرباں چوں لب کشایند بہ کیشِ خویش کاشی را ستایند
کہ ہر کس کاندراں گلشن بمیرد دگر پیوندِ جسمانی نگیرد
چمن سرمایۂ امید گردد بمرگ آن زندہ جاوید گردد
زہے آسودگی بخش روانہا کہ داغِ چشم می شوید ز جانہا
شگفتی نیست از آب و ہوایش کہ تنہا جاں شود اندر فضایش
بیا اے غافل از کیفیتِ ناز نگاہے بر پری زادانش انداز
ہمہ جانہائے بے تن کن تماشا ندارد آب و خاک ایں جلوہ حاشا
نہادِ شاں چو بوئے گل گراں نیست ہمہ جانند جسمے در میاں نیست
خس و خارش گلستانست گوئی غبارش جوہرِ جانست گوئی
سوادش پائے تختِ بُت پرستاں سراپایش زیارت گاہِ مستاں
عبادت خانۂ ناقوسیاں ست ہمانا کعبۂ ہندوستانست
بتانش را ہیولے شعلۂ طور سراپا نورِ ایزد چشمِ بد دور
میانہا نازک و دلہا توانا ز نادانی بکارِ خویش دانا
تبسم بسکہ در لبہا طبیعست دہنہا رشکِ گلہائے ربیعست

ادائے یک گلستان جلوہ سرشار
خرامے صد قیامت فتنہ در بار

بلطف از موجِ گوہر نرم رو تر
بناز از خونِ عاشق گرم دو تر

زانگیز قد انداز خرامے
بپائے گلبنے گستردہ دامے

ز رنگیں جلوہا غارتگرِ ہوش
بہار بستر و نوروز آغوش

ز تابِ جلوۂ خویش آتش افروز
بتانِ بت پرست و برہمن سوز

بسامانِ دو عالم گلستان رنگ
ز تابِ رخ چراغانِ لبِ گنگ

قیامت قامتان مژگاں درازاں
ز مژگاں بر صفِ دل نیزہ بازاں

بہ تن سرمایۂ افزائشِ دل
سراپا مژدۂ آسائشِ دل

بہ مستی موج را فرمودہ آرام
ز لغزی آب را بخشیدہ اندام

فتادہ شورشے در قالبِ آب
ز ماہی صد دلش در سینہ بیتاب

ز بس عرضِ تمنا میکند گنگ
ز موج آغوشہا وا میکند گنگ

ز تابِ جلوہا بیتاب گشتہ
گہرہا در صدف ہا آب گشتہ

بادِ مخالف

اے تماشائیانِ بزمِ سخن
وے مسیحا دمانِ نادرِ فن

اے سخن پرورانِ کلکتہ
وے زبان آورانِ کلکتہ

اسداللہ بخت برگشتہ
در خم و پیچ عجز سرگشتہ

گرچہ ناخواندہ میہمانِ شماست
بے سخن ریزہ چینِ خوانِ شماست

بہ تظلم رسیدہ است اینجا
با امید آرمیدہ است اینجا

کارِ احباب ساختن رسم ست میہماں را نواختن رسم ست

آں رہ و رسم کارسازی کو شیوۂ میہماں نوازی کو

کیستم دل شکستہ غمزدۂ بیدلے خستۂ ستمزدۂ

برقِ بے طاقتی بجاں زدۂ آتشِ غم بجان و ماں زدۂ

از گدازِ نفس بتاب و تبے در بیابانِ یاس تشنہ لبے

خسِ طوفانیے از محیطِ بلا سر بسر گردِ کاروانِ فنا

دردمندے جگر گداختۂ از غمِ دہر زہرہ باختۂ

درِ آگاہئی فنا زدۂ ہمہ بر خویش پشتِ پا زدۂ

چہ بلاہا کشیدہ ام آخر کہ بدینجا رسیدہ ام آخر

سیہ روزِ غربتم بینید تیرہ شبہائے وحشتم بینید

اندہِ دوریئے وطن نگرید غمِ ہجرانِ انجمن نگرید

نہ ہمیں نالہ و فغاں بلبم من و جاں آفریں کہ جان بلبم

من کہ و عزمِ داوری کردن سازِ بزمِ سخنوری کردن

با بزرگاں نیازہا دارم ہم بدیں شیوہ نازہا دارم

بندہ ام بندہ مہربانان را رمزِ فہمان و نکتہ دانان را

نہ ز آویزشِ بیاں ترسم من و ایمانِ من کزاں ترسم

کہ پس از من بسالہائے دراز بزباں ماند ایں حکایت باز

کہ سفیہے رسیدہ بود اینجا چند روز آرمیدہ بود اینجا

با بزرگاں ستیزہ پیش گرفت زحمتے داد و راہِ خویش گرفت

شوخ چشمے و زشت خوئے بود بے حیائے و ہرزہ گوئے بود

برگِ دنیا نہ سازِ دینش بود ننگِ دہلی و سرزمینش بود

آہ ازاں دم کہ بعدِ رفتنِ من
خونِ دہلی بود بگردنِ من

تابِ ہنگامہ ام خدارا نیست
مہربانان دلست خارا نیست

وینکہ در پیشگاہِ بزمِ سخن
بزبانہا فتادہ است زمن

کہ فلاں با قتیلؔ نیکو نیست
مگسِ خوانِ نعمتِ اُو نیست

زلّہ بردارِ کس چرا باشم
من ہمائم مگس چرا باشم؟

فریاد

نہ مرا دولتِ دنیا نہ مرا اجرِ جمیل
نہ چو نمرود توانا نہ شکیبا چو خلیلؑ

بارقیباں کفِ ساقی بمئے ناب کریم
باغریباں لبِ جیحوں بدمے آبِ بخیل

اے بہ مسمارِ قضا دوختہ چشمِ ابلیس
بدمِ گرم رواں سوختہ بالِ جبریلؑ

باتوام خرّمئے خاطرِ موسٰیؑ بر طور
باخودم خستگی لشکرِ فرعون بہ نیل

برکمالِ تو در اندازہ کمالِ تو محیط
بر وجودِ تو در اندیشہ وجودِ تو دلیل

نہ کنی چارہ لبِ خشکِ مسلمانے را
اے بتر سابچگاں کردہ مئے ناب سبیل

غالبِ سوختہ جاں راچہ بگفتار آری
بدیارے کہ ندانند نظیریؔ ز قتیلؔ

تشبیب قصیدہ

تو اے ستارہ ندانی کہ رنجم از آزار
تو اے سپہر نہ سنجی کہ ترسم از بیداد

ترا غمیست بسرمایهٔ گرانئ کوه — مرا دبیست به نیروئے تیشهٔ فرهاد
من و بلائے تو نطع ادیم و تابِ سهیل — من و جفائے تو شاگرد و سیلئے اُستاد
من و ستم دلِ رنجور و التفاتِ طبیب — من و خطر رگِ مجنون و نشترِ فصّاد
بگوشِ تابِ طبیعت روم معاذ الله — ندیده ام که خود از کسیت جمله بست و گشاد
ستاره را همه رفتار را قتضائے قضاست — چنانکه جنبش نرد از انامِل نراد
فلک کجائی و طالع چه و ستاره کدام — کنم شکایت دشمن ز دوست شرم باد
غزل سرایم و در مهر بیچم از اندوه — ترانه سنجم و برخیزم از سرِ فریاد
بیا که شوق عنانِ سخن بگرداند — ز سنگلاخِ شکایت به مرغزارِ داد
بیا که نیست ثباتے بدیں نشاط و ملال — بیا که نیست دوامے بدیں بیاض و سواد
بیا که زود سرآید زمانهٔ اندوه — شود روانِ گرامی ز بندِ تن آزاد

بیا که داده نوید نکوئے فرجام
حسینِ ابن علی رضآبروئے دانش و داد

شباب

آں بلبلم که در چمنستان شاخسار — بود آشیانِ من شکنِ طرّهٔ بهار
آں مطربم که سازِ نوائے خیالِ من — غیر از کمندِ جاذبهٔ دل نداشت تار
آں ریشهٔ نگاهِ امیدم که دمبدم — بود از نمِ طراوتِ دل شوقم آبیار
هر غنچه از دمم بفضائے شگفتگی — فیضِ نسیم و جلوهٔ گل داشت پیشکار
هر جلوه راز من بتقاضائی دلبری — از غنچه بود محملِ نازے بر هگزار
هم سینه از بلائے جفا پیشه دلبران — فرهنگِ کاروانی بیدادِ روزگار

هم دیده از ادائے مغاں شیوۂ شاہداں — فہرستِ روزنامۂ اندوہِ انتظار
شوقم جریدۂ رقمِ آرزوئے بوس — زو قمِ قلمروِ ہوسِ مژدۂ کنار
فکرم بجیبِ شاہدِ اندیشہ گلفشاں — کلکم بطرفِ گلشنِ نظارہ لالہ کار
از چشم و دل نہادِ مرا بود تاج و تخت — وز رنگ و بو بساطِ مرا بود پود و تار
بختم بجیبِ عشرتیاں میفشاند گل — سعیم زپائے مغنیاں میکشید خار
وقتِ مرا ز دولتِ کوثر در آستیں — بزمِ مرا طراوتِ فردوس در کنار
ساقی ز بادہ بر اثرِ نغمہ عذر خواہ — مطرب ز نغمہ در ہوسِ بادہ حق گزار
از پردہ ہائے ساز نفسہا اثر فشاں — وز جلوہ ہائے ناز نظرہا کرشمہ بار
ہموارہ ذوقِ مستی و لہو و سرور و سوز — پیوستہ شعر و شاہد و شمع و مے و قمار
باکیسہ در خصومت و با کاسہ در لجاج — رندانِ پاکباز و شگرفانِ شادخوار
بہ مستیٔ شبینہ و خوابِ سحرگہے — رنگینیٔ سفینہ و اشعارِ آبدار
اکنوں منم کہ رنگ بروئم نمی‌رسد — تا رُخ بخونِ دیدہ بشویم ہزار بار

چشمم کشودہ اند بکردارہائے من
زآیندہ ناامیدم و از رفتہ شرمسار

(کلکتہ)

گلِ رعنا

غزلیات

سحر دمیدہ و گُل در دمیدنست مخسپ   جہاں جہاں گُلِ نظارہ چیدنست مخسپ

مشام را بہ شمیمِ گلے نوازش کن   نسیمِ غالیہ سا در وزیدنست مخسپ

زخویش حسنِ طلب بین و در صبوحی کوش   مئے شبانہ ز لب در چکیدنست مخسپ

ستارۂ سحری مژدہ سنجِ دیداریست   ببیں کہ چشمِ فلک در پریدنست مخسپ

تو محوِ خواب و سحر در تاسّف از انجم   بہ پشتِ دست بدنداں گزیدنست مخسپ

نفس ز نالہ بہ سنبل درودنست بخیز   ز خونِ دل مژہ در لالہ چیدنست مخسپ

نشاطِ گوش آوازِ قلقل است بیا   پیالہ چشم براہ کشیدنست مخسپ

نشانِ زندگیٔ دل دویدنست مایست   جلائے آئینۂ چشم دیدنست مخسپ

ز دیدہ سودِ حریفاں کشودنست مبند   ز دل مُرادِ عزیزاں تپیدنست مخسپ

بذکرِ مرگ شبے زندہ داشتن ذوقیست
گرت فسانۂ غالبؔ شنیدنست مخسپ

ظہورِ بخششِ حق را ذریعہ بے سببیست   وگرنہ شرمِ گنہ در شمارِ بے ادبیست

ز گیر و دار چہ غم چوں بعالمیکہ منم
ہنوز قصۂ حلاجِ حرفِ زیر لبیست

رموزِ دیں نشناسم درست و معذورم
نہادِ من عجمی و طریقِ من عربیست

نشاطِ جم طلب از آسماں نہ شوکتِ جم
قدح مباش زیاقوت۔ بادہ گر عنبیست

بالتفات نیرزم در آرزو چہ نزاع
نشاطِ خاطرِ مفلس ز کیمیا طلبیست

نہ ہم پیالگئ زاہداں بلائے بود
خوشست گرمئ بحثش خلافِ شرع نبیست

ہر آنچہ در نگری جز بہ جنس مائل نیست
عیارِ بیکسئ ما شرافتِ نسبیست

کسیکہ از تو فریبِ وفا خورد داند
کہ بے وفائی گل در شمار بوالعجبیست

میانِ غالب و واعظ نزاع شد ساقی
بیا بہ لابہ کہ ہیجانِ قوتِ غضبیست

آہے بعشقِ فاتحِ خیبر کنیم طرح
در گنبدِ سپہر مگر در کنیم طرح

در فصلِ مے کہ گشتہ جہاں ہا پر از دو
بنشیں کہ آب گردشِ ساغر کنیم طرح

تا چند نشنوی تو و ما حسبِ حالِ خویش
افسانہ ہائے غیر مکرر کنیم طرح

مارا زبوں مگیر گر از پا در آمدیم
از ما عجب مدار گر از سر کنیم طرح

خود را بشاہدی بپرستیم زیں سپس
در راہِ عشق جادہ دیگر کنیم طرح

از داغِ شوقِ پردہ نشینے نشاں دہیم
در زخمِ رشکِ روزنۂ در کنیم طرح

از تار و پودِ نالہ نقابے دہیم ساز
وز دودِ سینہ زلفِ معنبر کنیم طرح

برگِ حنا ز شعلہ و آذر بہم نہیم
پیرایہ از شرارہ و اخگر کنیم طرح

از زخم و داغ لالہ و گل در نظر کشیم
از کوہ و دشت جلوۂ منظر کنیم طرح

از سوز و ساز محرم و مطرب کنیم جمع
از خار و خارہ بالش و بستر کنیم طرح

آئینِ برہمن بہ نہایت رساندہ ایم
غالب بیا کہ شیوۂ آذر کنیم طرح

مژدهٔ صبح درین تیره شبانم دادند — شمع کشتند وز خورشید نشانم دادند

رخ گشودند و لب هرزه سرایم بستند — دل ربودند و دو چشم نگرانم دادند

سوخت آتشکده ز آتش نفسم بخشیدند — ریخت بتخانه ز ناقوس فغانم دادند

گهر از رایت شاهان عجم برچیدند — بعوض خامهٔ گنجینه فشانم دادند

افسر از تارک ترکان پشنگی بردند — به سخن ناصیهٔ فرکیانم دادند

گوهر از تاج گسستند و به دانش بستند — هرچه بردند به پیدا به نهانم دادند

هرچه در جزیه ز گبران مئے ناب آوردند — بشب جمعهٔ ماه رمضانم دادند

هرچه از دستگه پارس به یغما بردند — تا بنالم هم ازان جمله زبانم دادند

دل ز غم مرده و من زنده همانا این مرگ — بود ار زنده بمانم که امانم دادند

هم ز آغاز بجوف خط مستم غالب
طالع از قوس و شمار از سرطانم دادند

عاشق چو گفتنش که برو زود میرود — نازم بخواجگی غضب آلوده می رود

از ناله ام مرنج که آخر شدست کار — شمع خموشم و ز سرم دود میرود

شادم به بزم وعظ که رامش اگرچه نیست — بارے حدیث چنگ و نے و عود میرود

فردوس جوئے عمر بوسواس داده ما — سرمایه نیز در هوس سود میرود

ماهم بلاغ دلا به تسلی شویم کاش — نادان ز بزم دوست چه خوشنود میرود

رشک وفا نگر که بدعوی گه رضا — هرکس چگونه در پئے مقصود میرود

فرزند زیر تیغ پدر می نهد گلو — گر خود پدر در آتش نمرود میرود

غالب خوشست فرصت موهوم نگر عیش
تارے که نیست در سر این پود میرود

چه خیزد سخنے کز درون جان نبود — بریده باد زبانے که خونچکان نه بود

حکیم ساقی و مے تند و من ز بدخوئی / ز رطلِ بادہ بخشم آیم ار گراں نہ بود
نگفتہ ام ستم از جانبِ خداست ولے / خدا بہ عہدِ تو بر خلق مہرباں نہ بود
زمامِ ناقہ بدستِ تصرفِ شوقست / بسوئے قیس گرایش ز سارباں نہ بود
مرا کہ لب بطلب آشنا نخواہد شد / روا مدار کہ شاہد ضمیر داں نہ بود
بالتفاتِ نگارم چہ جائے تہنیت ست / دعا کنید کہ نوعے ز امتحاں نہ بود
عجب بود سرِ ہمخوائے کسے غالب
مرا کہ بالش و بستر ز پرنیاں نہ بود

بیا و جوششِ تمنائے دیدنم بنگر / چو اشک از سرِ مژگاں چکیدنم بنگر
ز من بجرمِ تپیدن کنارہ می کردی / بیا بخاکِ من و آرمیدنم بنگر
شنیدہ ام کہ نہ بینی و نا امید نیم / ندیدنِ تو شنیدم شنیدنم بنگر
دمید دانہ و بالید و آشیاں گہ شد / در انتظارِ ہما دام چیدنم بنگر
نیاز مندیٔ حسرت کشاں نمیدانی / نگاہ من شو و دزدیدہ دیدنم بنگر
بداد من نرسیدی ز درد جاں دادم / بدادِ طرزِ تغافل رسیدنم بنگر
تواضعے نہ کنم بے تواضعے غالب
بسایۂ خمِ تیغش خمیدنم بنگر

یارب ز جنوں طرحِ غمے در نظرم ریز / صد بادیہ در قالبِ دیوار و درم ریز
از ہر سرِ جہانتاب اُمیدِ نظرم نیست / ایں طشت پُر از آتشِ سوزاں بسرم ریز
دل را ز غمِ گریۂ بے رنگ بجوش آر / اجزائے جگر حل کن و در چشمِ ترم ریز
ہر برق کہ نظارہ گداز ست نہادش / یکجا بہ پیمانۂ ذوقِ نظرم ریز
سرمستِ مے لذتِ دردم بخرام آر / وین شیشۂ دل بشکن و در رہگذرم ریز
ہر خوں کہ عبث گرم شود در دلم افگن / ہر برق کہ بے صرفہ جہد بر اثرم ریز

ار جانم آبیست بمژگانِ ترم بخش
از قلزم و جیحوں کفِ خاکے بسرم ریز

از شیشہ گر آئین نتواں بست شبم را
یاریِ گلِ پیمانہ بجیبِ سحرم ریز

گرمم کہ بہ افشاندنِ الماس نیرزم
مشتے نمکِ سودہ بزخمِ جگرم ریز

ایں سوزِ طبیعی نگہد از نفسم را
صد شعلہ بیفشار و بہ مغزِ شررم ریز

مسکیں خبر از لذتِ آزار ندارد
خارم کُن و در رہگذرِ چارہ گرم ریز

وجہے کہ بہ پا مزدِ تواں داد ندارم
آہم کُن و اندر قدمِ نامہ برم ریز

دارم سرِ ہمطرحیِ غالب چہ جنونست
یارب ز جنوں طرحِ غمے در نظرم ریز

مرا کہ بادہ ندارم ز روزگار چہ حظ
ترا کہ ہست و نیاشامی از بہار چہ حظ

خوش ست کوثر و پاکست بادہ کہ درو ست
ازاں رحیقِ مقدس دریں خمار چہ حظ

چمن پُر از گل و نسرین و دلربائے نے
بدشتِ فتنہ ازیں گرد بی سوار چہ حظ

چنیں کہ نخل بلندست و سنگ ناپیدا
ز میوہ تا نفتد خود ز شاخسار چہ حظ

نہ ہر کہ خونی و رہزن بپایہ منصورست
بدیں حضیضِ طبیعی ز اوجِ دار چہ حظ

بہ بندِ زحمتِ فرزند و زن چہ می کشیم
ازیں نخواستہ غمہائے ناگوار چہ حظ

بعرضِ غصّہ نظیری وکیلِ غالب بس!
اگر تو نشنوی از نالہ ہائے زار چہ حظ

رفتم کہ کہنگی ز تماشا بر افگنم
در بزمِ رنگ و بو نمطے دیگر افگنم

در وجدِ اہلِ صومعہ ذوقِ نظارہ نیست
ناہید را بزمزمہ از منظر افگنم

معشوقہ را ز نالہ بدانساں کنم حزیں
کز لاغری ز ساعدِ او زیور افگنم

ہنگامہ را بجیبِ جنوں بر جگر زنم
اندیشہ را ہوائے فسوں در سر افگنم

نخلم کہ ہم بجائے رطب طوطی آورم
ابرم کہ ہم بروئے زمیں گوہر افگنم

با غازیان ز شرحِ غمِ کارزارِ نفس
شمشیر را بر عشر ز تن جوهر افگنیم

با دیریان ز شکوهٔ بیدادِ اهلِ دین
مُهرے ز خویشتن بدل کافر افگنیم

ضعفم بکعبه مرتبهٔ قربِ خاص داد
سجاده گستری تو و من بستر افگنیم

تا باده تلخ تر شود و سینه ریش تر
بگدازم آبگینه و در ساغر افگنیم

راهے ز کنجِ دیر به مینو کشوده ام
از خم کشم پیاله و در کوثر افگنیم

منصور فرقهٔ علی اللهیان منم
آوازهٔ انا اسد الله در افگنیم

ارزنده گوهرے چو من اندر زمانه نیست
خود را بخاکِ رهگذرِ حیدر افگنیم

غالب بطرحِ منقبتِ عاشقانه
رفتیم که کهنگی ز تماشا بر افگنیم

بیا که قاعدهٔ آسمان بگردانیم
قضا بگردشِ رطلِ گران بگردانیم

ز چشم و دل بتماشا تمتع اندوزیم
ز جان و تن بمدارا زیان بگردانیم

بگوشه بنشینیم و در فراز کنیم
بکوچه بر سرِ ره پاسبان بگردانیم

اگر ز شحنه بود گیر و دار نیندیشیم
وگر ز شاه رسد ارمغان بگردانیم

اگر کلیم شود همزبان سخن نه کنیم
وگر خلیل شود میهمان بگردانیم

گل افگنیم و گلابے برهگذر پاشیم
مے آوریم و قدح درمیان بگردانیم

ندیم و مطرب و ساقی ز انجمن رانیم
بکار و بار زنے کاروان بگردانیم

گہے بہ لابہ سخن با ادا بیامیزیم
گہے ببوسه زبان در دهان بگردانیم

نهیم شرم بیک سو و باهم آویزیم
بشوخیے که رخِ اختران بگردانیم

ز جوشِ سینه سحر را نفس فرو بندیم
بلائے گرمی روز از جهان بگردانیم

بوهم شب همه را در غلط بیندازیم
ز نیمه ره رمه را با شبان بگردانیم

بجنگ باج ستانانِ شاخساری را
تهی سبد ز درِ گلستان بگردانیم

به صلح بال فشانانِ صبحگاهی را
ز شاخسار سوی آشیان بگردانیم

ز حیدریم من و تو ز ما عجب نبود
گر آفتاب سوی خاوران بگردانیم

بمن وصالِ تو باور نمی کند غالب
بیا که قاعدهٔ آسمان بگردانیم

تا ز دیوانم که سرمستِ سخن خواهد شدن
این مے از قحطِ خریداری کہن خواهد شدن

کوکبم را در عدم اوجِ قبولی بوده است
شهرتِ شعرم به گیتی بعدِ من خواهد شدن

حرف حرفم در مذاقِ فتنه جا خواهد گرفت
دستگاهِ نازِ شیخ و برهمن خواهد شدن

شاد باش ای دل درین محفل که هر جا نغمه ایست
شیونِ ریخ فراقِ جان و تن خواهد شدن

هم فروغِ شمعِ هستی تیرگی خواهد گزید
هم بساطِ بزمِ مستی پرشکن خواهد شدن

از تب و تابِ فنا یکپاره چوں مشتے سپند
هر یکے گرمِ وداعِ خویشتن خواهد شدن

حسن را از جلوهٔ نازش نفس خواهد گداخت
نغمه را از پردهٔ سازش کفن خواهد شدن

شهرِ بے پروا عیارِ شیوه ها خواهد گرفت
داوری خوں در نهادِ ما و من خواهد شدن

پرده ها از روی کارِ همه گر خواهد فتاد
خلوتِ گبر و مسلماں انجمن خواهد شدن

گردِ پندارِ وجود از رهگذر خواهد نشست
بحرِ توحیدِ عیانی موجزن خواهد شدن

در ته هر حرف غالب چیده ام میخانه
تا ز دیوانم که سرمستِ سخن خواهد شدن

حق که حقیقت سمیعست فلانی بشنو
بشنو گر تو خداوند جهانی بشنو

لن ترانی بجوابِ ارنی چند و چرا
من نه آنیم که شناسم تو نه آنی بشنو

سوی خود خوان و بخلوتگهِ خاصم جا ده
آنچه دانی به شمار آنچه ندانی بشنو

پردهٔ چند به آهنگِ نکیسا بسرای
غزلے چند به هنجارِ فغانی بشنو

نیمے آئینه برابر نه و صورت بنگر
پارهٔ گوش به من دار و معانی بشنو

ہرچہ سنجم بتو ز اندیشۂ پیری بپذیر　　ہرچہ گویم بتو از عیشِ جوانی بشنو
داستانِ من و بیداریِ شب ہائے فراق　　تا نہ خسپی و بپایم نشانی بشنو
چارۂ جو نیستم و نیز فضولی نہ کنم　　من و اندوہ تو چند آنکہ توانی بشنو
زینکہ دیدی بہ حجیبیم طلبِ رحم خطاست　　سخنے چند ز غمہائے نہانی بشنو
نامہ در نیمہ رہ بود کہ غالب جاں داد
ورق از ہم ورد ایں مژدہ زبانی بشنو

دولت بہ غلط نبود۔ از سعی پشیماں شو　　کافر نتوانی شد۔ ناچار مسلماں شو
از ہرزہ رواں گشتن۔ قلزم نتواں گشتن　　جوئی بخیاباں رو۔ سیلی بہ بیاباں شو
ہم خانہ بساماں بہ۔ ہم جلوہ فراواں بہ　　در کعبہ اقامت کن۔ در بتکدہ مہماں شو
آوازۂ معنی را بر ساز دبستاں زن　　ہنگامۂ صورت را بازیچۂ طفلاں شو
گر چرخ فلک گردی سر بر خط فرماں نہ　　ور گوئی زمیں باشی وقفِ خمِ چوگاں شو
آوردہ غمِ عشقم در بندگیٔ ایزد　　اے داغ بدل در رو وز جبہہ نمایاں شو
سرمایہ کرامت کن۔ وانگاہ بتجارت بر　　برخرمنِ ما برقے بر مزرعہ باراں شو
جاں دادیم غالب خوشنودیٔ روحش را
در بزمِ عزا مے کش در نوحہ غزلخواں شو

گستاخ گشتہ ایم بہ غرورِ جمال کو　　پیچیدہ ایم سر ز وفا گوشمالِ کو
تا کے فریبِ حلم خدا را۔ خدا نہ　　آں خوئے خشمگیں و ادائے ملال کو
برگشتہ ایم ز مہر و نمی گیریم بہ قہر　　دارم صد جواب ولے یک سوال کو
یا می گسست صحبت و یا میفزود ربط　　لیکن مرا ملال و ترا انفعال کو
خواہی کہ بر فروزی و سوزی و رنگ چیست　　خواہم کہ تیز سوئے تو بینم مجال کو
گر گفتہ ایم گفتن و بستن بما مخند　　مارا تذکار کے بسر اور خیالِ کو

دلِ فتنہ جو و فرصتِ تکمیلِ عشق نیست — ہنگامہ سازیٔ ہوسِ زود بال کو
در بادہ ظہورِ غمِ محتسب کجا — در عیشِ خلد لذّتِ بیمِ زوال کو
غالب بشعر کم ز ظہوری نیم ولے
عادل شہِ سخن رسِ دریا نوال کو

دارم دلے ز غصہ گرانبار بودہ — بر خویشتن ز آبلہ چیزے فزودہ
دل آہن بلاکز و نفسے برقِ خرمنے — بخت آنچناں کز و اثرے مرگِ دودہ
از بہرِ خویش ننگم و دارم ز بخت چشم — خود را در آب و آئینہ رُخ نانمودہ
گمنام و نُہ بر کنشم و خواہم بمن رسد — در رغبتِ خواب شاہ بہ مستی غنودہ
خواہم ز خواب بر رُخِ لیلے کشائش — چشمے نگہ بپردۂ محمل نسودہ
خواہم شود بہ شکوہ و بیچارہ رام من — در گوشہ گوں ادا بز باہا ستودہ
بازیں دو دانشے چو منے تا چہا کند — سجادہ و عمامہ ز صنعاں ربودہ
با دوستاں مباحثہ دارم ز سادگی — در بابِ آشنائی نا آزمودہ
خجلت نگر کہ در حسناتم نیافتند — جز روزۂ درست بصہبا کشودہ
در بزمِ غالب آ و بشعر و سخن گرائے
خواہی گر بشنوی سخنِ ناشنودہ

بدل ز عہد بدہ جائے کہ داشتی داری — شمارِ عہد و وفائے کہ داشتی داری
ز ترکے ز جورِ پشیماں شدی چہ میگوئی — دروغِ راست نمائے کہ داشتی داری
بسینہ چوں دل و در دل چو جاں خزیدی باز — نگاہِ مہر فزائے کہ داشتی داری
عتاب و مہرِ تو از شناختن نتواں — خرد فریب ادائے کہ داشتی داری
خراب بادۂ دوشینہ سرت گردم — ادائے لغزشِ پائے کہ داشتی داری
بہ کردگار نگہ دہی ۔ وہماں بفسوس — حدیثِ روزِ جزائے کہ داشتی داری

کرشمہ بادہائے کہ بودۂ ہستی — بسر ز فتنہ ہوائے کہ داشتی داری

جہانیاں ز تو برگشتہ اند گر غالب
ترا چہ باک خدائے کہ داشتی داری

دیدہ ور آنکہ تا نہد دل بشمارِ دلبری — در دلِ سنگ بنگرد رقصِ بتانِ آزری
اے تو کہ ہیچ ذرہ را جز بہ رہ تو روئے نیست — در طلبت تواں گرفت بادیہ را بہ رہبری
ہر کہ دلست در برش داغِ تو رویدش ز دل — تا چو بہ دیگرے دہد باز بری بداوری
رشکِ ملک چہ و چرا چوں نبودہ نمی بود — ہمہ دہ تا در ہوائے تو می پرد از سبکسری
حیف کہ من بجوں نیم۔ ور ز تو سخن رود کہ تو — اشک بدیدہ بشکری۔ نالہ بہ سینہ بنگری
کوثر اگر بمن رسد خاک خورم ز بے نمی — طوبے اگر ز من شود ہیمہ کشم ز بے بری

بینم اگر گداز دل در جگر آتشے چو سیل
غالب اگر دمِ سخن رہ بہ ضمیرِ من بری

ترانۂ شوق

ز من گرت نہ بود باور انتظار بیا — بہانہ جوئے مباش و ستیزہ کار بیا
بیک دو شیوہ ستم دل نمیشود خورسند — بمرگِ من کہ بسامانِ روزگار بیا
بہانہ جو است در الزامِ مدعی شوقت — یکے بر غمِ دلِ نا امید وار بیا
ہلاکِ شیوۂ تمکیں مخواہ مستاں را — عناں گسستہ تر از بادِ نوبہار بیا
ز ما گسستی و با دیگراں گرو بستی — بیا کہ عہدِ وفا نیست استوار بیا
وداع و وصل جداگانہ لذتے دارد — ہزار بار برو صد ہزار بار بیا
تو طفلِ سادہ دل و ہمنشیں بد آموز است — جنازہ گر نہ تواں دید بر مزار بیا

فریب خوردۂ نازم چہا نمی خواہم / یکے بہ پرسشِ جانِ اُمیدوار بیا
زخوئے تست نہادِ شکیب نازک تر / بیا کہ دست و دلم میرود زکار بیا
رواجِ صومعہ ہستیست زینہار مرو / متاعِ میکدہ مستیست ہوشیار بیا
حصارِ عافیتے گر ہوس کنی غالب
چو ما بہ حلقۂ رندانِ خاکسار بیا

واسوخت

رفت آنکہ کسبِ بوئے تو از باد کردمے / گل دیدمے و روئے ترا یاد کردمے
رفت آنکہ گر براہِ تو جاں دادمے ز ذوق / از موجِ گردِ رہ نفس ایجاد کردمے
رفت آنکہ گر بتا نہ بہ نفریں نواختی / رنجیدمے و عربدہ بنیاد کردمے
رفت آنکہ قیس را بسترگی ستودمے / در چابکی ستائشِ فرہاد کردمے
رفت آنکہ جانبِ رُخ و قدت گرفتمے / در جلوہ بحث با گل و شمشاد کردمے
رفت آنکہ در ادائے سپاسِ پیامِ تو / ہر گونہ مُرغِ صد قفس آزاد کردمے
اکنوں خود از وفائے تو آزارمے کشم / رفت آنکہ از جفائے تو فریاد کردمے
ہمدم منہ ز طُرّہ کہ تابم نماندہ است / رفت آنکہ خویش را بہ بلا شاد کردمے
آخر بداد گاہِ دگر او فتاد کار / رفت آنکہ از تو شکوۂ بیداد کردمے
غالب ہوائے کعبہ بسر جا گرفتہ است
رفت آنکہ عزمِ خلخ و نوشاد کردمے

صبحِ میکدہ

صبحے کہ در ہوائے پرستاریٔ وثن — جنبد کلیدِ بتکدہ در دستِ برہمن
در رفت و روبِ دیر دمِ گرمِ راہباں — آرد بروں گداختہ شمع از لگن
خیزند دستہ دستہ مغانِ نشستہ روی — در اہتمامِ چیدنِ رسمِ زنار دن
از شورِ دیریاں بگمانِ خروشِ صور — اموات راز رقص بتن بردرد کفن
رخشد ستارہ از رخِ ناشستۂ صنم — بالد بنفشہ از قدِ خم گشتۂ شمن
بر روئے خاک جلوہ کند سایہ در نظر — بر بوئے دوست حلقہ زند مرغ در چمن
خواہد چراغِ کشتہ چو شخصِ برہنہ سر — خیزد گل شگفتہ چو رنجورِ خستہ تن
غوغائے روز پردہ کشاید ز خوب و زشت — آوائے کوس خواب رباید ز مرد و زن

داری سرِ غریب نوازی نہ بے نشاط
غالب ندیدہ کہ غریبست در وطن

گریۂ غالب

دارم بجہاں گربۂ پاکیزہ نہادے — کز بالِ پریزاد بود موجِ رمِ او
سرمست ادا چوں بزمیں باز خرامد — از خاک دمد غنچہ ز نقشِ قدمِ او
چوں صورتِ آئینہ ز افراطِ لطافت — آید بنظر بچۂ او از شکمِ او
ہر شیرِ ژیانے کہ بہ بینی بہ نیستاں — دارد سرِ دریوزۂ عشقش ز دمِ او

گر جانورے مردہ بہ بیند سرِ راہے
از پاکیِ طینت نخورد غیرِ غمِ او

ہر بچہ کہ کنجشک بوے باز سپارد
در پرورشِ او نخورد جز قسمِ او

آرے بود از غیرتِ اندازِ خرامش
بر کبک و تذروست اگر خود ستمِ او

رخشندہ ادیمِ تنش از لطفِ زبانش
گوئی بہ اثر تابِ سہیل ست نمِ او

جوشِ گل و بالیدگیِ موجۂ رنگست
دم لا بہ کناں آمدنِ دمبدمِ او

در عربدہ چوں بند زدم باز کشاید
لرزد شکنِ طرۂ خوباں زخمِ او

تا مہرہ کشِ صفحۂ افلاک بود مہر
با داکفِ دستِ من و پشت و شکمِ او

قطعہ

چوں مرا نیست دستگاہِ ستیز
چوں مرا نیست رسم و راہِ مصاف

میکشائم لبے بہا یا ہائے
میکشم خنجرِ زباں زغلاف

لیک در ہجو بایدم امساک
در شکایت نشایدم اسراف

بندہ را بودہ است از سرکار
وست مزدِ مشقتِ اسلاف

زرِ سالانۂ برائے دوام
وجہِ شائستۂ لقدرِ کفاف

ملزمم کردہ اند ہاں بدروغ
حق من خوردہ اند ہیں بگزاف

آہ از اقربائے بے آزرم
داد از حاکمانِ ناانصاف

قطعۂ ہجویہ

ایا بے ہنر دشمنِ دیوسار — چہ نازی بہنگامۂ زور و زر
زما باش فارغ کہ ما فارغیم — نداریم پروائے ایں شور و شر
ترا شیوہ دزدی و ما بینوا
تو بدرو و بدگو و ما کور و کر

نوائے سروش

غالبِ افسردہ دل و جاں بیا — بے سر و پا در صفِ رنداں بیا
بے خبراں را خبرے باز دہ — زاں مئے دیریں قدرے باز دہ
آں اثرِ پردۂ سازت چہ شد؟ — زمزمۂ خارا گدازت چہ شد؟
آں نفسِ نالہ کمندت کجاست؟ — واں نگہِ جلوہ پسندت کجاست؟
در ہوسِ جاہ فرو رفتۂ — حیف کہ در چاہ فرو رفتۂ
راہ غلط کردہ با فسونِ دیو — می سپری مرحلۂ رنگ و ریو
بندۂ زر بودن از اہرمنیست — مردِ خدا ایں چہ خدا دشمنیست
آہ از دنیا طلبیہائے تو — دیں ہمہ ابرام و تقاضائے تو
گر مئے خونت کہ ازیں بیش بود — صرف بر انداختنِ خویش بود
آتشِ ہنگامہ بجاں داشتی — داغِ مغاں شیوۂ بتاں داشتی

آں ہمہ دیوانگی و جاہلی — ویں ہمہ ناکامی و بے حاصلی
آں ہمہ بے راہ روی ہائے تو — ویں ہمہ بیصرفہ دویہائے تو
آں ز جنوں برق بخرمن زدن — ویں بہ خمِ دامِ ہوس تن زدن
نیمہ شب از عمرِ تو در خواب رفت — نیمہ بہ پیمودنِ مہتاب رفت
بیں کہ دریں کارگہِ پیچ پیچ — ما حصلِ سعیِ تو ہیچ است ہیچ
اے ہمہ تن وسوسہ سودِ تو کو ؟ — دہر سراب است وجودِ تو کو ؟
خلق کہ از وہم نمودیش ہست — وہم تو دانست کہ بودیش ہست
پیرویِ وہم مکن زینہار — سر ز گریبانِ حقیقت برآر
خیز و چو منصور نوائے بزن — ہستیِ خود را سرِ پائے بزن
ساقیِ ہمت کہ صلائے دہد — بادہ ز خمخانۂ لا میدہد
ہمّت اگر بال کشائی کند — صعوہ تواند کہ ہمائی کند
نیّرِ توفیق اگر بر دمد — لالہ عجب نیست کز اخگر دمد
ہمّتِ ما نیز شہودِ حق است — ہرچہ بسنجیم وجودِ حق است
ہمّتِ ما غیرتِ حق است و بس — کثرتِ ما وحدتِ حق است و بس

از اثرِ سطوتِ حق در کلام
حرف ز لب میرمدم والسلام

زندگی

تو نالی از خلۂ خار و نگری کہ سپہر
سرِ حسینؑ علیؑ بر سناں بگرداند
برو بشادی و اندوہ دل منہ کہ قضا
چو قرعہ بر نمطِ امتحاں بگرداند
یزید را بہ بساطِ خلیفہ بنشاند
کلیم را بہ لباسِ شباں بگرداند

جواہراتِ پریشاں

بپایانِ محبت یاد می آرم زمانے را
کہ دل عہدِ وفا نابستہ دادم دلستانے را
ندارم تابِ ضبطِ راز و می ترسم ز رسوائی
مگر جوئم ز بہرِ ہمزبانی بے زبانے را

عمرے بسپری گشت و ہماں بر سرِ جور است
گویند بتاں را کہ وفا نیست چرا نیست
جنت نکند چارۂ افسردگیٔ دل
تعمیر باندازۂ ویرانیٔ ما نیست

انتظارِ جلوۂ ساقی کباب میکند
مے بساغر آبِ حیوان و بہ مینا آتش است
بے تکلف در بلا بودن بہ از بیمِ بلا
قعرِ دریا سلسبیل و روئے دریا آتش است

ناچار با تغافلِ صیاد ساختیم
پنداشتیم کہ حلقۂ دام آشیانہ ایست
پابستۂ نوردِ خیالی چو وارسی
ہر عالمے ز عالمِ دیگر فسانہ ایست
غالب دگر ز منشاء آوارگی مپرس
گفتیم کہ جبہہ را ہوسِ آستانہ ایست

امشب آتشیں رُوئے گرمِ تندخوانیہاست
کز تبش نوا ہر دم در شرر فشانیہاست
کُشتۂ دلِ خویشم کز ستمگراں یکسر
دید دلفریبیہا گفت مہربانیہاست

بے خود بزیرِ سایۂ طوبے غنودہ اند
شبگیرِ رہروانِ تمنا بلند نیست

ہم وعدہ و ہم منع ز بخشش چہ حجاب ست
جاں نیست مگر نتواں داد شراب ست
در مژدہ ز جوئے عسل و کاخِ زمرّد
چیزے کہ بدلبستگی ارزد مئے ناب است
از جلوہ بہنگامہ شکیبا نتواں شد
لب تشنۂ دیدارِ ترا خلد سراب است

شادی و غم ہمہ سرگشتہ تر از یک دگراند
روزِ روشن بوداعِ شبِ تار آمد و رفت

اختر سے خوشتر از نیم بجہاں میبائست
خسرو پیر مرا بختِ جواں میبائست
بزمینے کہ بہ آہنگِ غزل بہ نشینیم
خاک گلبوئے و ہوا مشک فشاں میبائست
بر نتابم بسبو بادہ نہ دُور آوردن
خانۂ من لبسرِ کوئے مغاں میبائست
یا تمنّائے من از خلدِ بریں نگزشتے
یا خود امید گہے در خورِ آں میبائست

گل فراواں بوُد و مے پُر زور دوشم بر بساط
خود بخود پیمانہ می گردید گردیدن نداشت
گر منافق وصل ناخوش ور موافق ہجر تلخ
دیدہ وا غنم کر و روئے دوستاں دیدن نداشت
بر سو آدم از امانت ہر چہ گردوں بر نتاخت
ریخت مے برخاک چوں در جام گنجیدن نداشت

منت از دل نمیتواں برداشت
شکرِ ایزد کہ نالہ بے اثر است

قفس و دام را گناہے نیست
ریختن در نہادِ بال و پر است
ریزد آں برگ و ایں گل افشاند
ہم خزاں ہم بہار در گذر است

از یک سبو ست بادہ و قسمت جدا جدا ست
جمشید جام بُرد و قلندر کدو گرفت
رضواں چو شہد و شیر بہ غالب حوالہ کرد
بیچارہ باز داد و مئے مشکبو گرفت

دریں روش بچہ امید دل تواں بستن
میانۂ من و اُو شوق حائل افتاد است

در پردۂ رسوائیے منصور نوائیست
رازت نکشودیم ازیں خلوتیاں ہیچ

بمن گرائے و وفا جو کہ سادہ برہمنم
بسنگ ہر کہ دہد دل بغمزہ چوں ندہد

خون ہزار سادہ بگردن گرفتہ اند
ہم ما گفتہ اند نکویاں نکو کنند

لب تشنہ جوئے آب شمار و سراب را
می زیبد ار بہستیٔ اشیا غلو کنند

پیداست بے نیازیٔ عشق از فنائے ما
گر زورقے شکست ز دریا چہ می رود
با ما کہ محوِ لذّتِ بیداد گشتہ ایم
دیگر سخن ز مہر و مدارا چہ می رود
ہفت آسماں بگردش و ما در میانہ ایم
غالب دگر مپرس کہ بر ما چہ می رود

دوست دارم گرہے را کہ بکارم زدہ اند
کایں ہماں است کہ پیوستہ در ابروئے تو بود

اگر بدل نہ خلد ہرچہ از نظر گزرد
زہے روانیٔ عمرے کہ در سفر گزرد
بوصل لطف باندازۂ تحمل کن
کہ مرگِ تشنہ بود آب چوں ز سر گزرد

تمکینِ برہمن دلم از کفر بگرداند
بت خانہ بُتے خانہ برانداز ندارد

گر رفتہ ام زکوئے تو آساں نرفتہ ام
ایں قصہ از زبانِ عزیزاں شنیدہ ام

ذوقیست ہمدمی بفغاں بگذرم ز رشک
خارِ رہت بہ پائے عزیزاں خلیدہ باد

بعرضِ شہرتِ خویش احتیاجِ ما دارد
چو شعلۂ کہ نیاز اوفتد بخار و خسش
زیاس گشتہ سگِ نفس در تلاش دلیر
مگر ز رشتۂ طولِ امل کنم مرسش
مرا بہ غیر زیک جنس در شمار آورد
فغاں کہ نیست ز پروانہ فرق تا مگسش
خوشم کہ دوست خود آنمایہ بیوفا باشد
کہ در گماں نگالم امیدگاہِ کسش

بہ خلد از سردیٔ ہنگامہ خواہم
برافروزم بجوئے کوثرِ آتش
خنک شوقیکہ در دوزخ بغلطد
مے آتش، شیشہ آتش، ساغر آتش
دلے دارم کہ در ہنگامۂ شوق
بہشتش دوزخ است و گوہر آتش

بلسانِ موج می بالم بہ طوفاں
برنگِ شعلہ می رقصم در آتش

در سلوک از ہر چہ پیش آمد گذشتن داشتم
کعبہ دیدم نقشِ پائے رہرواں نامیدمش
بر امیدِ شیوۂ صبر آزمائے زیستم
تو بریدی از من و من امتحاں نامیدمش

فرسودہ رسمہائے عزیزاں فروگذار
در سورِ نوحہ خوان و بہ بزمِ عزا برقص

تکیہ بر عہدِ زبانِ تو غلط بود غلط
کایں خود از طرزِ بیانِ تو غلط بود غلط
غنچہ رانیک نظر کردم ادائے دارد
دیں کہ مانند بدہانِ تو غلط بود غلط
ایں مسلّم کہ لب ہیچ گوئے داری
خاطرِ ہیچدانِ تو غلط بود غلط

رنگ و بُو بود ترا برگ و نوا بُود مرا
رنگ و بو گشت کہن برگ و نوا گشت تلف
گیرم امروز دہی کامِ دل آں حسن کجا

اجرِ ناکامیٔ سعیٔ سالہا گشت تلف
کاش پائے فلک از سیر بماندے غالب
روزگارے کہ تلف گشت چرا گشت تلف

از عشقِ تو حسنِ ما و تو با ہمدگر در گفتگو
خسرو و مجنوں یکطرف شیریں بہ لیلیٰ یکطرف

در ہیچ نسخہ معنیٔ لفظِ اُمید نیست
فرہنگنامہ ہائے تمنا نوشتہ ایم

میسر بایم بوسہ و عرضِ ندامت میکنم
اختراعے چند در آدابِ صحبت میکنم
سنگ و خشت از مسجدِ ویرانہ می آرم بہ شہر
خانۂ در کوئے ترسایاں عمارت میکنم
کردہ ام ایمانِ خود را دستمزدِ خویشتن
می تراشم پیکر از سنگ و عبادت میکنم

حسرتِ روئے ترا حور تلافی نکند
از تو آخر بچہ امید شکیبا باشم

سر از حجاب تعیّن اگر بروں آید
چہ جلوہ ہا کہ بہر کیش میتواں کردن

مائیم و ذوقِ سجدہ چہ مسجد چہ بتکدہ
در عشق نیست کفر ز ایماں شناختن

رُباعیات

کشتی از موج سوئے ساحل برود
رہرو از جادہ تا بمنزل برود
خود شکوہ دلیلِ رفعِ آزار بست
آید بزباں ہر آنچہ از دل برود

اے آنکہ دہی مایہ کم و خواہش بیش
آنروز کہ وقتِ باز پرس آمد پیش
بگذار مرا کہ من خیالے دارم
با حسرتِ عیش ہائے ناکردۂ خویش

گر دیدنِ زاہداں بجنّت گستاخ
وین دست درازی بہ ثمر شاخ بہ شاخ
چوں نیک نظر کنی ز روئے تشبیہ
ماند بہ بہائم و علف زارِ فراخ

بادۂ شیراز

غزلیات

چوں بہ قاصد بسپرم پیغام را
رشک نگذارد کہ گویم نام را

آں مئے ام باید کہ چوں ریزم بجام
زودیِ مے در گردش آرد جام را

بے گنا ہم پیرِ دیر از من مرنج
من بمستی بستہ ام احرام را

از دلِ تست آنچہ بر من میرود
می شناسم سختئے ایام را

تا نیفتد ہر کہ تن پرور بود
خوشش بود گر دانہ نبود دام را

ما کجا او کوچہ سودا در سرست
ذرّہ ہائے آفتاپ آشام را

دلستاں در خشم و غالب بوسہ جو
شوق نشناسد ہمی ہنگام را

بود ائیے کہ در آں خضر را عصا خفتست
بسینہ می سپرم راہ گرچہ پا خفتست

گدا بسایۂ دیوارِ پادشا خفتست

بدیں نیاز کہ با تست ناز میرسدم

بہ صبحِ حشر چنیں خستہ رُو سیہ خیزد — کہ در شکایتِ دردِ و غمِ دوا خفتست
خروشِ حلقۂ رِندانِ ز نازنیں پسرے است — کہ سر بزانوئے زاہدِ بوریا خفتست
ہوا مخالف و شب تار و بحر طوفاں خیز — گسستہ لنگرِ کشتی و ناخدا خفتست
غمت بشہر شبیخوں زناں بہ بُنگۂ خلق — عسس بخانہ و شہ در حرم سرا خفتست
دلم بہ سبحہ و سجادہ و ردا لرزد — کہ دُزدِ مرحلہ بیدار و پارسا خفتست
درازیٔ شب و بیداریٔ من ایں ہمہ نیست — ز بختِ من خبر آرید تا کجا خفتست
ببیں ز دُور و مجو قربِ شہ کہ منظر را — در یچہ باز و بدروازہ اژدہا خفتست
براہِ خفتنِ من ہر کہ بنگرد داند — کہ میرِ قافلہ در کارواں سرا خفتست
دگر ز ایمنیٔ راہ و قربِ کعبہ چہ حظ؟ — مرا کہ ناقہ ز رفتار ماند و پا خفتست

بخواب چوں خودم آسودہ دل مداں غالبؔ
کہ خستہ غرقہ بخوں خفتہ است تا خفتست

بمرگِ من کہ پس از من بمرگ من یاد آر — بکوئے خویشتن آں نعشِ بے کفن یاد آر
من آں نیم کہ ز مرگم جہاں بہم نخورد — فغانِ زاہد و فریادِ برہمن یاد آر
بہ بام و در ز ہجومِ جوان و پیر بگو — بکوئے و برزن از اندوہِ مرد و زن یاد آر
بسازِ نالہ گروہے ز اہلِ دل دریاب — بہ بندِ مرثیہ جمعے ز اہلِ فن یاد آر
بجز و شمار وفاہائے من ز مردم پُرس — بمن حسابِ جفاہائے خویشتن یاد آر
چہ دید جانِ من از چشمِ پُرخمار بگو — چہ رفت بر سرِ دم از زلفِ پُرشکن یاد آر
بسنج تا ز تو بر من براں محل چہ گذشت — نخواندہ آمدنِ من در انجمن یاد آر

ہزار خستہ و رنجور در جہاں داری
یکے ز غالبِؔ رنجورِ خستہ تن یاد آر

دیدم آں ہنگامہ بے جا خوفِ محشر داشتم — خود ہماں شورست کاندر زیست در سر داشتم

طولِ روزِ حشر و تابِ مہر و ذوقے بودہ بس
جلوۂ برقے در ابر و دامنِ تر داشتم

تا چہ سنجم دوزخ و کوثر کہ من نیز اینچنیں
آتشے در سینہ و آبے بساغر داشتم

دوش بر من عرض کردند آنچہ در کونین بود
زاں ہمہ کالائے رنگا رنگ دل بر داشتم

از خرابی شد فنا حاصل خوشم زیں اتفاق
بود مقصودم محیط و سیل رہبر داشتم

کور بودم کز حرم راندند۔ رفتم سوئے دیر
از جمالِ بُت سخن میرفت باور داشتم

سوزم از حرمانِ مے با آنکہ آبم در سبوست
تا چہ می کردم اگر بختِ سکندر داشتم

ہیچ می دانی کہ غالب چوں بسر بُردم بدہر
من کہ طبعِ بلبل و شغلِ سمندر داشتم

شاہا بہ بزمِ جشن چو شاہاں شراب خواہ
زر بے حساب بخش و قدح بے حساب خواہ

بزمت بہشت و بادہ حلالست در بہشت
گر باز پرس رُو دہد از من جواب خواہ

تو پادشاہِ عہدی و بختِ تو نوجواں
برخور ز عمر و باج نشاط از شباب خواہ

در روزہائے فرخ و شبہائے دلفروز
صہبا بروزِ ابر و بشب ماہتاب خواہ

گل بوئے و شعر گو و گہر پاش و شاد باش
مستی ز بانگِ بربط و چنگ و رباب خواہ

خونِ سیاہِ نافۂ آہو چہ بو دہد
از حلقہ ہائے زلفِ بتاں مشکِ ناب خواہ

خواہش ازیں گروہِ پری چہرہ ننگ نیست
از چشم غمزہ و ز شکنِ طرہ تاب خواہ

از راز ہا حکایتِ ذوقِ نگاہ گوئے
از کار ہا کششِ بندِ نقاب خواہ

ہرچند خواستن نہ سزاوارِ شانِ تست
قوت ز طالع و نظر از آفتاب خواہ

در برگ و ساز گوئے نشاط از بہار بر
در بذل و جود بیعتِ خویش از سحاب خواہ

از شمعِ طور خلوتِ خود را چراغ نہ
از زلفِ حور خیمۂ خود را طناب خواہ

از آسماں نشیمنِ خود را بساط ساز
از ماہِ نو جنیبتِ خود را رکاب خواہ

غالب قصیدہ را بشمارِ غزل در آر
و ز شہ بریں غزل رقمِ انتخاب خواہ

حُسنِ تغزّل

دل بُرد و حق آنست کہ دلبر نتواں گفت
بے داد تواں دید و ستمگر نتواں گفت

در رزم گہش ناچخ و خنجر نتواں بُرد
در بزم گہش بادہ و ساغر نتواں گفت

رخشندگیٔ ساعد و گردن نتواں جُست
زیبندگیٔ یارہ و پرگر نتواں گفت

پیوستہ دہد بادہ و ساقی نتواں خواند
ہموارہ تراشد بت و آذر نتواں گفت

از حوصلہ یاریٔ مطلب صاعقہ تیز است
پروانہ شو اینجا ز سمندر نتواں گفت

ہنگامہ سر آمد چہ زنی دم ز تظلّم
گر خود ستمے رفت بمحشر نتواں گفت

در گرم روی سایہ و سرچشمہ نجوئیم
با ما سخن از طوبےٰ و کوثر نتواں گفت

آں راز کہ در سینہ نہانست نہ وعظ است
بر دار تواں گفت بمنبر نتواں گفت

کارے عجب افتاد بدیں شیفتہ مارا   مومن نہ بود غالب و کافر نتواں گفت

قصیدہ

ای ز وہمِ غیر غوغا در جہاں انداختہ
گفتہ خود حرفے و خود را در گماں انداختہ

دیدہ بیرون و درون از خویشتن پرداختہ
پردۂ رسمِ پرستش در میاں انداختہ

نقش بر خاتم ز حرفِ بے صدا انگیختہ
شور در عالم ز حسنِ بے نشاں انداختہ

چرخ را در قالبِ ابداع در وا ریختہ
خاک را بر نطعِ پیدائی ستاں انداختہ

عاشقاں در موقفِ دار و رسن وا داشتہ
غازیاں در معرضِ تیغ و سناں انداختہ

غم چو گیرد سخت نتواں شکوہ از دلدار کرد
بہرِ آسانی اساسِ آسماں انداختہ

گل چو ماند دیر گردد بر دلش بار از سرد
بہرِ تجدیدِ طرب طرحِ خزاں انداختہ

آتشے از روئے گلہائے بہار افروختہ
شعلہ در جانِ مرغِ صبح خواں انداختہ

جز بدیں آب آتشِ زردشت نتواں سرد کرد
کعبہ را جوئے بہشت از ناوداں انداختہ

جز بدیں الماس نتواں اینچنیں در دانہ سفت
رخنہ از اسلام در کیشِ مغاں انداختہ

تا دریں صورت ز چشمِ دشمناں پنہاں بود
دوست را اندر طلسمِ امتحاں انداختہ

تا علاجِ خستگی آسائشِ دیگر دہد
خارہا در رہ گذارِ رہرواں انداختہ

مے سرائیم نغمۂ توحید و شورِ ایں نوا
چوں نیم سوز اخگرے در استخواں انداختہ

ق ۱۸۴۱ء

ترکیب بند

آں سحر خیزم کہ مہ را در شبستاں دیدہ ام
شب نشیناں را دریں گردندہ ایواں دیدہ ام

اینست خلوتخانهٔ روحانیاں کانجا ز دور
زهره را اندر ردائے نورِ عریاں دیده ام

هر یکے فارغ ز غیر و هر یکے نازاں بخویش
لولیے را در دو عشرت گه دو مهماں دیده ام

هرگز اے ناداں برسوائی نه بندی دل که من
ماه را در ثور و کیواں را به میزاں دیده ام

رفته ام زاں پس بسیرِ باغ و مرغاں را بباغ
سر بر سیم خواب زیرِ بال پنهاں دیده ام

کلکِ موجِ نکهتِ گل دم ز گردش نازده
نامهٔ فیضِ سحر ننوشته عنواں دیده ام

شانهٔ بادِ سحرگاهی به جنبش نامده
طرهٔ سنبل ببالیں بر پریشاں دیده ام

باد سرمستانه می جنبید و شبنم میچکید
غنچه در رختِ خواب آلوده داماں دیده ام

صبحِ اول گو بروئے کس نیاورد از حیا
صبحِ ثانی را بریں هنگامه خنداں دیده ام

محرمِ رازِ نهاں روزگارم کرده اند
تا بجرمِ فهم گوشش ننهد خلق خوارم کرده اند

روشناس چرخ در جمعِ اسیرانش منم
نورِ چشمِ روزنِ دیوارِ زندانش منم

ثابت و سیّارِ گردوں را رصد بستم بعلم
رشتهٔ تسبیحِ گوهرهائے غلطانش منم

نے ز دانش کامیاب و نے بسختیٔ دل
شرمسارِ کوششِ بر عیبِ کیوانش منم

در لئیمی شهرهٔ دهر از تهیدستیست چرخ
رفتهٔ مسکیں راز یاد و گنجِ پنهانش منم

تیر نازد گر به ادریسی بخاک انداز مشق
زهره نازد گر به بلقیسی سلیمانش منم

کعبه با من از مروت عذر خواهِ پائے ریش
در ادب شرمندهٔ خارِ مغیلانش منم

در غریبی خویش را از غصه در دل میخلم
خورده ام از شستِ غم تیرے که پیکانش منم

نوش چوں راه لبم گیرد ادا فهمش نیم
نیش چوں مغزِ دلم کاود زباندانش منم

مانده ام تنها بکنج از دورباشِ پاسِ صنع
خانه دارم که پندارند دربانش منم

پایهٔ من جز بچشمِ من نیاید در نظر
از بلندی اخترم روشن نیاید در نظر

مرد نہ بود گر ز ستم بر خاطرش بارے رسد
ہم ز خود در بحثم گرم از دشمن آزارے رسد

در رہ بارم ز رشک پائے راہپمائے خود
خوں فتد در دل ز زخمے کز سر خارے رسد

یخ فروشم در تموز و کلبہ دور از چارسوست
ہیرود سرمایہ از کف تا خریدارے رسد

راحت ما را ز بیرنگی برات آوردہ اند
بُت پرستاں را اسلام از نقش دیوارے رسد

دانش آں باشد کہ چشمِ دل بحق بینا شود
نے گمانِ باطلے کز وہم و پندارے رسد

طور و نخلِ طور نہ بود گر چہ در خرگاہِ خویش
ہر کس افروزد چراغے چوں شب تارے رسد

از دمِ بادِ سحر گاہی دل آسا ید ولے
جاں فزا تر باشد آں کز یاسمن زارے رسد

خوش بود دریوزۂ فیضِ الٰہی از علیؓ
گر چہ از ہر در نصیب ہر طلبگارے رسد

کہنہ دانم گر دہندم طیلسانِ مشتری
تازہ گردم از ردائے خواجہ گر تارے رسد

عاشقم لیکن ندانی کز خرد بیگانہ ام
ہوشیارم با خدا و با علیؓ دیوانہ ام

مکافاتِ عمل

ہست از تمیز گر بہ ہما استخواں دہد
آئینِ دہر نیست کہ کس را زیاں دہد

مزد ست مرد ہر چہ کند بخیر کند
را دست را دہر چہ دہد رائگاں دہد

گلزار را اگر نہ ثمر گل ہمیں نہد
درویش را اگر نہ سحر شام ناں دہد

گنج سخن نہد بہ نہانخانۂ ضمیر
وانگہ کلیدِ گنج بدست زباں دہد

تا روزِ خاک تیرہ نگردد ز رشکِ چرخ
رخشانی ستارہ بریگِ رواں دہد

تا آدمی ملال نگیرد ز یک ہوا
سرما و نو بہار و تموز و خزاں دہد

ہم در بہار گل شگفاند چمن چمن — تا راحتِ مشام ونشاط رواں دہد
ہم در تموز میوہ فشاند طبق طبق — تا آرزوئے کام ومرادِ دہاں دہد
آنرا کہ بخت دسترسِ بذل مال نیست — طبعِ سخن رس وخردِ خردہ داں دہد
آنرا کہ طالعِ کفِ گنجینہ پاش نیست
نعم البدل زخامۂ پرویں فشاں دہد — ق ۱۸۶۱ء

نوحہ

وقتست کہ در پیچ وخم نوحہ سرائی — سوز دنفسِ نوحہ گر از تلخ نوائی
وقتست کہ در سینہ زنی آلِ عبا را — سرپنجہ حنائی شود ورنگ ہوائی
وقتست کہ جبرئیل زبے مائگی درد — غم را ز دلِ فاطمہ خواہد بہ گدائی
وقتست کہ آں پردگیاں گزرد تعظیم — ق بر درگہِ شاں کردہ فلک ناصیہ سائی
از خیمۂ آتش زدہ عریاں بدر آیند — چوں شعلۂ دخاں برسرِ شاں کردہ ردائی
جانہا ہمہ افسردۂ تشویشِ اسیری — دلہا ہمہ خوں گشتۂ اندوہِ رہائی
اے چرخ چو آں شد دگر از بہر چہ گردی
اے خاک چو ایں شد دگر آسودہ چرائی
خوں گردد و فرو ریز اگر صاحب بہری
برخیز و بجوں غلط گر از اہلِ وفائی
تنہاست حسینؓ ابنِ علیؓ در صفِ اعدا — اکبر تو کجا رفتی و عباسؓ کجائی
توقیعِ شفاعت کہ پیمبر زِ خدا داشت — از خونِ حسینؓ ابنِ علیؓ یافت روائی

فریاد ازاں حامل منشور امامت ‌ ‌ فریاد ازاں نسخۂ اسرار خدائی
فریاد ازاں زاری و خونابہ فشانی ‌ ‌ فریاد ازاں خواری و بے برگ و نوائی
فریاد ز بے چارگی و خستہ درونی ‌ ‌ فریاد ز آوارگی و بے سر و پائی
غالب جگرے خوں کن و از دیدہ فرو بار
گر روئے شناسی غم شاہ شہدائی

معذرت

ردیف شعر ازاں کردم اختیار گرہ ‌ ‌ کہ از منست بر ابروئے شہریار گرہ
گرہ کشائے رموز خرد بہادر شاہ ‌ ‌ کہ ہیچ با خن تدبیر اوست خوار گرہ
ایا شہنشہ کشور کشائے دشمن بند ‌ ‌ ز بندہ در خم ابرو روا مدار گرہ
کہ چوں بدیں صفت اندر ضمیر من گذری ‌ ‌ بہ پیچ و تاب دلم را دہد فشار گرہ
بدست تنگ زباں رو مشو شم کہ مباد ‌ ‌ شود ز تنگی جا در دلم فگار گرہ
بدلکشائی گفتار من کہ غالب را ‌ ‌ مزن برشتۂ امید زینہار گرہ
ازیں گرہ کہ برابرو زدی چہ باک استم ‌ ‌ کہ در دولت ز ضعف نیست پائدار گرہ
نشاط سال نو و جشن این ہمایوں سال
بروز ناصیۂ شاہ نامدار گرہ

خطاب بہ ذوق

اے کہ در بزم شہنشاہ سخن رس گفتۂ ‌ ‌ کے بہر گوئی فلاں در شعر ہمسنگ من ست

نیست نقصاں یک دو جزو ست ار سوادِ ریختہ　　کاں وَرَم برگے ز نخلستانِ فرہنگِ من ست

فارسی بیں تا بہ بینی نقشہائے رنگ رنگ　　بگذر از مجموعۂ اردو کہ بیرنگِ من ست

فارسی بیں تا بدانی کاندر اقلیمِ خیال　　مانی وارژنگم و آں نسخہ ارتنگِ من ست

کے درخشد جوہرِ آئینہ تا باقیست زنگ　　صیقلی آئینہ ام ایں جوہر آں زنگِ من ست

ہاں من و یزداں بنائے شکوہ بر مہر و وفاست　　تا نہ پنداری بپرخاشِ تو آہنگِ من ست

دوست بُودی شکوہ سر کردم نے جُرم تو نیست　　کایں ہمہ بیداد بر من از دلِ تنگِ من ست

بختِ من ناساز و خوئے دوستاں ناساز تر　　تا چہ پیش آید کنوں با بختِ خود جنگِ من ست

دشمنی را ہمنفَسی شرط ست و آں دانی کہ نیست　　از تو ہنود نغمہ در سازے کہ در چنگِ من ست

در سخن چوں ہمزبان و ہمنوائے من نہ　　چوں ملت را ہیچ دتاب از رشکِ آہنگ من ست

راست میگوئم من و از راست سر نتواں کشید　　ہر چہ در گفتار فخرِ تست آں ننگِ من ست

میفرستم تا نظر گاہِ جہاندار ایں ورق　　نامہ بر بادا اگر خود طائرِ رنگِ من ست

دیدہ در سلطان سراج الدین بہادر شہ کہ اُو　　آں شرر بیند کہ پنہاں در رگِ سنگِ من ست

جم حشم شاہے کہ در ہنگامۂ عرضِ سپاہ　　میتواند گفت دارا را کہ سرہنگِ من ست

انوری و عسجدی و خاقانی سلطان منم　　پادشا طہمورث و جمشید و ہوشنگ من ست

شاہ میداند کہ من مداحِ شاہم باک نیست　　گر تو اندیشی کہ ایں دستان و نیرنگِ من ست

از ادب دُورم ز خاقاں ورنہ در اظہارِ قرب　　خطوہ و گامِ تو گوئی میل و فرسنگِ من ست

مقطعِ ایں قطعہ زیں مصرع مصرّع باد و بس
ہر چہ در گفتار فخرِ تست آں ننگِ منست

مرثیۂ شاہزادہ

اے دل بچشمِ زخمِ حوادث فگار شو ‌ اے چشم از ترادشِ دل اشکبار شو
اے خوں بدیدہ دُردِ گداز جگر فرست ‌ اے دم بسینہ دُودِ چراغِ مزار شو
اے لب بنوحہ نالۂ جانکاہ سازدہ ‌ اے سر بغصہ خاکِ سرِ رہ گذار شو
اے خاک چرخ گر نتواں زد زجا در آئے ‌ اے چرخ خاک گر نتواں شد غبار شو
اے نوبہار چوں تنِ بسمل بخوں لغلط ‌ اے روزگار چوں شبِ بے ماہ تار شو
اے ماہتاب رُوئے بہ سیلی کبُود کن ‌ اے آفتاب داغِ دلِ روزگار شو
اے فتنہ باد صبح وزید ابقدر مخسپ ‌ اے رستخیز وقت رسید آشکار شو

آہ ایں چہ سیل بود کہ ما را ز سر گذشت
تنہا ز سر مگو کہ ز دیوار و در گذشت

بگذر کہ بر من و تو جفا کرد روزگار ‌ با پادشاہ عہد چہا کرد روزگار
شاہِ سخن سرائے سخنور نواز را ‌ در بزمِ عیش نوحہ سرا کرد روزگار
شاخیکہ بود موسمِ آتش کہ بر دہد ‌ از نخلِ عمرِ شاہ جدا کرد روزگار
مرگ اینچنیں رُخ و تنِ نازک ندیدہ بود ‌ کامِ اجل بہ بہدیہ روا کرد روزگار
شہزادہ خردسال و بود روزگار پیر ‌ شوخی بشاہزادہ چہا کرد روزگار
فرزندِ بادشہ نشناسد معانقہ ‌ آغوشِ گور بہرِ چہ وا کرد روزگار
اے آنکساں کہ خاکِ رہِ شہریار را ‌ توجیہِ آبروئے شما کرد روزگار
ہرچند بے اجل نتواں ہیچگاہ مُرد ‌ آتش بخر[illegible] [illegible]ینہ کہ فرخندہ شاہ مُرد

اے قوم خویش را بشکیب امتحاں کنید — ایں کار را بشیوۂ کار آگہاں کنید
طفلست شاہزادہ و در رہ خطر بسیست — منعش ز عزم رہروی آں جہاں کنید
از میوہ و گل آنچہ فرستش خواہد آں دہید — از حیلہ آنچہ رائے شما باشد آں کنید
ہر حرفِ دلنشیں کہ بگوئید و بشنود — آں گفتہ را العبرہ بدہ خاطر نشاں کنید
وز خود ز رفتنش نتوانید باز داشت — بیخود شوید و جامہ درید و فغاں کنید
گیرید دشنہ در کف و ہم بر جگر زنید — تا سینہ را ز دیدہ فزوں خونچکاں کنید
زنہار پیش شاہ مگوئید و بے خبر — تابوت را بجانبِ مرقد رواں کنید

اے اہلِ شہر مدفن ایں دودماں کجاست
خاکم بفرق خوابگہِ خسرواں کجاست

اے رہ نوردِ عالم بالا چگونۂ — مابے تو در ہمیم تو بے ما چگونۂ
از سایہ در غمِ تو سیہ پوش شد ہما — اے خفتہ در نشیمن عنقا چگونۂ
زاں پس کہ با تو آب و ہوائے جہاں نساخت — در روضۂ جناں بتماشا چگونۂ
با گلرخانِ دہر فلے نداشتی — با حوریان آئینہ سیما چگونۂ
ما بیخوداں بحلقۂ ماتم نشستہ ایم — از خویشتن بگوئے کہ تنہا چگونۂ
بے مطرب و ندیم و غلامانِ خرد سال — بے باغ و قلعہ و لبِ دریا چگونۂ
بعد از تو شاہ خیلِ ترا بر قرار داشت — اینجا عزیز بودۂ آنجا چگونۂ

اے بعدِ مرگ راتبہ خوارِ تو عالمے
پروانۂ چراغ مزارِ تو عالمے



قصیدہ

دادگو تا ستم بر اندازد — طرحِ نو چرخ دیگر اندازد

در رگِ سازِ من نوائے ہست — کہ بہر غولہ اخگر اندازد

زیں نوائے شررفشاں ترسم — کآتش اندر نواگر اندازد

سرگزشتیست بر زباں کہ زباں — بر من از خویش خنجر اندازد

بامداداں کہ آسماں خواہد — کاہ من راز پا در اندازد

لمعۂ مہر در رگِ جانش — غلۂ نوکِ نشتر اندازد

تا ز چستی بہ مبحثِ کشتن — نونِ مصدر ز مصدر اندازد

زنگباری زنے بماتمِ دیو — از رخِ زشت چادر اندازد

وآنکہ از زیرِ گوشۂ چادر — گوہر آمود معجر اندازد

گوہر اما پرند در پیچد — از بر و دوش گوہر اندازد

گچہ دوبارہ گہ فرو فگنند — گاہ خلخال و پرگر اندازد

راہروانِ لوامعِ سحری — ہرچہ خاتون ز زیور اندازد

بربایند و ناپدید کنند — خود فلک طرح دیگر اندازد

ناگرفت آں بساط برچیند — ناگزیر آں بنا بر اندازد

چوں عرق کز جبیں چکد در سعی — جبہہ چرخِ اختر اندازد

ہر کہ بینی ہمی بروئے طناب — جامۂ را کہ شد تر اندازد

رختِ نمناکِ خویشتن گردوں — می برد تا بہ محور اندازد

تابشِ مہر و جنبشِ [illegible] — [illegible] اندازد

مہ چو طفلے کہ ترسد از غوغا　　خویشتن را ز منظر اندازد
سایہ را پایۂ نمودائے　　باد پندار در سر اندازد
باد کز بوئے بادہ مست شود　　پردہ از روئے گل بر اندازد
ساقیٔ انجمن نگہ خیز است　　بادہ و در کاسۂ زر اندازد
مطرب بزم زخمہ اش تیز است　　تاب در زلف مزمر اندازد

کلک من بیں کہ ہر نفس جانے　　در رگ تار مسطر اندازد
در سبہ مستی و سر اندازی　　ہر کجا ہرچہ در خور اندازد
با سلیماں زند دم از بلقیس　　در رہ مور شکر اندازد
با زلیخا اگر شود ہمراز　　طرح کاخ مصوّر اندازد
با سمندر اگر بود دمساز　　ہمہ آتش بدفتر اندازد
از نوائے کہ در غزل سنجد　　حلقہ در گوش را در اندازد
از طرازے کہ در دعا بندد　　بر ورق مشک از فر اندازد
آں قدر زی کہ در زمانۂ تو　　چرخ را کہنگی بر اندازد
تا قضا بہر آستانۂ تو
طرح نہ چرخ دیگر اندازد

راز و نیاز

بروزے کہ مردم شوند انجمن　　شود تازہ پیوند جاں ہا بہ تن
رواں را بہ نیکی نوازندگاں　　بسرمایۂ خویش نازندگاں

گہرہائے شہوار پیش آورند　　فرہیدہ کردار پیش آورند
ز نورے کہ ریزند و خرمن کنند　　جہاں را بجو و چشم روشن کنند
ہنگامہ با ایں جگر گوشگاں　　درآبند مشتے جگر توشگاں
ز حسرت بدل بردہ دنداں فرد　　ز خجلت سر اندر گریباں فرد
درآں حلقہ من باشم و سینۂ　　ز غمہائے ایام گنجینۂ
در آب و در آتش بسر بردہ　　ز دشوارئے زیستن مردۂ
بہ بخشائے برناکسی ہائے من　　تہیدست و درماندہ ام اُئے من
بدوشش ترا زد منہ بارِ من　　نسنجیدہ بگذار کہ کردارِ من
بکردار سنجی میفزائے رنج　　گرانبارئے ورد عمرم بسنج
اگر دیگراں را بود گفت و کرد　　مرا مایۂ عمر رنجست و درد
وگر ہمچنیں ست فرجام را　　کہ می باید از کردہ راندن شمار
مرا نیز بارائے گفتار دہ　　چو گویم بر آں گفتہ زنہار بہ
دریں خستگی پوزش از من مجو　　بود بندۂ خستہ گستاخ گو
دل از غصہ خوں شد نہفتن چہ سود　　چو ناگفتہ دانی بہ گفتن چہ سود
زباں گرچہ من دارم اما ز تست　　بہ تست ارچہ گفتار اما ز تست
ہمانا تو دانی کہ کافر نیم　　پرستار خورشید و آذر نیم
نکشتم کسے را بہر ہمینے　　نبردم ز کس مایہ در رہزنی
نگرمے کہ آتش بگورم از دست　　بہنگامہ پرواز مورم از دست
من اندوہگیں و مے اندوہ ربا　　چہ می کردم اے بندہ پرور خدا!
حساب مے و رامش و رنگ و بوئے　　ز جمشید و بہرام و پرویز جوئے
کہ از بادہ تا چہرہ افروختند　　دل دشمن و چشم بد سوختند

نہ از من کہ از تابِ مے گاہ گاہ
بدریوزۂ رُخ کردہ باشم سیاہ

نہ بستاں سرائے نہ میخانۂ
نہ دستاں سرائے نہ جانانۂ

نہ رقصِ پری پیکراں بر بساط
نہ غوغائے رامشگراں در رباط

شبانگہ بہ مے رہنمونم شدے
سحرگہ طلبگارِ خونم شدے

تمنائے معشوقۂ بادہ نوش
تقاضائے بیہودۂ میفروش

چہ گویم چو ہنگامِ گفتن گزشت
زعمرِ گرانمایہ برمن گزشت

بسا روز کاں را بدلدادگی
بسا نو بہاراں دلے بادگی

بسا روز باراں و شبہائے ماہ
کہ بودست بی مے بچشمم سیاہ

اُفقہا پُر از ابرِ بہمن مہی
سفالینہ جامِ من از مے تہی

بہاراں و من در غمِ برگ و ساز
درِ خانہ از بینوائی فراز

جہاں از گل و لالہ پُر بو و رنگ
من و حجرہ و دامنے زیرِ سنگ

دمِ عیش جُز رقصِ بسمل نبود
باندازۂ خواہشِ دل نہ بود

اگر تافتم رشتۂ گوہر شکست
دگر یافتم بادہ ساغر شکست

سر از منتِ ناکساں زیرِ خاک
لب از خاکبوسِ خساں چاک چاک

بہ گیتی درم بے نوا داشتی
دلم را اسیرِ ہوا داشتی

نہ بخشندہ شاہے کہ بارم دہد
بہر بار زر پیل بارم دہد

کہ چوں پیل زانجا برانگیزمے
زرش بر گدایاں فرو ریزمے

نہ نازک نگارے کہ نازش کشم
بہر بوسہ زلفِ درازش کشم

چو زاں غمزہ نیشے بدل بر خورد
رگِ جانِ غم نوکِ نشتر خورد

چو آں نامرادی بیاد آیدم
بفردوس ہم دل نیاسایدم

بہشت

صبوحی خورم گر شراب طہور   کجا زہرۂ صبح و جام بلور
دم شبرد ہائے مستانہ کو   بہنگامہ غوغائے مستانہ کو
دراں پاک میخانۂ بے خروش   چہ گنجائش شورش نائے و نوش
سیہ مستئ ابر و باراں کجا   خزاں چوں نباشد بہاراں کجا
اگر حور در دل خیالش کہ چہ   غم ہجر و ذوق وصالش کہ چہ
چہ منت نہد ناشناسا نگار   چہ لذت دہد وصل بے انتظار
گریزد دم بوسہ ایمانش کجا   فریبد بسوگند و نیش کجا
برد حکم و نبود لبش تلخ گو   دہد کام و نبود دلش کامجو
نظر بازی و ذوق دیدار کو   بفردوس روزن بدیوار کو
نہ چشم آرزومند و لالہ   نہ دل تشنۂ ماہ پرکالہ
از ینہا کہ پیوستہ میخواست دل   ہنوزم ہماں حسرت آلاست دل

معراج

قدزد براہے کہ رفتن نداشت   نگہبان و ہمراہ و رہزن نداشت
در آنجا کہ از روئے فرسنگ راہے   بجا باشد از خود نگوید جائے
جہت را دم خودنمائی نماند   زمان و مکاں را روائی نماند
غبار نظر شد زرہ ناپدید   سراپائے بینندہ شد جملہ دید

در آورد بے کلفت سمت و سوئے
بنور السمٰوات والارض روئے

تماشا ہلاک جمال بسیط
فروغ نظر موجۂ زاں محیط

شنیدن شہید کلام شگرف
منزہ ز آمیزش صوت و حرف

کلامے بہ ہمرنگئے ذات علم
شنیدن بعقل اندر اثبات علم

نخستیں و راز لا کشود آں رواق
ز الّا بصدر اندرش پیش طاق

بر الّا رسید و ز لا در گزشت
رسیدن ز پیوند جا در گزشت

دراں خلوت آباد راز و نیاز
بروئے دوئی بود چوں در فراز

نماند اندر احمد ز میمش اثر
کہ آں حلقۂ بود بیرون در

احد جلوہ گر باشیون و صفات
نبیؐ محو حق چوں صفت عین ذات

دو عالم خروش نواہائے راز
ولیکن ہماں در خم بند ساز

ورق در ورق نکتۂ دلپذیر
ولیکن ہماں در خیال دبیر

ز گفتن شنیدن جدائی نداشت
نمودن ز دیدن جدائی نداشت

چو اندازۂ ہر نمائش گرفت
ز وحدت بکثرت گرائش گرفت

بحکم تقاضائے حب ظہور
تنزل در اندیشہ آورد زور

احد کسوت احمدی یافتہ
دم دولت سرمدی یافتہ

محفل شراب

ہوائے انجمن آرائیم فتاد بسر
شراب خوارہ تنے چند خواہم ز احباب

کہ مے خورند چو از بادہ رُخ برافروزند　　بسوزِ رشکِ دلِ حاسداں کنند کباب
تو لے ندیم و تو اے ساقی و تو لے مطرب　　بسوزِ عود و بہ پیمانہ و بساز رباب
کجائی اے مہ خورشید جلوہ ہیں ساغر!　　کجائی اے بُتِ ناہید نغمہ ہاں مضراب
معاشرانِ نکو نام و فرخی فرجام　　پس از ادائے سپاسِ مفتح الابواب
بزمگاہ بیارید یک دو گلشن گل　　بخاکِ راہ بپاشید یک دو دجلہ گلاب
بنامِ خویش بگیتی زنید نقشِ مراد　　بہ بزمِ عیش لبِ ساغر کنید لعلِ مذاب
بخاکِ راہ ز مستی مے آں قدر ریزید　　کہ تا ابد دمد از خاک لالۂ شاداب
دہید بادۂ گلفام و چوں سلام کنم　　ہماں بہ بادہ سلام مرا دہید جواب
بیفگنید ثنا دیل آبگینہ ز کف　　بہ سقفِ حجرہ بہ بندید زہرہ و مہتاب
زنید چشمک آسشام مے بیکدیگر　　دمے کہ بر دمد از بادہ در پیالہ حباب
دو جامِ بادۂ شیریں بمن دہید کہ من　　نہ خوش بود کہ بود تلخ کامِ زہرِ عتاب
یکے بشادیٔ تسخیرِ صوبۂ لاہور　　دوم بفرخیٔ عمر و دولتِ نواب
جہاں ستان و جہاں بخش ہا ڈنگ کہ ہست　　شہاب رمح و فلک توسن و ہلال رکاب

غالب کا اسیریہ

خواہم از بند بہ زنداں سخن آغاز کنم　　غمِ دل پردہ دری کرد فغاں ساز کنم
بہ نوائے کہ ز مضراب چکاند خوناب　　خویشتن را بہ سخن زمزمہ پرداز کنم
در خرابی بہ جہاں میکدہ بنیاد نہم　　در اسیری بہ سخن دعویٔ اعجاز کنم
بے مشقت نہ بود قید، بہ شعر آویزم　　روزکے چند رسن تابی آواز کنم

چوں سرائم سخن انصاف ز مجرم خواہم
چوں نویسم غزل اندیشہ ز غماز کنم

تا چہ افسوں بہ خود از ہیبت صیاد دمم
تا چہ خوں در جگر از حسرت پرواز کنم

یار دیرینہ قدم رنجہ مفرما کاینجا
آں نگنجد کہ تو در کوبی و من باز کنم

ہائے ناسازیِ طالع کہ من گردد باز
با خرد شکوہ گر از طالع ناساز کنم

اہلِ زنداں بسپرد چشم خودم جا دادند
تا بدیں صدر نشینی چہ قدر ناز کنم

ہلہ دزدانِ گرفتار وفا نیست بشہر
خویشتن را بہ شما ہمدم و ہمراز کنم

من گرفتارم و ایں دائرہ دوزخ تن زن
در سخن پیرویِ شیوۂ اعجاز کنم

گرچہ توقیعِ گرفتاریِ جاویدم نیست
لیکن از دہر دگر خوشدلی امیدم نیست

شمع ہر چند بہر زاویہ آساں سوزد
خوشتر آنست کہ بر نطع در ایواں سوزد

عودِ من ہرزہ مسوزید اگر سوختنی ست
بگذارید کہ در مجمر سلطاں سوزد

خانہ ام ز آتشِ بیداد عدو سوخت ولیک
سوختن داشت ز شمعیکہ شبستاں سوزد

منم آں خستہ کہ گر زخمِ جگر بنمایم
بر من از مہر دلِ گبر و مسلماں سوزد

منم آں سوختہ خرمن کہ ز افسانۂ من
نفس رہرو و رہزن و دہقاں سوزد

منم آں قیس کہ گر سوئے من آید لیلی
محمل از شعلۂ آوازِ حدی خواں سوزد

تا چساں گذرد روزم بہ شبہا دریاب
از چراغے کہ عسس بر درِ زنداں سوزد

تنم از بند و بانبوہِ رقیباں لرزد
دلم از درد بر اندوہِ اسیراں سوزد

از نمِ دیدۂ من فتنۂ طوفاں خیزد
از تفِ نالۂ من جوہرِ کیواں سوزد

آہ ازیں خانہ کہ روشن نشود در شبِ تار
جز بداں خواب کہ در چشمِ نگہباں سوزد

اے کہ در زاویہ شبہا بچراغم شمری
دلم از سینہ بروں آر کہ داغم شمری

پاسبانان ہم آئید کہ من می آیم — در زنداں بکشائید کہ من می آیم
ہر کہ دیدے بدرِ خویش سپاسم گفتے — خبر مقدم بسرائید کہ من می آیم
جادہ نشناسم و ز انبوہِ شمامے ترسم — راہم از دور نمائید کہ من می آیم
رہبرِ جادۂ تسلیم درشتی نہ کند — سخت گیرندہ چرائید کہ من می آیم
خستن من در رہ و تعذیب ضرورست اینجا — نمک آرید و بپائید کہ من می آیم
عارضِ خاک بپاشیدن خوں تازہ کنید — رونق خانہ فزائید کہ من می آیم
چوں من آیم بشما شکوۂ گردوں نہ رواست — زیں سپس ناز نخائید کہ من می آیم
ہاں عزیزاں کہ دریں کلبہ اقامت دارید — بخت خود را بستائید کہ من می آیم
تا بدروازۂ زنداں پئے آوردن من — قدمے رنجہ نمائید کہ من می آیم
چوں سخن سنجی و فرزانگی آئینِ من است — بہرہ از من بربائید کہ من می آیم
بخود از شوق ببالید کہ خود باز رود — بمن از مہر گرائید کہ من می آیم

بسکہ خویشاں شدہ بیگانہ ز بدنامیِ من
غیر شگفت ار خورد گر غمِ ناکامیِ من

آنچہ فرداست ہم امروز در آمد گوئی — آفتاب از جہتِ قبلہ بر آمد گوئی
دل و دستیکہ مرا بود فرو ماند ز کار — شب و روزیکہ مرا بود بسر آمد گوئی
سرگذشتم ہمہ رنج و الم آرد گفتی — سرنوشتم ہمہ خوف و خطر آمد گوئی
بہرۂ اہلِ جہاں چوں ز جہاں درد و غم است — بہرۂ من ز جہاں بیشتر آمد گوئی
خستن و بستنِ من حدِ عسس نیست برد — بر من اینہا ز قضا و قدر آمد گوئی
ہنرم را نتواں کرد بہ خستن ضائع — خستگی غازۂ روئے ہنر آمد گوئی
غمِ دل داشتم اینک غمِ جانم دادند — زخم را زخم دگر بر اثر آمد گوئی
چرخ یک مرد گرانمایہ بزنداں خواہد — یوسف از قیدِ زلیخا بدر آمد گوئی

مژه امشب ز کجا این همه خوناب آورد — اینچنین گرم ز زخمِ جگر آمد گوئی
خواجه‌ئی هست درین شهر که از پرسشِ وے — پایهٔ خویشتنم در نظر آمد گوئی

مصطفیٰ خاں که درین واقعه غمخوارِ من است
گر بمیرم چه غم از مرگ عزادارِ من است

خواجه‌ئی‌ام که بسے روز نمانم در بند — لیک دانی که شب از روز ندانم در بند
نپسندم که کس آید نتوانم که روم — جانبِ در به چه حسرت نگرانم در بند
خسته‌ام خسته، من و دعویٔ تمکین حاشا — بند سخت ست تپیدن نتوانم در بند
شادم از بند که از بندِ معاش آزادم — از کفِ شحنه رسد جامه و نانم در بند
آمه و خامه بیارید و سجل بنویسید — خواب از بخت همی دام ستانم در بند
یارب این گوهرِ معنی که فشانم ز کجاست — بند بر دل بود و نیست زبانم در بند
هرکس از بندِ گراں نالد و ناکس که منم — نالم از خویش که بر خویش گرانم در بند
خوئے خوش بهرِ مصیبت زده گنجے دگر است — رنجه از دیدنِ رنجِ دگرانم در بند
رفته در بارهٔ من حکم که با ورد دریغ — شش مه از عمرِ گرامی گزرانم در بند
اگر این است خود آنست که عیدِ اضحیٰ — گذرد نیز چو عیدِ رمضانم در بند
مدتِ قید اگر در نظرم نیست چرا — خونِ دل از مژه بے صرفه چکانم در بند

نیستم طفل که در بندِ رہائی باشم
هم ز ذوق ست که در سلسله خائی باشم

من نه آنم که ازین سلسله ننگم نبود — چکنم چوں بقضا زهرهٔ جنگم نبود
زیں دو رنگ آمده صد رنگ خرابی بظهور — گله‌ئی نیست که از بخت دو رنگم نه بود
رازِ دانا غمِ رسوائی جاوید بلاست — بهر آزار غمم از قیدِ فرنگم نه بود
لرزه از خوف درین حجره که از خشت و گل ست — ور نه در دل خطر از کامِ نهنگم نه بود

منعم آئینہ و ایں حادثہ زنگ ست ولے
تابِ بدنامیِ آلائشِ زنگم نہ بود

ہمدما دارم امیدِ رہائی در بند
دامن از بعدِ رہائی تہِ سنگم نہ بود

جورِ اعداء رود از دل برہائی لیکن
طعنِ احباب کم از زخمِ خدنگم نہ بود

بہ شگاف قلم از سینہ بروں می ریزم
بسکہ گنجائی غم در دلِ تنگم نہ بود

حاش للہ کہ دریں سلسلہ باشم خوشنود
چکنم چوں سرِ ایں رشتہ بچنگم نہ بود

بصریرِ قلمِ خویش بود مستیٔ من
اندریں بندِ گراں بین و سبکدستیٔ من

ہمدماں در دلم از دید نہانید ہمہ
غالبِ غمزدہ را روح و روانید ہمہ

للہ الحمد کہ در عیش و نشاطید ہمہ
للہ الشکر کہ با شوکت و شانید ہمہ

ہم در آئینِ نظم سحر طرازید ہمہ
ہم در اقلیمِ سخن شاہ نشانید ہمہ

چشمِ بد دور کہ فرخندہ لقائید ہمہ
شاد باشید کہ فرخ گہرانید ہمہ

سودِ بینایہ، وفا دیدہ و نورید ہمہ
زندہ مانید، صفا قالب و جانید ہمہ

من بجوں خفتہ و بینم ہمہ بینید ہمہ
من جگر خستہ و دانم ہمہ دانید ہمہ

درمیاں ضابطۂ مہر و وفائے بود ست
من بر آنیم کہ ہر آئینہ بر آنید ہمہ

روزے از مہر نگفتید فلانے چوں است
بارے از لطف بگوئید چسانید ہمہ

گر نباشم بجہاں خار و خسے کم گیرید
انچہ سرو و سمن باغِ جہانید ہمہ

چارہ گر نتواں کرد دعائے کافی ست
دل اگر نیست خداوند زبانید ہمہ

ہفت بند است کہ در بند رقم ساختہ ام
بنویسید بہ بینید و بخوانید ہمہ

آں نباشم کہ بہ ہر بزم ز من یاد آرید
دارم امید کہ در بزمِ سخن یاد آرید

سحرِ حلال

زخمہ بر تارِ رگِ جاں میزنم — کس چہ داند تا چہ دستاں میزنم
زخمہ بر تارم پریشاں میرود — کایں نواہائے پریشاں میزنم
چوں ندیدم کز نوایش خوں چکد — طعنہ بر مرغِ سحر خواں مے زنم
خامہ ہمراہِ دمِ گرمِ من ست — آتش از نے در نیستاں میزنم
جوئے شیر از سنگ را نازِ الٰہی ست — ہر گہ از تیشہ بر کاں میزنم
دیگراں گر تیشہ بر کاں میزنند — من ہمیں چوں بر بدخشاں میزنم
گریہ را در دل نشاطے دیگر ست — خندہ بر لبہائے خنداں میزنم
باز شوقم در خروش آوردہ است — باز ہوئے ہمچو مستاں میزنم
رازدانِ خوئے دہرم کردہ اند — خندہ بر دانا و ناداں میزنم
در خراباتم ندیدستی خراب — بادہ پنداری کہ پنہاں میزنم
خوئے آدم دارم آدم زادہ ام — آشکارا دم ز عصیاں میزنم
بادہ در ابرِ بہاراں میزدم — حالیا در تیرہ باراں میزنم
طعنہ بر زرقِ مے آلودم مزن — نیست ساغر مے بہ نیکاں میزنم
غالبم از مے پرستی نگذرم — غوطہ در گرداب طوفاں میزنم
تو درینجا بینی و من خود ہنوز — جامِ مے در بزمِ اعیاں میزنم
در ترقی مے نگنجد گفتگو — در تنزل دم ز عرفاں میزنم
می ستیزم با قضا از دیر باز — خویش را بر تیغِ عریاں میزنم

لعب با شمشیر و خنجر مے کُنم　　بوسہ بر ساطُور و پیکاں میزنم
بر خرامِ زُہرہ و رفتارِ تیر　　چشمکے دارم کہ پنہاں میزنم
گہ گہے کز پایہ مے آیم فرود　　حرف با برجیس و کیواں میزنم
مے برد از من قضا چنداں کہ من　　گوئے گردوں را بہ چوگاں میزنم

نوائے ظفر

۱۸۴۷ء تا ۱۸۵۷ء

ادائے خاص سے غالبؔ ہُوا ہے نکتہ سرا
صلائے عام ہے یارانِ نکتہ داں کے لئے

نوائے ظفر

غزلیات

بزمِ شاہنشاہ میں اشعار کا دفتر کھلا — رکھیو یا رب یہ درِ گنجینۂ گوہر کھلا
شب ہوئی پھر انجمِ رخشندہ کا منظر کھلا — اس تکلّف سے کہ گویا بتکدے کا در کھلا
گرچہ ہوں دیوانہ پر کیوں دوست کا کھاؤں فریب — آستیں میں دشنہ پنہاں ہاتھ میں خنجر کھلا
گو نہ سمجھوں اسکی باتیں گو نہ پاؤں اسکا بھید — پر یہ کیا کم ہے کہ مجھ سے وہ پری پیکر کھلا
ہے خیالِ حُسن میں حُسنِ عمل کا سا خیال — خُلد کا اک در ہے میری گور کے اندر کھلا
مُنہ نہ کھُلنے پر ہے وہ عالم کہ دیکھا ہی نہیں — زلف سے بڑھکر نقاب اس شوخ کے مُنہ پر کھلا
در پہ رہنے کو کہا اور کہہ کے کیسا پھر گیا — جتنے عرصے میں مرا لپٹا ہُوا بستر کھلا
کیوں اندھیری ہے شبِ غم ہے بلاؤں کا نزول — آج ادھر ہی کو رہے گا دیدۂ اختر کھلا
کیوں رہوں غربت میں خوش جب ہو حوادث کا یہ حال — نامہ لاتا ہے وطن سے نامہ بر اکثر کھلا

اُس کی اُمت میں ہوں میں میرے رہیں کیوں کام بند
واسطے جس شہ کے غالب گنبدِ بے در کھلا

یہ نہ تھی ہماری قسمت کہ وصالِ یار ہوتا — اگر اور جیتے رہتے یہی انتظار ہوتا

ترے وعدے پر جیے ہم تو یہ جان جھوٹ جانا ۔ کہ خوشی سے مر نہ جاتے اگر اعتبار ہوتا
تری نازکی سے جانا کہ بندھا تھا عہد بودا ۔ کبھی تو نہ توڑ سکتا اگر استوار ہوتا
کوئی میرے دل سے پوچھے ترے تیرِ نیم کش کو ۔ یہ خلش کہاں سے ہوتی جو جگر کے پار ہوتا
یہ کہاں کی دوستی ہے کہ بنے ہیں دوست ناصح ۔ کوئی چارہ ساز ہوتا کوئی غمگسار ہوتا
رگِ سنگ سے ٹپکتا وہ لہو کہ پھر نہ تھمتا ۔ جسے غم سمجھ رہے ہو یہ اگر شرار ہوتا
غم اگرچہ جاں گسل ہے پہ کہاں بچیں کہ دل ہے ۔ غمِ عشق گر نہ ہوتا غمِ روزگار ہوتا
کہوں کس سے میں کہ کیا ہے شبِ غم بری بلا ہے ۔ مجھے کیا برا تھا مرنا اگر ایک بار ہوتا
ہوئے مر کے ہم جو رسوا ہوئے کیوں نہ غرقِ دریا ۔ نہ کبھی جنازہ اٹھتا نہ کہیں مزار ہوتا
اسے کون دیکھ سکتا کہ یگانہ ہے وہ یکتا ۔ جو دوئی کی بو بھی ہوتی تو کہیں دوچار ہوتا

یہ مسائلِ تصوف یہ ترا بیان غالب
تجھے ہم ولی سمجھتے جو نہ بادہ خوار ہوتا

درخورِ قہر و غضب جب کوئی ہم سا نہ ہوا ۔ پھر غلط کیا ہے کہ ہم سا کوئی پیدا نہ ہوا
بندگی میں بھی وہ آزادہ و خودبیں ہیں کہ ہم ۔ الٹے پھر آئے درِ کعبہ اگر وا نہ ہوا
سب کو مقبول ہے دعویٰ تری یکتائی کا ۔ روبرو کوئی بتِ آئینہ سیما نہ ہوا
کم نہیں نازشِ ہم نامیِ چشمِ خوباں ۔ تیرا بیمار برا کیا ہے اگر اچھا نہ ہوا
سینے کا داغ ہے وہ نالہ کہ لب تک نہ گیا ۔ خاک کا رزق ہے وہ قطرہ جو دریا نہ ہوا
نام کا میرے ہے جو دکھ کہ کسی کو نہ ملا ۔ کام کا میرے ہے وہ فتنہ کہ برپا نہ ہوا
ہر بنِ مو سے دمِ ذکر نہ ٹپکے خوں ناب ۔ حمزہ کا قصہ ہوا عشق کا چرچا نہ ہوا
قطرے میں دجلہ دکھائی نہ دے اور جزو میں کل [1] ۔ کھیل لڑکوں کا ہوا دیدۂ بینا نہ ہوا

---

[1] غالباً ذوق کے شعر کی طرف اشارہ ہے ؎

دانہ خرمن ہے ہمیں قطرہ ہے دریا ہم کو ۔ آئے ہے جزو میں نظر کل کا تماشا ہم کو

تھی خبر گرم کہ غالبؔ کے اُڑینگے پُرزے
دیکھنے ہم بھی گئے تھے پہ تماشا نہ ہُوا

درد منّت کشِ دوا نہ ہُوا — میں نہ اچھا ہُوا، بُرا نہ ہُوا
جمع کرتے ہو کیوں رقیبوں کو؟ — اِک تماشا ہُوا گلا نہ ہُوا
ہم کہاں قسمت آزمانے جائیں — تو ہی جب خنجر آزما نہ ہُوا
کتنے شیریں ہیں تیرے لب کہ رقیب — گالیاں کھا کے بے مزا نہ ہُوا
ہے خبر گرم اُن کے آنے کی — آج ہی گھر میں بوریا نہ ہُوا
کیا وہ نمرود کی خدائی تھی؟ — بندگی میں مرا بھلا نہ ہُوا
جان دی، دی ہوئی اُسی کی تھی — حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہُوا
زخم گر دب گیا، لہو نہ تھما — کام گر رک گیا، روا نہ ہُوا
رہزنی ہے کہ دِلستانی ہے — لے کے دل دِلستاں روانہ ہُوا

کچھ تو پڑھئے کہ لوگ کہتے ہیں
آج غالبؔ غزل سرا نہ ہُوا

میں اور بزمِ مے سے، یُوں تشنہ کام آؤں — گر میں نے کی تھی توبہ، ساقی کو کیا ہُوا تھا
ہے ایک تیر جس میں دونوں چھِدے پڑے ہیں — وہ دن گئے کہ اپنا دل سے جگر جُدا تھا

درماندگی میں غالبؔ کچھ بن پڑے تو جانوں
جب رشتہ بے گرہ تھا، ناخن گرہ کشا تھا

گھر ہمارا جو نہ روتے بھی تو ویراں ہوتا — بحر اگر بحر نہ ہوتا، تو بیاباں ہوتا
تنگیٔ دل کا گِلہ کیا یہ وہ کافر دل ہے — کہ اگر تنگ نہ ہوتا تو پریشاں ہوتا
بعد یک عمرِ ورع بار تو دیتا بارے — کاش رضواں ہی درِ یار کا درباں ہوتا

نہ تھا کچھ تو خدا تھا کچھ نہ ہوتا تو خدا ہوتا
ڈبویا مجھ کو ہونے نے نہ ہوتا میں تو کیا ہوتا

ہوا جب غم سے یوں بے حس تو غم کیا سر کے کٹنے کا
نہ ہوتا گر جدا تن سے، تو زانو پر دھرا ہوتا

ہوئی مدت کہ غالب مر گیا پر یاد آتا ہے
وہ ہر اک بات پر کہنا کہ "یوں ہوتا تو کیا ہوتا"

ہوئی تاخیر تو کچھ باعثِ تاخیر بھی تھا
آپ آتے تھے مگر کوئی عناں گیر بھی تھا

تم سے بے جا ہے مجھے اپنی تباہی کا گلہ
اس میں کچھ شائبۂ خوبیٔ تقدیر بھی تھا

تو مجھے بھول گیا ہو تو پتہ بتلا دوں
کبھی فتراک میں تیرے کوئی نخچیر بھی تھا

بجلی اک کوند گئی آنکھوں کے آگے تو کیا
بات کرتے کہ میں لب تشنۂ تقریر بھی تھا

یوسف اس کو کہوں اور کچھ نہ کہے خیر ہوئی
گر بگڑ بیٹھے تو میں لائق تعزیر بھی تھا

دیکھ کر غیر کو ہو کیوں نہ کلیجہ ٹھنڈا؟
نالہ کرتا تھا، ولے طالبِ تاثیر بھی تھا

پیشے میں عیب نہیں رکھیے نہ فرہاد کو نام
ہم ہی آشفتہ سروں میں وہ جواں میر بھی تھا

ہم تھے مرنے کو کھڑے۔ پاس نہ آیا نہ سہی
آخر اس شوخ کے ترکش میں کوئی تیر بھی تھا

پکڑے جاتے ہیں فرشتوں کے لکھے پر ناحق
آدمی کوئی ہمارا دمِ تحریر بھی تھا

ریختے کے تمہیں استاد نہیں ہو غالب
کہتے ہیں اگلے زمانے میں کوئی میر بھی تھا

ذکر اس پری وش کا اور پھر بیاں اپنا
بن گیا رقیب آخر تھا جو رازداں اپنا

مے وہ کیوں بہت پیتے بزمِ غیر میں یارب
آج ہی ہوا منظور ان کو امتحاں اپنا

منظر اک بلندی پر اور ہم بنا سکتے
عرش سے پرے ہوتا کاش کے مکاں اپنا

دے وہ جس قدر ذلت ہم ہنسی میں ٹالیں گے
بارے آشنا نکلا ان کا پاسباں اپنا

درد دل لکھوں کب تک، جاؤں انکو دکھلاؤں — انگلیاں فگار اپنی، خامہ خونچکاں اپنا
گھستے گھستے مٹ جاتا آپ نے عبث بدلا — ننگ سجدہ سے میرے سنگ آستاں اپنا
تا کرے نہ غمازی کرلیا ہے دشمن کو — دوست کی شکایت میں ہم نے ہمزباں اپنا
ہم کہاں کے دانا تھے؟ کس ہنر میں یکتا تھے
بے سبب ہوا غالب دشمن آسماں اپنا

جور سے باز آئے پر باز آئیں کیا — کہتے ہیں "ہم تجھ کو منہ دکھلائیں کیا"
رات دن گردش میں ہیں سات آسماں — ہو رہے گا کچھ نہ کچھ گھبرائیں کیا
لاگ ہو تو اس کو ہم سمجھیں لگاؤ — جب نہ ہو کچھ بھی تو دھوکا کھائیں کیا
ہو لئے کیوں نامہ بر کے ساتھ ساتھ؟ — یارب! اپنے خط کو ہم پہنچائیں کیا
موج خوں سر سے گزر ہی کیوں نہ جائے — آستان یار سے اٹھ جائیں کیا
عمر بھر دیکھا کئے مرنے کی راہ — مر گئے پر دیکھئے دکھلائیں کیا
پوچھتے ہیں وہ کہ غالب کون ہے؟
کوئی بتلاؤ کہ ہم بتلائیں کیا

گھر جب بنا لیا ترے در پر کہے بغیر — جانے گا اب بھی تو نہ مرا گھر؟ کہے بغیر
کہتے ہیں جب رہی نہ مجھے طاقت سخن — جانوں کسی کے دل کی میں کیونکر کہے بغیر
کام اس سے آ پڑا ہے کہ جس کا جہان میں — لیوے نہ کوئی نام ستمگر کہے بغیر
جی میں ہی کچھ نہیں ہے ہمارے وگرنہ ہم — مرجائے یا رہے نہ رہیں پر کہے بغیر
چھوڑوں گا میں نے اس بت کافر کا پوجنا — چھوڑے نہ خلق گو مجھے کافر کہے بغیر
مقصد ہے ناز و غمزہ ولے گفتگو میں کام — چلتا نہیں ہے دشنہ و خنجر کہے بغیر
ہر چند ہو مشاہدۂ حق کی گفتگو — بنتی نہیں ہے بادہ و ساغر کہے بغیر
بہرا ہوں میں تو چاہیے دونا ہو التفات — سنتا نہیں ہوں بات مکرر کہے بغیر

غالب نہ کر حضور میں تو بار بار عرض
ظاہر ہے تیرا حال سب اُن پر کہے بغیر

ہے بسکہ ہر اک اُن کے اشارے میں نشاں اور
کرتے ہیں محبت تو گزرتا ہے گماں اور

یارب! وہ نہ سمجھے ہیں نہ سمجھیں گے مری بات
دے اور دل ان کو جو نہ دے مجھکو زباں اور

ابرو سے ہے کیا اُس نگہ ناز کو پیوند
ہے تیر مقرر مگر اسکی ہے کماں اور

تم شہر میں ہو تو ہمیں کیا غم؟ جب اُٹھینگے
لے آئینگے بازار سے جاکر دل و جاں اور

ہر چند سبکدست ہوئے بت شکنی میں
ہم ہیں تو ابھی راہ میں ہیں سنگ گراں اور

ہے خون جگر جوش میں دل کھول کے روتا
ہوتے جو کئی دیدۂ خوں نابہ فشاں اور

مرتا ہوں اس آواز پہ ہر چند سر اُڑ جائے
جلاد کو لیکن وہ کہے جائیں کہ "ہاں اور"

لوگوں کو ہے خورشید جہاں تاب کا دھوکا
ہر روز دکھاتا ہوں میں اک داغ نہاں اور

لیتا نہ اگر دل تمہیں دیتا کوئی دم چین
کرتا جو نہ مرتا کوئی دن آہ و فغاں اور

پاتے نہیں راہ تو چڑھ جاتے ہیں نالے
رکتی ہے مری طبع تو ہوتی ہے رواں اور

ہیں اور بھی دنیا میں سخنور بہت اچھے
کہتے ہیں کہ غالب کا ہے انداز بیاں اور

کیونکر اس بت سے رکھوں جان عزیز
کیا نہیں ہے مجھے ایمان عزیز

دل سے نکلا پہ نہ نکلا دل سے
ہے ترے تیر کا پیکان عزیز

تاب لائے ہی بنے گی غالب
واقعہ سخت ہے اور جان عزیز

کی وفا ہم سے تو غیر اسکو جفا کہتے ہیں
ہوتی آئی ہے کہ اچھوں کو برا کہتے ہیں

آج ہم اپنی پریشانیٔ خاطر اُن سے
کہنے جاتے تو ہیں پر دیکھئے کیا کہتے ہیں

اگلے وقتوں کے ہیں یہ لوگ انہیں کچھ نہ کہو
جو مے و نغمہ کو اندوہ ربا کہتے ہیں

دل میں آ جائے ہے ہوتی ہے جو فرصت غش سے
اور پھر کون سے نالے کو رسا کہتے ہیں

ہے پرے سرحدِ ادراک سے اپنا مسجود
قبلے کو اہلِ نظر قبلہ نما کہتے ہیں

پائے افگار پہ جب سے تجھے رحم آیا ہے
خارِ رہ کو ترے ہم مہر گیا کہتے ہیں

اک شرر دل میں ہے اس سے کوئی گھبرائے گا کیا
آگ مطلوب ہے ہم کو جو ہوا کہتے ہیں

دیکھیے لاتی ہے اس شوخ کی نخوت کیا رنگ
اس کی ہر بات پہ ہم "نامِ خدا" کہتے ہیں

وحشت و شیفتہ اب مرثیہ کہویں شاید
مر گیا غالبِ آشفتہ نوا کہتے ہیں

ہم پر جفا سے ترکِ وفا کا گماں نہیں
اک چھیڑ ہے وگرنہ مراد امتحاں نہیں

کس منہ سے شکر کیجیے اس لطفِ خاص کا
پرسش ہے اور پائے سخن درمیاں نہیں

ہم کو ستم عزیز ستمگر کو ہم عزیز
نا مہرباں نہیں ہے اگر مہرباں نہیں

بوسہ نہیں نہ دیجیے دشنام ہی سہی
آخر زباں تو رکھتے ہو تم گر دہاں نہیں

ہر چند جاں گدازیٔ قہر و عتاب ہے
ہر چند پشت گرمیٔ تاب و تواں نہیں

جاں مطربِ ترانۂ ہل من مزید ہے
لب پردہ سنجِ زمزمۂ الاماں نہیں!

خنجر سے چیر سینہ اگر دل نہ ہو دو نیم
دل میں چھری چبھو مژہ گر خونچکاں نہیں

ہے ننگِ سینہ دل اگر آتش کدہ نہ ہو
ہے عارِ دل نفس اگر آذر فشاں نہیں

نقصاں نہیں جنوں میں بلا سے ہو گھر خراب
سو گز زمیں کے بدلے بیاباں گراں نہیں

کہتے ہو "کیا لکھا ہے تری سرنوشت میں"
گویا جبیں پہ سجدۂ بت کا نشاں نہیں

پاتا ہوں اس سے داد کچھ اپنے سخن کی میں
روح القدس اگرچہ مرا ہمزباں نہیں

جاں ہے بہائے بوسہ ولے کیوں کہے ابھی
غالب کو جانتا ہے کہ وہ نیم جاں نہیں

ق ۱۸۴۷

ملتی ہے خوئے یار سے نار التہاب میں
کافر ہوں گر نہ ملتی ہو راحت عذاب میں

کب سے ہوں کیا بتاؤں جہانِ خراب میں ۔ شب ہائے ہجر کو بھی رکھوں گر حساب میں

تا پھر نہ انتظار میں نیند آئے عمر بھر ۔ آنے کا عہد کر گئے آئے جو خواب میں

قاصد کے آتے آتے خط اک اور لکھ رکھوں ۔ میں جانتا ہوں جو وہ لکھیں گے جواب میں

مجھ تک کب ان کی بزم میں آتا تھا دورِ جام؟ ۔ ساقی نے کچھ ملا نہ دیا ہو شراب میں

جو منکرِ وفا ہو فریب اس پہ کیا چلے ۔ کیوں بدگماں ہوں دوست سے دشمن کے باب میں

میں مضطرب ہوں وصل میں خوفِ رقیب سے ۔ ڈالا ہے تم کو وہم نے کس پیچ و تاب میں

میں اور حظِّ وصل؟ خدا ساز بات ہے ۔ جاں نذر دینی بھول گیا اضطراب میں

ہے تیوری چڑھی ہوئی اندر نقاب کے ۔ ہے اک شکن پڑی ہوئی طرفِ نقاب میں

لاکھوں لگاؤ ایک چرانا نگاہ کا ۔ لاکھوں بناؤ ایک بگڑنا عتاب میں

وہ نالہ دل میں خس کے برابر جگہ نہ پائے ۔ جس نالہ سے شگاف پڑے آفتاب میں

وہ سحر مدعا طلبی میں نہ کام آئے ۔ جس سحر سے سفینہ رواں ہو سراب میں

غالب چھٹی شراب پر اب بھی کبھی کبھی
پیتا ہوں روزِ ابر و شبِ ماہتاب میں ۱۲۴۸ ق ۔ آثار الصنادید

کل کے لئے کر آج نہ خست شراب میں ۔ یہ سوءِ ظن ہے ساقیِ کوثر کے باب میں

ہیں آج کیوں ذلیل؟ کہ کل تک نہ تھی پسند ۔ گستاخیِ فرشتہ ہماری جناب میں

جاں کیوں نکلنے لگتی ہے تن سے دمِ سماع؟ ۔ گر وہ صدا سمائی ہے چنگ و رباب میں

رو میں ہے رخشِ عمر۔ کہاں دیکھئے تھمے ۔ نے ہاتھ باگ پر ہے نہ پا ہے رکاب میں

اتنا ہی مجھکو اپنی حقیقت سے بُعد ہے ۔ جتنا کہ وہمِ غیر سے ہوں پیچ و تاب میں

اصلِ شہود و شاہد و مشہود ایک ہے ۔ حیراں ہوں پھر مشاہدہ ہے کس حساب میں

ہے مشتمل نمودِ صور پر وجودِ بحر ۔ یاں کیا دھرا ہے قطرہ و موج و حباب میں

شرم اک ادائے ناز ہے اپنے ہی سے سہی ۔ ہیں کتنے بے حجاب کہ ہیں یوں حجاب میں

آرائشِ جمال سے فارغ نہیں ہنوز
پیشِ نظر ہے آئنہ دائم نقاب میں

ہے غیب غیب جسکو سمجھتے ہیں ہم شہود
ہیں خواب میں ہنوز جو جاگے ہیں خواب میں

غالب ندیمِ دوست سے آتی ہے بوئے دوست
مشغولِ حق ہوں بندگیٔ بوتراب میں

حیراں ہوں دل کو روؤں کہ پیٹوں جگر کو میں
مقدور ہو تو ساتھ رکھوں نوحہ گر کو میں

چھوڑا نہ رشک نے کہ ترے گھر کا نام لوں
ہر اک سے پوچھتا ہوں کہ جاؤں کدھر کو میں

جانا پڑا رقیب کے در پر ہزار بار
اے کاش جانتا نہ ترے رہگذر کو میں

ہے کیا جو کس کے باندھیے میری بلا ڈرے
کیا جانتا نہیں ہوں تمہاری کمر کو میں

لو وہ بھی کہتے ہیں "کہ یہ بے ننگ و نام ہے"
یہ جانتا اگر، تو لٹاتا نہ گھر کو میں

چلتا ہوں تھوڑی دور ہر اک تیز رو کے ساتھ
پہچانتا نہیں ہوں ابھی راہبر کو میں

خواہش کو احمقوں نے پرستش دیا قرار
کیا پوجتا ہوں اس بتِ بیداد گر کو میں

پھر بے خودی میں بھول گیا راہِ کوئے یار
جاتا وگرنہ ایک دن اپنی خبر کو میں

اپنے پہ کر رہا ہوں قیاس اہلِ دہر کا
سمجھا ہوں دلپذیر متاعِ ہنر کو میں

غالب خدا کرے کہ سوارِ سمندِ ناز
دیکھوں علی بہادرِ عالی گہر کو میں

دونوں جہان دیکے وہ سمجھے یہ خوش رہا
یاں آ پڑی یہ شرم کہ تکرار کیا کریں

تھک تھک کے ہر مقام پہ دو چار رہ گئے
تیرا پتہ نہ پائیں تو ناچار کیا کریں

کیا شمع کے نہیں ہیں ہوا خواہ بزم میں
ہو غم ہی جانگداز تو غمخوار کیا کریں

نہیں کہ مجھکو قیامت کا اعتقاد نہیں
شبِ فراق سے روزِ جزا زیاد نہیں

کوئی کہے کہ شبِ مہ میں کیا برائی ہے؟
بلا سے آج اگر دن کو ابر و باد نہیں

جو آؤں سامنے ان کے تو مرحبا نہ کہیں
جو جاؤں واں سے کہیں کو تو خیر باد نہیں

کبھی جو یاد بھی آتا ہوں تو کہتے ہیں
"کہ آج بزم میں کچھ فتنہ و فساد نہیں"

علاوہ عید کے ملتی ہے اور دن بھی شراب
گدائے کوچۂ میخانہ نامراد نہیں

جہاں میں ہو غم و شادی بہم ہمیں کیا کام
دیا ہے ہم کو خدا نے وہ دل کہ شاد نہیں

تم ان کے وعدے کا ذکر اُنسے کیوں کرو غالب
یہ کیا کہ تم کہو اور وہ کہیں "کہ یاد نہیں"

دائم پڑا ہوا ترے در پر نہیں ہوں میں ؟
خاک ایسی زندگی پہ کہ پتھر نہیں ہوں میں

کیوں گردشِ مدام سے گھبرا نہ جائے دل
انسان ہوں پیالہ و ساغر نہیں ہوں میں

یارب! زمانہ مجھ کو مٹاتا ہے کس لئے ؟
لوحِ جہاں پہ حرفِ مکرر نہیں ہوں میں

حد چاہیئے سزا میں عقوبت کے واسطے
آخر گناہگار ہوں کافر نہیں ہوں میں

کس واسطے عزیز نہیں جانتے مجھے ؟
لال و زمرد و زر و گوہر نہیں ہوں میں

رکھتے ہو تم قدم مری آنکھوں سے کیوں دریغ ؟
رتبے میں ماہ و مہر سے کمتر نہیں ہوں میں

کرتے ہو مجھکو منعِ قدمبوس کس لئے
کیا آسمان کے بھی برابر نہیں ہوں میں

غالب وظیفہ خوار ہو دو شاہ کو دعا
دو دن گئے کہ کہتے تھے "نوکر نہیں ہوں میں"

سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہو گئیں
خاک میں کیا صورتیں ہونگی کہ پنہاں ہو گئیں

یاد تھیں ہمکو بھی رنگا رنگ بزم آرائیاں
لیکن اب نقش و نگارِ طاقِ نسیاں ہو گئیں

تھیں بنات النعش گردوں دنکو پردے میں نہاں
شب کو ان کے جی میں کیا آئی کہ عریاں ہو گئیں

قید میں یعقوب نے لی گو نہ یوسف کی خبر
لیکن آنکھیں روزنِ دیوارِ زنداں ہو گئیں

سب رقیبوں سے ہوں ناخوش پر زنانِ مصر سے
ہے زلیخا خوش کہ محوِ ماہِ کنعاں ہو گئیں

جوئے خوں آنکھوں سے بہنے دو کہ ہے شامِ فراق
میں یہ سمجھوں گا کہ شمعیں دو فروزاں ہو گئیں

ان پری زادوں سے لیں گے خلد میں ہم انتقام
قدرتِ حق سے یہی حوریں اگر واں ہو گئیں

نیند اسکی ہے، دماغ اس کا ہے، راتیں اسکی ہیں
تیری زلفیں جس کے بازو پر پریشاں ہو گئیں

میں چمن میں کیا گیا گویا دبستاں کھل گیا
بلبلیں سنکر مرے نالے غزلخواں ہو گئیں

وہ نگاہیں کیوں ہوئی جاتی ہیں یارب دل کے پار
جو مری کوتاہیِ قسمت سے مژگاں ہو گئیں

بسکہ روکا میں نے اور سینے میں اُبھریں پے بہ پے
میری آہیں بخیۂ چاکِ گریباں ہو گئیں

واں گیا بھی میں تو انکی گالیوں کا کیا جواب ؟
یاد تھیں جتنی دعائیں صرفِ درباں ہو گئیں

جانفزا ہے بادہ، جسکے ہاتھ میں جام آ گیا
سب لکیریں ہاتھ کی گویا رگِ جاں ہو گئیں

ہم موحد ہیں ہمارا کیش ہے ترکِ رسوم

ملتیں جب مٹ گئیں اجزائے ایماں ہو گئیں

رنج سے خوگر ہوا انساں تو مٹ جاتا ہے رنج
مشکلیں اتنی پڑیں مجھ پر کہ آساں ہو گئیں

یوں ہی گر روتا رہا غالب تو اے اہلِ جہاں
دیکھنا ان بستیوں کو تم کہ ویراں ہو گئیں

دل ہی تو ہے نہ سنگ و خشت، درد سے بھر نہ آئے کیوں
روئیں گے ہم ہزار بار کوئی ہمیں ستائے کیوں؟

دیر نہیں، حرم نہیں، در نہیں، آستاں نہیں
بیٹھے ہیں رہگزر پہ ہم، کوئی ہمیں اٹھائے کیوں؟

جب وہ جمالِ دلفروز، صورتِ مہرِ نیمروز
آپ ہی ہو نظارہ سوز پردے میں منہ چھپائے کیوں؟

دشنۂ غمزہ جاں ستاں، ناوکِ ناز بے پناہ
تیرا ہی عکسِ رخ سہی، سامنے تیرے آئے کیوں؟

قیدِ حیات و بندِ غم اصل میں دونوں ایک ہیں
موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں؟

حسن اور اس پہ حسنِ ظن رہ گئی بوالہوس کی شرم
اپنے پہ اعتماد ہے غیر کو آزمائے کیوں؟

واں وہ غرورِ عزّ و ناز، یاں یہ حجابِ پاسِ وضع
راہ میں ہم ملیں کہاں؟ بزم میں وہ بلائے کیوں؟

ہاں وہ نہیں خدا پرست، جاؤ وہ بے وفا سہی
جس کو ہو دین و دل عزیز، اسکی گلی میں جائے کیوں؟

غالبِ خستہ کے بغیر کون سے کام بند ہیں؟
روئیے زار زار کیا، کیجیے ہائے ہائے کیوں؟

کعبے میں جا رہا تو نہ دو طعنہ کیا کہیں
بھولا ہوں حقِ صحبتِ اہلِ کنشت کو
طاعت میں تا رہے نہ مے و انگبیں کی لاگ
دوزخ میں ڈال دو کوئی لے کر بہشت کو
ہوں منحرف نہ کیوں رہ و رسمِ ثواب سے
ٹیڑھا لگا ہے قط قلمِ سرنوشت کو
آئی اگر بلا تو جگر سے ٹلے نہیں
ایرا ہی دیکے ہم نے بچایا ہے کشت کو
غالب کچھ اپنی سعی سے کہنا نہیں مجھے
خرمن جلے اگر نہ ملخ کھائے کشت کو

گئی وہ بات کہ ہو گفتگو تو کیونکر ہو
کہے سے کچھ نہ ہوا پھر کہو تو کیونکر ہو
ہمارے ذہن میں اس فکر کا ہے نام وصال
کہ گر نہ ہو تو کہاں جائیں ہو تو کیونکر ہو
ادب ہے اور یہی کشمکش تو کیا کیجے
حیا ہے اور یہی گومگو تو کیونکر ہو
تمہیں کہو کہ گزارا صنم پرستوں کا
بتوں کی ہو اگر ایسی ہی خو تو کیونکر ہو
الجھتے ہو تم اگر دیکھتے ہو آئینہ
جو تم سے شہر میں ہوں ایک دو تو کیونکر ہو
جسے نصیب ہو روزِ سیاہ میرا سا
وہ شخص دن نہ کہے رات کو تو کیونکر ہو
ہمیں پھر ان سے امید اور انہیں ہماری قدر
ہماری بات ہی پوچھیں نہ وہ تو کیونکر ہو
غلط نہ تھا ہمیں خط پر گماں تسلی کا
نہ مانے دیدۂ دیدار جو تو کیونکر ہو
بتاؤ اس مژہ کو دیکھ کر ہو مجھ کو قرار
یہ نیش ہو رگِ جاں میں فرو تو کیونکر ہو
مجھے جنوں نہیں غالب ولے بقولِ حضور
فراقِ یار میں تسکین ہو تو کیونکر ہو

قفس میں ہوں اگر اچھا بھی نہ جانیں مری شیون کو
مرا ہونا برا کیا ہے نواسنجانِ گلشن کو
نہیں گر ہمدمی آساں نہ ہو یہ رشک کیا کم ہے
نہ دی ہوتی خدایا آرزوئے دوست دشمن کو

نہ نکلا آنکھ سے تیری اک آنسو اس جراحت پر — کیا سینے میں جس نے خونچکاں مژگانِ سوزن کو
خدا شرمائے ہاتھوں کو کہ رکھتے ہیں کشاکش میں — کبھی میرے گریباں کو کبھی جاناں کے دامن کو
ابھی ہم قتل گہ کا دیکھنا آساں سمجھتے ہیں — نہیں دیکھا شناور جوئے خوں میں تیرے توسن کو
ہوا چرچا جو میرے پاؤں کی زنجیر بننے کا — کیا بے تاب کاں میں جنبشِ جوہر نے آہن کو
خوشی کیا کھیت پر میرے اگر سو بار ابر آوے — سمجھتا ہوں کہ ڈھونڈے ہے ابھی سے برق خرمن کو
وفاداری بشرطِ استواری اصلِ ایماں ہے — مرے بت خانے میں تو کعبے میں گاڑو برہمن کو
شہادت تھی مری قسمت میں جو دی تھی یہ خو مجھ کو — جہاں تلوار کو دیکھا جھکا دیتا تھا گردن کو
نہ لٹتا دن کو تو کب رات کو یوں بے خبر سوتا — رہا کھٹکا نہ چوری کا دعا دیتا ہوں رہزن کو
سخن کیا کہہ نہیں سکتے کہ جویاں ہوں جواہر کے — جگر کیا ہم نہیں رکھتے کہ کھودیں جا کے معدن کو

مرے شاہِ سلیماں جاہ سے نسبت نہیں غالب
فریدون و جم و کیخسرو و داراب و بہمن کو

تم جانو تم کو غیر سے جو رسم و راہ ہو — مجھ کو بھی پوچھتے رہو تو کیا گناہ ہو
بچتے نہیں مواخذۂ روزِ حشر سے — قاتل اگر رقیب ہے تو تم گواہ ہو
کیا وہ بھی بے گناہ کش و ناحق شناس ہیں؟ — مانا کہ تم بشر نہیں خورشید و ماہ ہو
ابھرا ہوا نقاب میں ہے اُنکے ایک تار — مرتا ہوں میں کہ یہ نہ کسی کی نگاہ ہو
جب میکدہ چھٹا تو پھر اب کیا جگہ کی قید — مسجد ہو مدرسہ ہو کوئی خانقاہ ہو
سنتے ہیں جو بہشت کی تعریف سب درست — لیکن خدا کرے وہ تری جلوہ گاہ ہو

غالب بھی گر نہ ہو تو کچھ ایسا ضرر نہیں
دنیا ہو یارب اور مرا بادشاہ ہو

کسی کو دے کے دل کوئی نوا سنجِ فغاں کیوں ہو
نہ ہو جب دل ہی سینے میں تو پھر منہ میں زباں کیوں ہو

وہ اپنی خو نہ چھوڑینگے ہم اپنی وضع کیوں چھوڑیں
سبک سر بنکے کیا پوچھیں کہ ہم سے سرگراں کیوں ہو

کیا غمخوار نے رسوا لگے آگ اس محبت کو
نہ لادے تاب جو غم کی وہ میرا رازداں کیوں ہو

وفا کیسی کہاں کا عشق جب سر پھوڑنا ٹھہرا
تو پھر اے سنگدل تیرا ہی سنگِ آستاں کیوں ہو

قفس میں مجھ سے رودادِ چمن کہتے نہ ڈر ہمدم
گری ہے جس پہ کل بجلی وہ میرا آشیاں کیوں ہو

یہ کہہ سکتے ہو "ہم دل میں نہیں ہیں" پر یہ بتلاؤ
کہ جب دل میں تمہیں تم ہو تو آنکھوں سے نہاں کیوں ہو

غلط ہے جذبِ دل کا شکوہ دیکھو جرم کس کا ہے
نہ کھینچو گر تم اپنے کو کشاکش درمیاں کیوں ہو

یہ فتنہ آدمی کی خانہ ویرانی کو کیا کم ہے ؟
ہوئے تم دوست جسکے دشمن اس کا آسماں کیوں ہو

یہی ہے آزمانا تو ستانا کس کو کہتے ہیں ؟
عدو کے ہو لئے جب تم تو میرا امتحاں کیوں ہو

کہا تم نے کہ "کیوں ہو غیر کے ملنے میں رسوائی"
بجا کہتے ہو سچ کہتے ہو پھر کہیو کہ ہاں کیوں ہو

نکالا چاہتا ہے کام کیا طعنوں سے تو غالب
ترے بے مہر کہنے سے وہ تجھ پر مہرباں کیوں ہو

اس بزم میں مجھے نہیں بنتی حیا کئے
بیٹھا رہا اگرچہ اشارے ہوا کئے

دل ہی تو ہے سیاستِ درباں سے ڈر گیا
مَیں اور جاؤں در سے ترے بِن صدا کئے

رکھتا پھروں ہوں خرقہ و سجادہ رہنِ مے
مدت ہوئی ہے دعوتِ آب و ہوا کئے

بے صرفہ ہی گزرتی ہے ہو گرچہ عمرِ خضر
حضرت بھی کل کہیں گے "کہ ہم کیا کیا کئے"

مقدور ہو تو خاک سے پوچھوں کہ "اے لئیم
تو نے وہ گنج ہائے گرانمایہ کیا کئے"

کس روز تہمتیں نہ تراشا کئے عدو؟
کس دن ہمارے سر پہ نہ آرے چلا کئے

صحبت میں غیر کی نہ پڑی ہو کہیں یہ خو
دینے لگا ہے بوسہ بغیر التجا کئے

ضد کی ہے اور بات مگر خو بری نہیں
بھولے سے اس نے سیکڑوں وعدے وفا کئے

غالب تمہیں کہو کہ ملے گا جواب کیا
مانا کہ تم کہا کئے اور وہ سنا کئے

دل آپ کا کہ دل میں ہے جو کچھ سب آپ کا
دل لیجئے مگر مرے ارماں نکال کے

تسکیں کو ہم نہ روئیں جو ذوقِ نظر ملے
حورانِ خلد میں تری صورت اگر ملے

اپنی گلی میں مجھ کو نہ کر دفن بعدِ قتل
میرے پتے سے خلق کو کیوں تیرا گھر ملے

ساقی گری کی شرم کرو آج ورنہ ہم
ہر شب پیا ہی کرتے ہیں مے جس قدر ملے

تجھ سے تو کچھ کلام نہیں لیکن اے ندیم
میرا سلام کہیو اگر نامہ بر ملے

تم کو بھی ہم دکھائیں کہ مجنوں نے کیا کیا
فرصت کشاکشِ غمِ پنہاں سے گر ملے

لازم نہیں کہ خضر کی ہم پیروی کریں
مانا کہ اک بزرگ ہمیں ہم سفر ملے

اے ساکنانِ کوچۂ دلدار دیکھنا!
تم کو کہیں جو غالبِ آشفتہ سر ملے

کوئی دن گر زندگانی اور ہے
اپنے جی میں ہم نے ٹھانی اور ہے

آتشِ دوزخ میں یہ گرمی کہاں؟
سوزِ غم ہائے نہانی اور ہے

بارہا دیکھی ہیں اُن کی رنجشیں
پر کچھ اب کے سرگرانی اور ہے

دے کے خط منہ دیکھتا ہے نامہ بر
کچھ تو پیغامِ زبانی اور ہے

قاطعِ اعمار ہیں اکثر نجوم
وہ بلائے آسمانی اور ہے

ہو چکیں غالب بلائیں سب تمام
ایک مرگِ ناگہانی اور ہے

کوئی امید بر نہیں آتی
کوئی صورت نظر نہیں آتی

موت کا ایک دن معین ہے
نیند کیوں رات بھر نہیں آتی

آگے آتی تھی حالِ دل پہ ہنسی
اب کسی بات پر نہیں آتی

جانتا ہوں ثوابِ طاعت و زہد
پر طبیعت ادھر نہیں آتی

ہے کچھ ایسی ہی بات جو چپ ہوں
ورنہ کیا بات کر نہیں آتی

کیوں نہ چیخوں؟ کہ یاد کرتے ہیں
میری آواز گر نہیں آتی

داغِ دل گر نظر نہیں آتا
بُو بھی اے چارہ گر نہیں آتی

ہم وہاں ہیں جہاں سے ہم کو بھی
کچھ ہماری خبر نہیں آتی

مرتے ہیں آرزو میں مرنے کی
موت آتی ہے پر نہیں آتی

کعبے کس منہ سے جاؤ گے غالب
شرم تم کو مگر نہیں آتی

دلِ ناداں تجھے ہوئے کیا ہے؟
آخر اس درد کی دوا کیا ہے؟

ہم ہیں مشتاق اور وہ بیزار!
یا الٰہی یہ ماجرا کیا ہے!

میں بھی منہ میں زبان رکھتا ہوں
کاش پوچھو کہ "مدعا کیا ہے"؟

جبکہ تجھ بن نہیں کوئی موجود
پھر یہ ہنگامہ اے خدا کیا ہے؟

یہ پری چہرہ لوگ کیسے ہیں؟
غمزہ و عشوہ و ادا کیا ہے؟

شکنِ زلفِ عنبریں کیوں ہے؟
نگہِ چشمِ سرمہ سا کیا ہے؟

سبزہ و گل کہاں سے آئے ہیں؟
ابر کیا چیز ہے؟ ہوا کیا ہے؟

ہم کو اُن سے وفا کی ہے اُمید
جو نہیں جانتے وفا کیا ہے؟

"ہاں بھلا کر، ترا بھلا ہوگا"
اور درویش کی صدا کیا ہے؟

جان تم پر نثار کرتا ہوں
میں نہیں جانتا دعا کیا ہے؟

میں نے مانا کہ کچھ نہیں غالبؔ
مفت ہاتھ آئے تو بُرا کیا ہے؟

کہتے تو ہو تم سب کہ بتِ غالیہ مُو آئے
اِک مرتبہ گھبرا کے کہو کوئی کہ "وہ آئے"

ہوں کشمکشِ نزع میں ہاں جذبِ محبت
کچھ کہہ نہ سکوں، پر وہ مرے پوچھنے کو آئے

ہے صاعقہ و شعلہ و سیماب کا عالم
آنا ہی سمجھ میں مری آتا نہیں گو آئے

ظاہر ہے کہ گھبرا کے نہ بھاگیں گے نکیرین
ہاں، منہ سے مگر بادۂ دوشینہ کی بُو آئے

جلاد سے ڈرتے ہیں نہ واعظ سے جھگڑتے
ہم سمجھے ہوئے ہیں اُسے جس بھیس میں جو آئے

ہاں اہلِ طلب! کون سنے طعنۂ نایافت
دیکھا کہ وہ ملتا نہیں اپنے ہی کو کھو آئے

اپنا نہیں وہ شیوہ کہ آرام سے بیٹھیں
اس در پہ نہیں بار تو کعبے ہی کو ہو آئے

کی ہم نفسوں نے اثرِ گریہ میں تقریر
اچھے رہے آپ اس سے مگر مجھکو ڈبو آئے

اس انجمنِ ناز کی کیا بات ہے غالبؔ
ہم بھی گئے واں اور تری تقدیر کو رو آئے

شکوے کے نام سے بے مہر خفا ہوتا ہے
یہ بھی مت کہہ کہ جو کہیے تو گلا ہوتا ہے

پُر ہوں میں شکوے سے یوں راگ سے جیسے باجا
اِک ذرا چھیڑیئے پھر دیکھیے کیا ہوتا ہے

گو سمجھتا نہیں پر حسنِ "تلافی" دیکھو
شکوۂ جور سے سرگرم جفا ہوتا ہے

عشق کی راہ میں ہے چرخِ مکوکب کی وہ چال
سُست رو جیسے کوئی آبلہ پا ہوتا ہے

کیوں نہ ٹھہریں ہدفِ ناوکِ بیداد کہ ہم
آپ اُٹھا لاتے ہیں گر تیر خطا ہوتا ہے

خوب تھا پہلے سے ہوتے جو ہم اپنے بدخواہ
کہ بھلا چاہتے ہیں اور بُرا ہوتا ہے

نالہ جاتا تھا پرے عرش سے میرا اور اب
لب تک آتا ہے جو ایسا ہی رسا ہوتا ہے

خامہ میرا کہ وہ ہے باربدِ بزمِ سخن
شاہ کی مدح میں یوں نغمہ سرا ہوتا ہے

اَے شہنشاہِ کواکب سپہ و مہرِ علم
ق تیرے اکرام کا حق کس سے ادا ہوتا ہے

سات اقلیم کا حاصل جو فراہم کیجے
تو وہ لشکر کا ترے نعلِ بہا ہوتا ہے

ہر مہینے میں جو یہ بدر سے ہوتا ہے ہلال
آستاں پر ترے مہ ناصیہ سا ہوتا ہے

میں جو گستاخ ہوں آئینِ غزلخوانی میں
یہ بھی تیرا ہی کرم ذوق فضا ہوتا ہے

رکھیو غالب مجھے اس تلخ نوائی میں معاف
آج کچھ درد مرے دل میں سوا ہوتا ہے

ہر ایک بات پہ کہتے ہو تم کہ "تو کیا ہے"
تمہیں کہو کہ یہ اندازِ گفتگو کیا ہے

نہ شعلے میں یہ کرشمہ نہ برق میں یہ ادا
کوئی بتاؤ کہ وہ شوخِ تندخو کیا ہے

یہ رشک ہے کہ وہ ہوتا ہے ہم سخن تم سے
وگرنہ خوفِ بدآموزیٔ عدو کیا ہے

چپک رہا ہے لہو سے بدن پہ پیراہن
ہماری جیب کو اب حاجتِ رفو کیا ہے

جلا ہے جسم جہاں دل بھی جل گیا ہوگا
کریدتے ہو جو اب راکھ جستجو کیا ہے

رگوں میں دوڑتے پھرنے کے ہم نہیں قائل
جب آنکھ ہی سے نہ ٹپکا تو پھر لہو کیا ہے

وہ چیز جس کے لئے ہم کو ہو بہشت عزیز
سوائے بادۂ گلفامِ مشکبو کیا ہے

پیوں شراب اگر خم بھی دیکھ لوں دو چار
یہ شیشہ و قدح و کوزہ و سبو کیا ہے

رہی نہ طاقتِ گفتار اور اگر ہو بھی
تو کس امید پہ کہیے کہ آرزو کیا ہے

ہوا ہے شہ کا مصاحب پھرے ہے اتراتا
وگرنہ شہر میں غالب کی آبرو کیا ہے

میں انہیں چھیڑوں اور وہ کچھ نہ کہیں ۔۔۔ چل نکلتے جو مے پیئے ہوتے
قہر ہو یا بلا ہو، جو کچھ ہو ۔۔۔ کاش کے تم مرے لئے ہوتے
میری قسمت میں غم گر اتنا تھا ۔۔۔ دل بھی یارب کئی دیئے ہوتے
آ ہی جاتا وہ راہ پر غالب
کوئی دن اور بھی جیئے ہوتے

حسنِ مہ گرچہ بہ ہنگامِ کمال اچھا ہے ۔۔۔ اس سے میرا مہِ خورشید جمال اچھا ہے
بوسہ دیتے نہیں اور دل پہ ہے ہر لحظہ نگاہ ۔۔۔ جی میں کہتے ہیں کہ مفت آئے تو مال اچھا ہے
اور بازار سے لے آئے اگر ٹوٹ گیا ۔۔۔ ساغرِ جم سے مرا جامِ سفال اچھا ہے
بے طلب دیں تو مزا اس میں سوا ملتا ہے ۔۔۔ وہ گدا جس کو نہ ہو خوئے سوال اچھا ہے
اُن کے دیکھے سے جو آجاتی ہے منہ پر رونق ۔۔۔ وہ سمجھتے ہیں کہ بیمار کا حال اچھا ہے
دیکھیے پاتے ہیں عشاق بتوں سے کیا فیض ۔۔۔ اِک برہمن نے کہا ہے کہ یہ سال اچھا ہے
ہم سخن تیشے نے فرہاد کو شیریں سے کیا ۔۔۔ جسطرح کا کسی میں ہو کمال اچھا ہے
قطرہ دریا میں جو ملجائے تو دریا ہو جائے ۔۔۔ کام اچھا ہے وہ جس کا کہ مآل اچھا ہے
خضرِ سلطاں کو رکھے خالقِ اکبر سرسبز ۔۔۔ شاہ کے باغ میں یہ تازہ نہال اچھا ہے
ہم کو معلوم ہے جنت کی حقیقت لیکن
دل کے خوش رکھنے کو غالب یہ خیال اچھا ہے

غیر لیں محفل میں بوسے جام کے ۔۔۔ ہم رہیں یوں تشنہ لب پیغام کے
خستگی کا تم سے کیا شکوہ کہ یہ ۔۔۔ ہتھکنڈے ہیں چرخِ نیلی فام کے
خط لکھیں گے گرچہ مطلب کچھ نہ ہو ۔۔۔ ہم تو عاشق ہیں تمہارے نام کے
رات پی زمزم پہ مے اور صبحدم ۔۔۔ دھوئے دھبے جامۂ احرام کے
دل کو آنکھوں نے پھنسایا کیا مگر ۔۔۔ یہ بھی حلقے ہیں تمہارے دام کے

شاہ کے ہے غسلِ صحت کی خبر — دیکھیے کب دن پھریں حمام کے

عشق نے غالبؔ نکما کر دیا
ورنہ ہم بھی آدمی تھے کام کے

پھر اس انداز سے بہار آئی — کہ ہوئے مہر و مہ تماشائی
دیکھو اے ساکنانِ خطۂ پاک — اسکو کہتے ہیں عالم آرائی
کہ زمیں ہو گئی ہے سر تا سر — رُوکشِ سطحِ چرخِ مینائی
سبزے کو جب کہیں جگہ نہ ملی — بن گیا روئے آب پر کائی
سبزہ و گل کے دیکھنے کیلئے — چشمِ نرگس کو دی ہے بینائی
ہے ہوا میں شراب کی تاثیر — بادہ نوشی ہے باد پیمائی

کیوں نہ دنیا کو ہو خوشی غالبؔ
شاہِ دیندار نے شفا پائی

دیا ہے دل اگر اس کو بشر ہے کیا کہیے — ہوا رقیب تو ہو نامہ بر ہے کیا کہیے
یہ ضد کہ آج نہ آوے اور آئے بن نہ رہے — قضا سے شکوہ ہمیں کسقدر ہے کیا کہیے
رہے ہے یوں گہہ و بے گہہ کہ کوئے دوست کو اب — اگر نہ کہیے کہ دشمن کا گھر ہے کیا کہیے
زہے کرشمہ کہ یوں دے رکھا ہے ہمکو فریب — کہ بن کہے ہی انہیں سب خبر ہے کیا کہیے
سمجھ کے کرتے ہیں بازار میں وہ پرسشِ حال — کہ یہ کہے کہ سرِ رہگذر ہے کیا کہیے
تمہیں نہیں ہے سرِ رشتۂ وفا کا خیال — ہمارے ہاتھ میں کچھ ہے مگر ہے کیا؟ کہیے
انہیں سوال پہ زعمِ جنوں ہے کیوں لڑیے — ہمیں جواب سے قطعِ نظر ہے کیا کہیے
حسد سزائے کمالِ سخن ہے کیا کیجے — ستم بہائے متاعِ ہنر ہے کیا کہیے

کہا ہے کس نے کہ غالبؔ برا نہیں لیکن
سوائے اسکے کہ آشفتہ سر ہے کیا کہیے

حضورِ شاہ میں اہلِ سخن کی آزمائش ہے
چمن میں خوش نوایانِ چمن کی آزمائش ہے

قد و گیسو میں قیس و کوہکن کی آزمائش ہے
جہاں ہم ہیں وہاں دار و رسن کی آزمائش ہے

کریں گے کوہکن کے حوصلے کا امتحاں آخر
ہنوز اس خستہ کے نیروئے تن کی آزمائش ہے

نسیمِ مصر کو کیا پیرِ کنعاں کی ہوا خواہی
اُسے یوسف کی بوئے پیرہن کی آزمائش ہے

وہ آیا بزم میں دیکھو! نہ کہیو پھر کہ غافل تھے
شکیبِ صبرِ اہلِ انجمن کی آزمائش ہے

رہے دل ہی میں تیر اچھا جگر کے پار ہو بہتر
غرض شستِ بتِ ناوک فگن کی آزمائش ہے

نہیں کچھ سبحہ و زنار کے پھندے میں گیرائی
وفاداری میں شیخ و برہمن کی آزمائش ہے

پڑا رہ اے دلِ وابستہ بیتابی سے کیا حاصل
مگر پھر تابِ زلفِ پُرشکن کی آزمائش ہے

وہ آئیں گے مرے گھر وعدہ کیسا دیکھنا غالب
نئے فتنوں میں اب چرخِ کہن کی آزمائش ہے

نکتہ چیں ہے غمِ دل اس کو سُنائے نہ بنے
کیا بنے بات جہاں بات بنائے نہ بنے

مَیں بلاتا تو ہوں اس کو مگر اے جذبۂ دل!
اُس پہ بن جائے کچھ ایسی کہ بن آئے نہ بنے

کھیل سمجھا ہے کہیں چھوڑ نہ دے بھول نہ جائے
کاش یوں بھی ہو کہ بن میرے ستائے نہ بنے

غیر پھرتا ہے لیے یوں ترے خط کو کہ اگر
کوئی پوچھے کہ "یہ کیا ہے"؟ تو چھپائے نہ بنے

اس نزاکت کا بُرا ہو وہ بھلے ہیں تو کیا!
ہاتھ آئیں تو انہیں ہاتھ لگائے نہ بنے

کہہ سکے کون؟ کہ یہ جلوہ گری کس کی ہے
پردہ چھوڑا ہے وہ اس نے کہ اٹھائے نہ بنے

موت کی راہ نہ دیکھوں؟ کہ بن آئے نہ رہے
تم کو چاہوں! کہ نہ آؤ تو بلائے نہ بنے

بوجھ وہ سر سے گرا ہے کہ اٹھائے نہ اُٹھے
کام وہ آن پڑا ہے کہ بنائے نہ بنے

عشق پر زور نہیں ہے یہ وہ آتش غالب
کہ لگائے نہ لگے اور بجھائے نہ بنے

بازیچۂ اطفال ہے دنیا مرے آگے
ہوتا ہے شب و روز تماشا مرے آگے

اک کھیل ہے اورنگِ سلیماں مرے نزدیک
اک بات ہے اعجازِ مسیحا مرے آگے

جز نام نہیں صورتِ عالم مجھے منظور
جز وہم نہیں ہستیِ اشیا مرے آگے

ہوتا ہے نہاں گرد میں صحرا مرے ہوتے
گھستا ہے جبیں خاک پہ دریا مرے آگے

مت پوچھ کہ کیا ہے میرا ترے پیچھے
تو دیکھ کہ کیا رنگ ہے تیرا مرے آگے

سچ کہتے ہو خود بین و خود آرا ہوں نہ کیوں ہوں؟
بیٹھا ہے بتِ آئینہ سیما مرے آگے

پھر دیکھیے اندازِ گل افشانیِ گفتار
رکھ دے کوئی پیمانۂ صہبا مرے آگے

نفرت کو گماں گزرے ہے میں رشک سے گزرا
کیونکر کہوں "لو نام نہ ان کا مرے آگے"

ایماں مجھے روکے ہے جو کھینچے ہے مجھے کفر
کعبہ مرے پیچھے ہے کلیسا مرے آگے

عاشق ہوں پہ معشوق فریبی ہے مرا کام
مجنوں کو برا کہتی ہے لیلیٰ مرے آگے

خوش ہوتے ہیں پر وصل میں یوں مر نہیں جاتے
آئی شبِ ہجراں کی تمنا مرے آگے

ہے موجزن اک قلزمِ خوں کاش یہی ہو
آتا ہے ابھی دیکھیے کیا کیا مرے آگے

گو ہاتھ کو جنبش نہیں آنکھوں میں تو دم ہے
رہنے دو ابھی ساغر و مینا مرے آگے

ہم پیشہ و ہم مشرب و ہم راز ہے میرا
غالب کو برا کیوں کہو اچھا مرے آگے

کہوں جو حال تو کہتے ہو "مدعا کہیے"
تمہیں کہو کہ جو تم یوں کہو تو کیا کہیے

نہ کہیو طعن سے پھر تم کہ "ہم ستمگر ہیں"
مجھے تو خو ہے کہ جو کچھ کہو "بجا" کہیے

وہ نیشتر سہی پر دل میں جب اتر جاوے
نگاہِ ناز کو پھر کیوں نہ آشنا کہیے

نہیں ذریعۂ راحت جراحتِ پیکاں
وہ زخمِ تیغ ہے جس کو کہ دلکشا کہیے

جو مدعی بنے اس کے نہ مدعی بنیے
جو نا سزا کہے اس کو نہ نا سزا کہیے

کہیں حقیقتِ جاں کاہیِ مرض لکھیے
کہیں مصیبتِ ناسازیِ دوا کہیے

کبھی شکایتِ رنجِ گراں نشیں کیجے
کہیں حکایتِ صبرِ گریز پا کہیے

رہے نہ جان تو قاتل کو خوں بہا دیجے — کٹے زبان تو خنجر کو مرحبا کہیے
نہیں نگار کو الفت نہ ہو نگار تو ہے — روانیٔ روشِ و مستیٔ ادا کہیے
نہیں بہار کو فرصت نہ ہو بہار تو ہے — طراوتِ چمن و خوبیٔ ہوا کہیے

سفینہ جب کہ کنارے پہ آ لگا غالب
خدا سے کیا ستم و جورِ ناخدا کہیے

ابن مریم ہوا کرے کوئی — میرے دکھ کی دوا کرے کوئی
شرع و آئین پر مدار سہی — ایسے قاتل کا کیا کرے کوئی
چال جیسے کڑی کمان کا تیر — دل میں ایسے کے جا کرے کوئی
بات پر واں زبان کٹتی ہے — وہ کہیں اور سنا کرے کوئی
بک رہا ہوں جنوں میں کیا کیا کچھ — کچھ نہ سمجھے خدا کرے کوئی
نہ سنو اگر برا کہے کوئی — نہ کہو گر برا کرے کوئی
روک لو گر غلط چلے کوئی — بخش دو گر خطا کرے کوئی
کون ہے جو نہیں ہے حاجتمند — کس کی حاجت روا کرے کوئی
کیا کیا خضر نے سکندر سے — اب کسے رہنما کرے کوئی

جب توقع ہی اٹھ گئی غالب
کیوں کسی کا گلہ کرے کوئی

بہت سہی غمِ گیتی شراب کم کیا ہے — غلام ساقیٔ کوثر ہوں مجھ کو غم کیا ہے
تمہاری طرز روش جانتے ہیں ہم کیا ہے — رقیب پر ہے اگر لطف تو ستم کیا ہے
کٹے تو شب کہیں کاٹے تو سانپ کہلائے — کوئی بتاؤ کہ وہ زلفِ خم بہ خم کیا ہے

۵ مطبوعہ دیوانوں میں اس غزل کے فقط تین اشعار ہیں۔ باقی اشعار مرزا نے ۱۸۶۵ء میں اضافہ کیے۔ (اردوئے معلےٰ صفحہ ۲۹۶)

لکھا کرے کوئی احکام طالع مولود / کسے خبر ہے کہ واں جنبش قلم کیا ہے

نہ حشر و نشر کا قائل نہ کیش و ملت کا / خدا کے واسطے ایسے کی پھر قسم کیا ہے

وہ داد و دید گراں مایہ شرط ہے ہمدم / وگرنہ مہر سلیمان و جام جم کیا ہے

سخن میں خامۂ غالب کی آتش افشانی
یقیں ہے ہم کو بھی لیکن اب اس میں دم کیا ہے

روندی ہوئی ہے کوکبہ شہریار کی / اترائے کیوں نہ خاک سر رہگذار کی

جب اسکے دیکھنے کے لئے آئیں بادشاہ / لوگوں میں کیوں نمود نہ ہو لالہ زار کی

بھوکے نہیں ہیں سیر گلستاں کے ہم ولے
کیونکر نہ کھائیے کہ ہوا ہے بہار کی

ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے / بہت نکلے مرے ارمان پھر بھی کم نکلے

ڈرے کیوں میرا قاتل کیا رہیگا اسکی گردن پر / وہ خوں جو چشم تر سے عمر بھر یوں دمبدم نکلے

نکلنا خلد سے آدم کا سنتے آئے ہیں لیکن / بہت بے آبرو ہو کر ترے کوچے سے ہم نکلے

بھرم کھل جائے ظالم تیرے قامت کی درازی کا / اگر اس طرۂ پر پیچ و خم کا پیچ و خم نکلے

مگر لکھوائے کوئی اس کو خط تو ہم سے لکھوائے / ہوئی صبح اور گھر سے کان پر رکھکر قلم نکلے

ہوئی اس دور میں منسوب مجھ سے بادہ آشامی / پھر آیا وہ زمانہ جو جہاں میں جام جم نکلے

ہوئی جن سے توقع خستگی کی داد پانے کی / وہ ہم سے بھی زیادہ خستۂ تیغ ستم نکلے

محبت میں نہیں ہے فرق جینے اور مرنے کا / اسی کو دیکھکر جیتے ہیں جس کافر پہ دم نکلے

کہاں میخانہ کا دروازہ غالب اور کہاں واعظ
پر اتنا جانتے ہیں کل وہ جاتا تھا کہ ہم نکلے

منظور تھی یہ شکل تجلی کو نور کی / قسمت کھلی ترے قد و رخ سے ظہور کی

اک خونچکاں کفن میں کروڑوں بناؤ ہیں / پڑتی ہے آنکھ تیرے شہیدوں پہ حور کی

واعظ نہ تم پیو نہ کسی کو پلا سکو — کیا بات ہے تمہاری شرابِ طہور کی

لڑتا ہے مجھ سے حشر میں قاتل، کہ کیوں اٹھا — گویا ابھی سُنی نہیں آواز صور کی

آمد بہار کی ہے جو بلبل ہے نغمہ سنج — اُڑتی سی اک خبر ہے زبانی طیور کی

گو واں نہیں پہ واں کے نکالے ہوئے تو ہیں — کعبے سے ان بتوں کو بھی نسبت ہے دُور کی

کیا فرض ہے کہ سب کو ملے ایک سا جواب — آؤ نہ ہم بھی سیر کریں کوہ طور کی

گرمی سہی کلام میں لیکن نہ اس قدر — کی جس سے بات اس نے شکایت ضرور کی

غالب گر اس سفر میں مجھے ساتھ لے چلیں
حج کا ثواب نذر کروں گا حضور کی

غم کھانے میں بودا دلِ ناکام بہت ہے — یہ رنج کہ کم ہے مئے گلفام بہت ہے

کہتے ہوئے ساقی سے حیا آتی ہے ورنہ — ہے یوں کہ مجھے دُردِ تہ جام بہت ہے

نے تیر کماں میں ہے نہ صیاد کمیں میں — گوشے میں قفس کے مجھے آرام بہت ہے

کیا زہد کو مانوں کہ نہ ہو گرچہ ریائی — پاداشِ عمل کی طمعِ خام بہت ہے

ہیں اہلِ خرد کس روشِ خاص پہ نازاں — پابستگیٔ رسم و رہِ عام بہت ہے

زمزم ہی پہ چھوڑو مجھے کیا طوفِ حرم سے — آلودہ بہ مے جامۂ احرام بہت ہے

ہے قہر گر اب بھی نہ بنے بات کہ ان کو — انکار نہیں اور مجھے ابرام بہت ہے

خوں ہو کے جگر آنکھ سے ٹپکا نہیں اے مرگ — رہنے دے مجھے یاں کہ ابھی کام بہت ہے

ہوگا کوئی ایسا بھی کہ غالب کو نہ جانے
شاعر تو وہ اچھا ہے پہ بدنام بہت ہے

غزلِ مشاعرہ

نویدِ امن ہے بیدادِ دوست جاں کے لئے
رہی نہ طرزِ ستم کوئی آسماں کے لئے

بلا سے گر مژۂ یار تشنۂ خوں ہے
رکھوں کچھ اپنی بھی مژگانِ خونفشاں کیلئے

وہ زندہ ہم ہیں کہ ہیں روشناسِ خلق اے خضر!
نہ تم کہ چور بنے عمرِ جاوداں کیلئے

رہا بلا میں بھی میں مبتلائے آفتِ رشک
بلائے جاں ہے ادا تیری اک جہاں کیلئے

فلک نہ دور رکھ اس سے مجھے کہ میں ہی نہیں
دراز دستیِ قاتل کے امتحاں کیلئے

مثال یہ مری کوشش کی ہے کہ مرغِ اسیر
کرے قفس میں فراہم خس آشیاں کیلئے

گدا سمجھ کے وہ چپ تھا مری جو شامت آئی
اُٹھا اور اُٹھ کے قدم میں نے پاسباں کیلئے

بقدرِ شوق نہیں ظرفِ تنگنائے غزل
کچھ اور چاہیئے وسعت مرے بیاں کیلئے

دیا ہے خلق کو بھی تا اُسے نظر نہ لگے
بنا ہے عیش تجمل حسین خاں کے لئے

زباں پہ بارِ خدایا یہ کس کا نام آیا
کہ میرے نطق نے بوسے مری زباں کیلئے

نصیرِ دولت و دیں اور معینِ ملت و ملک
بنا ہے چرخِ بریں جس کے آستاں کیلئے

زمانہ عہد میں اس کے ہے محوِ آرائش
بنیں گے اور ستارے اب آسماں کے لئے

ادائے خاص سے غالبؔ ہوا ہے نکتہ سرا
صلائے عام ہے یارانِ نکتہ داں کیلئے

مرثیۂ عارف

لازم تھا کہ دیکھو مرا رستہ کوئی دن اور
تنہا گئے کیوں اب رہو تنہا کوئی دن اور

مٹ جائے گا سر گر ترا پتھر نہ گھسے گا
ہوں در پہ ترے ناصیہ فرسا کوئی دن اور

آئے ہو کل اور آج ہی کہتے ہو کہ "جاؤں"
مانا کہ نہیں آج سے اچھا کوئی دن اور

جاتے ہوئے کہتے ہو "قیامت کو ملیں گے"
کیا خوب! قیامت کا ہے گویا کوئی دن اور!

ہاں اے فلکِ پیر جواں تھا ابھی عارف
کیا تیرا بگڑتا جو نہ مرتا کوئی دن اور

تم ماہِ شبِ چاردہم تھے مرے گھر کے
پھر کیوں نہ رہا گھر کا وہ نقشہ کوئی دن اور

تم کون سے ایسے تھے کھرے داد و ستد کے
کرتا ملک الموت تقاضا کوئی دن اور

مجھ سے تمہیں نفرت سہی نیر سے لڑائی
بچوں کا بھی دیکھا نہ تماشا کوئی دن اور

گزری نہ بہر حال یہ مدت خوش و ناخوش؟
کرنا تھا جواں مرگ گزارا کوئی دن اور

ناداں ہو جو کہتے ہو کہ کیوں جیتے ہو غالب
قسمت میں ہے مرنے کی تمنا کوئی دن اور

سہرا

خوش ہو اے بخت کہ ہے آج ترے سر سہرا
باندھ شہزادہ جواں بخت کے سر پر سہرا

کیا ہی اس چاند سے مکھڑے پہ بھلا لگتا ہے
ہے ترے حسنِ دل افروز کا زیور سہرا

سر پہ چڑھنا تجھے پھبتا ہے پر اے طرفِ کلاہ!
مجھکو ڈر ہے کہ نہ چھینے ترا امبر سہرا

ناؤ بھر کر ہی پروئے گئے ہوں گے موتی
ورنہ کیوں لائے ہیں کشتی میں لگا کر سہرا

سات دریا کے فراہم کئے ہوں گے موتی
تب بنا ہوگا اس انداز کا گز بھر سہرا

رخ پہ دولھا کے جو گرمی سے پسینہ ٹپکا
ہے رگِ ابرِ گہربار سراسر سہرا

یہ بھی اک بے ادبی تھی کہ قبا سے بڑھ جائے
رہ گیا آن کے دامن کے برابر سہرا

جی میں اترائیں نہ موتی کہ ہمیں ہیں اک چیز
چاہیے پھولوں کا بھی ایک مقرر سہرا

جبکہ اپنے میں سماویں نہ خوشی کے مارے
گوندھے پھولوں کا بھلا پھر کوئی کیونکر سہرا

رخِ روشن کی دمک گوہرِ غلطاں کی چمک
کیوں نہ دکھلائے فروغِ مہ و اختر سہرا

تارِ ریشم کا نہیں۔ ہے رگِ ابرِ بہار لائے گا تابِ گرانباریٔ گوہر سہرا

ہم سخن فہم ہیں غالب کے طرفدار نہیں
دیکھیں اِس سہرے سے کہدے کوئی بہتر سہرا

معذرت

منظور ہے گذارشِ احوالِ واقعی اپنا بیانِ حسنِ طبیعت نہیں مجھے
سو پشت سے ہے پیشۂ آبا سپہ گری کچھ شاعری ذریعۂ عزت نہیں مجھے
آزادہ رَو ہوں اور مرا مسلک ہے صلحِ کُل ہرگز کبھی کسی سے عداوت نہیں مجھے
کیا کم ہے یہ شرف کہ "ظفر" کا غلام ہوں مانا کہ جاہ و منصب ثروت نہیں مجھے
استادِ شہ سے ہو مجھے پرخاش کا خیال یہ تاب یہ مجال یہ طاقت نہیں مجھے
جامِ جہاں نما ہے شہنشاہ کا ضمیر سوگند اور گواہ کی حاجت نہیں مجھے
میں کون اور ریختہ ہاں اس سے مدعا جُز انبساطِ خاطرِ حضرت نہیں مجھے
سہرا لکھا گیا زرہِ امتثالِ امر دیکھا کہ چارہ غیرِ اطاعت نہیں مجھے
مقطع میں آ پڑی ہے سخن گسترانہ بات مقصود اس سے قطعِ محبت نہیں مجھے
روئے سخن کسی کی طرف ہو تو رُوسیاہ سودا نہیں جنوں نہیں وحشت نہیں مجھے
قسمت بُری سہی پہ طبیعت بُری نہیں ہے شکر کی جگہ کہ شکایت نہیں مجھے

صادق ہوں اپنے قول میں غالب خدا گواہ
کہتا ہوں سچ کہ جھوٹ کی عادت نہیں مجھے

نوحہ

ہاں اے نفسِ بادِ سحر شعلہ فشاں ہو   اے دجلۂ خوں چشمِ ملائک سے رواں ہو
اے زمزمۂ قم لبِ عیسے پہ فغاں ہو   اے ماتمیانِ شہِ معصوم کہاں ہو
بگڑی ہے بہت بات بنائے نہیں بنتی
اب گھر کو بغیر آگ لگائے نہیں بنتی

تابِ سخن و طاقتِ غوغا نہیں ہم کو   ماتم میں شہِ دیں کے ہیں سودا نہیں ہمکو
گھر پھونکنے میں اپنے محابا نہیں ہمکو   گر چرخ بھی جل جائے تو پروا نہیں ہمکو
یہ خرگہ نہ پایا جو مدت سے بجا ہے
کیا خیمۂ شبیر سے رتبے میں سوا ہے

کچھ اور ہی عالم نظر آتا ہے جہاں کا   کچھ اور ہی نقشہ ہے دل چشم و زباں کا
کیسا فلک اور مہرِ جہانتاب کہاں کا   ہوگا دلِ بیتاب کسی سوختہ جاں کا
اب مہر میں اور برق میں کچھ فرق نہیں ہے
گرتا نہیں اس رخ سے کہو برق نہیں ہے

سلام

سلام اسے کہ اگر بادشاہ کہیں اسکو   تو پھر کہیں کہ کچھ اس سے سوا کہیں اسکو
نہ بادشاہ نہ سلطان یہ کیا ستائش ہے   کہو کہ خامسِ آلِ عبا کہیں اس کو

خدا کی راہ میں شاہی و خسروی کیسی
کہو کہ رہبرِ راہِ خدا کہیں اس کو

خدا کا بندہ ہے خداوندگار بندوں کا
اگر کہیں نہ خداوند کیا کہیں اس کو؟

فروغ جوہرِ ایماں حسین ابنِ علی
کہ شمعِ انجمنِ کبریا کہیں اسکو

کفیلِ بخششِ اُمت ہے بن نہیں پڑتی
اگر نہ شافعِ روزِ جزا کہیں اس کو

مسیح جس سے کرے اخذِ فیضِ جاں بخشی
ستم ہے کشتۂ تیغِ جفا کہیں اس کو

وہ جسکے ماتمیوں پر ہے سلسبیل سبیل
شہیدِ تشنہ لبِ کربلا کہیں اس کو

عدو کی سمعِ رضا میں جگہ نہ پائے وہ بات
کہ جن و انس و ملک سب بجا کہیں اسکو

بہت ہے پایۂ گردِ رہِ حسین بلند
بقدرِ فہم ہے گر کیمیا کہیں اسکو

نظارہ سوز ہے یاں تک ہر ایک ذرۂ خاک
کہ لوگ جوہرِ تیغِ قضا کہیں اسکو

ہمارے درد کی یارب کہیں دوا نہ ملے
اگر نہ درد کی اپنے دوا کہیں اسکو

ہمارا مُنہ ہے کہ دیں اسکے حسنِ صبر کی داد
مگر نبی و علی مرحبا کہیں اس کو

زمام ناقہ کف اسکے میں ہے کہ اہلِ یقین
پس از حسین علی پیشوا کہیں اسکو

وہ ریگِ تفتہ وادی پہ گام فرسا ہے
کہ طالبانِ خدا رہنما کہیں اسکو

امامِ وقت کی یہ قدر ہے کہ اہلِ عناد
پیادہ لے چلیں اور ناسزا کہیں اسکو

یہ اجتہاد عجب ہے کہ ایک دشمنِ دیں
علی سے آکے لڑے اور خطا کہیں اسکو

یزید کو تو نہ تھا اجتہاد کا پایہ
بُرا نہ مانئے گر ہم بُرا کہیں اس کو

علی کے بعد حسن اور حسن کے بعد حسین
کرے جو اُن سے بُرائی بھلا کہیں اسکو

نبی کا ہو نہ جسے اعتقاد کافر ہے
رکھے امام سے جو بغض کیا کہیں اسکو

بھرا ہے غالبِ دلخستہ کے کلام میں درد
غلط نہیں ہے کہ خونیں نوا کہیں اسکو

قصیدہ

ہاں مہِ نو سنیں ہم اس کا نام — جس کو تو جھک کے کر رہا ہے سلام
دو دن آیا ہے تو نظر دمِ صبح — یہی انداز اور یہی اندام
بارے دو دن کہاں رہا غائب؟ — بندہ عاجز ہے گردشِ ایام
اُڑ کے جاتا کہاں کہ تاروں کا — آسماں نے بچھا رکھا تھا دام
مرحبا اے سرورِ خاصِ خواص — حبذا اے نشاطِ عامِ عوام
عذر میں تین دن نہ آنے کے — لے کے آیا ہے عید کا پیغام
اُس کو بھولا نہ چاہیے کہنا — صبح جو جائے اور آئے شام
ایک میں کیا کہ سب نے جان لیا — تیرا آغاز اور ترا انجام
رازِ دل مجھ سے کیوں چھپاتا ہے — مجھ کو سمجھا ہے کیا کہیں نمام
جانتا ہوں کہ آج دنیا میں — ایک ہی ہے امیدگاہِ انام
میں نے مانا کہ تو ہے حلقہ بگوش — غالب اس کا مگر نہیں ہے غلام
جانتا ہوں کہ جانتا ہے تو — تب کہا ہے بہ طرزِ استفہام
مہرِ تاباں کو ہو تو ہو اے ماہ — قربِ ہر روزہ بر سبیلِ دوام
تجھ کو کیا پایہ روشناسی کا — جز بہ تقریبِ عیدِ ماہِ صیام
جانتا ہوں کہ اُسکے فیض سے تو — پھر بنا چاہتا ہے ماہِ تمام
ماہ بن ماہتاب بن میں کون؟ — مجھ کو کیا بانٹ دیگا تو انعام
میرا اپنا جدا معاملہ ہے — اور کے لین دین سے کیا کام
ہے مجھے آرزوئے بخششِ خاص — گر تجھے ہے اُمیدِ رحمتِ عام

جو کہ بخشے گا تجھ کو فرِّ فروغ — کیا نہ دے گا مجھے مئے گلفام
جب کہ چودہ منازلِ فلکی — کر چکی قطع تیری تیزیٔ گام
تیرے پرتو سے ہوں فروغ پذیر — کوئے و مشکوئے و صحن و منظر و بام
دیکھنا میرے ہاتھ میں لبریز — اپنی صورت کا اک بلوریں جام
پھر غزل کی روش پہ چل نکلا — توسنِ طبع چاہتا تھا لگام

غزل

زہرِ غم کر چکا تھا میرا کام — تجھ کو کس نے کہا کہ ہو بدنام
مے ہی پھر کیوں نہ میں پیے جاؤں — غم سے جب ہو گئی ہو زیست حرام
بوسہ کیسا یہی غنیمت ہے — کہ نہ سمجھیں وہ لذّتِ دشنام
کعبے میں جا بجائیں گے ناقوس — اب تو باندھا ہے دیر میں احرام
اُس قدح کا ہے دور مجھ کو نقد — چرخ نے لی ہے جس سے گردشِ جام
بوسہ دینے میں ہے اُن کو انکار — دل کے لینے میں جن کو تھا ابرام

چھیڑتا ہوں کہ ان کو غصہ آئے
کیوں نہ رکھوں ورنہ غالب اپنا نام

کہہ چکا میں تو سب کچھ اب تو کہہ — اے پری چہرہ پیکِ تیز خرام
کون ہے جس کے در پہ ناصیہ سا — ہیں مہ و مہر و زہرہ و بہرام
تو نہیں جانتا تو مجھ سے سن — نامِ شاہنشہِ بلند مقام
قبلۂ چشم و دل بہادر شاہ — مظہرِ ذوالجلال والاکرام
شہسوارِ طریقۂ انصاف — نوبہارِ حدیقۂ اسلام

جس کا ہر فعل صورتِ اعجاز — جس کا ہر قول معنیٔ الہام
بزم میں میزبانِ قیصر و جم — رزم میں اوستادِ رستم و سام
اے ترا لطف زندگی افزا! — اے ترا عہدِ فرخی فرجام
چشمِ بد دور خسروانہ شکوہ! — لوحش اللہ عارفانہ کلام!
جاں نثاروں میں تیرے قیصرِ روم — جرعہ خواروں میں تیرے مرشدِ جام
وارثِ ملک جانتے ہیں تجھے — ایرج و تور و خسرو و بہرام
زورِ بازو میں مانتے ہیں تجھے — گیو و گودرز و بیژن و رہام
مرحبا موشگافیٔ ناوک — آفریں آبداریٔ صمصام
تیر کو تیرے تیرِ غیر ہدف — تیغ کو تیری تیغِ خصم نیام
رعد کا کر رہی ہے کیا دم بند — برق کو دے رہا ہے کیا الزام
تیرے فیلِ گراں جسد کی صدا — تیرے رخشِ سبک عناں کا خرام
فنِ صورت گری میں تیرا گرز — گر نہ رکھتا ہو دستگاہِ تمام
اس کے مضروب کے سر و تن سے — کیوں نمایاں ہو صورتِ ادغام
جب ازل میں رقم پذیر ہوئے — صفحہ ہائے لیالی و ایام
اور ان اوراق میں بہ کلکِ قضا — مجملاً مندرج ہوئے احکام
لکھ دیا شاہدوں کو عاشق کش — لکھ دیا عاشقوں کو دشمن کام
آسماں کو کہا گیا کہ کہیں — گنبدِ تیز گردِ نیلی فام
حکمِ ناطق لکھا گیا کہ لکھیں — خال کو دانہ اور زلف کو دام
آتش و آب و باد و خاک نے لی — وضعِ سوز و نم و رم و آرام
مہرِ رخشاں کا نام خسرِو روز — ماہِ تاباں کا نام شحنۂ شام
تیری توقیعِ سلطنت کو بھی — دی بدستور صورتِ ارقام

کاتبِ حکم نے بموجب حکم — اس رقم کو دیا طرازِ دوام

ہے ازل سے روانیِ آغاز

ہو ابد تک رسائیِ انجام

قصیدہ

صبحدم دروازۂ خاور کھلا — مہرِ عالمتاب کا منظر کھلا

خسروِ انجم کے آیا صرف میں — شب کو تھا گنجینۂ گوہر کھلا

وہ بھی تھی اِک سیمیا کی سی نمود — صبح کو رازِ مہ و اختر کھلا

ہیں کواکب کچھ نظر آتے ہیں کچھ — دیتے ہیں دھوکا یہ بازیگر کھلا

سطحِ گردوں پہ پڑا تھا رات کو — موتیوں کا ہر طرف زیور کھلا

صبح آیا جانبِ مشرق نظر — اِک نگارِ آتشیں رخ سر کھلا

تھی نظر بندی کیا جب ردِ سحر — بادۂ گلرنگ کا ساغر کھلا

لا کے ساقی نے صبوحی کیلئے — رکھدیا ہے ایک جامِ زر کھلا

بزمِ سلطانی ہوئی آراستہ — کعبۂ امن و اماں کا در کھلا

تاجِ زرّیں مہرِ تاباں سے سوا — خسروِ آفاق کے منہ پر کھلا

شاہِ روشن دل بہادر شہ کہ ہے — رازِ ہستی اُس پہ سر تا سر کھلا

وہ کہ جسکی صورتِ تکوین میں — مقصدِ نہ چرخ و ہفت اختر کھلا

وہ کہ جس کے ناخنِ تاویل سے — عقدۂ احکامِ پیغمبر کھلا

پہلے دارا کا نکل آیا ہے نام — اسکے سرہنگوں کا جب دفتر کھلا

روشناسوں کی جہاں فہرست ہے — واں لکھا ہے چہرۂ قیصر کھلا

توسنِ شہ میں ہے وہ خوبی کہ جب ق
تھان سے وہ غیرتِ صرصر کھلا

نقشِ پا کی صورتیں وہ دلفریب
تو کہے بت خانۂ آذر کھلا

مجھ پہ فیضِ تربیت سے شاہ کے
منصبِ مہر و مہ و محور کھلا

لاکھ عقدے دل میں تھے لیکن ہر ایک
میری حدِّ وسع سے باہر کھلا

تھا دلِ وابستہ قفلِ بے کلید
کس نے کھولا کب کھلا کیونکر کھلا

باغِ معنی کی دکھاؤں گا بہار
مجھ سے گر شاہِ سخن گستر کھلا

ہو جہاں گرمِ غزل خوانی نفس
لوگ جانیں طبلۂ عنبر کھلا

غزل

کنج میں بیٹھا رہوں یوں پر کھلا
کاشکے ہوتا قفس کا در کھلا

ہم پکاریں اور کھلے یوں کون جائے
یار کا دروازہ پائیں گر کھلا

ہم کو ہے اس رازداری پر گھمنڈ
دوست کا ہے حال دشمن پر کھلا

واقعی دل پر بھلا لگتا تھا داغ
زخم لیکن داغ سے بہتر کھلا

ہاتھ سے رکھ دی کب ابرو نے کمان
کب کمر سے غمزے کی خنجر کھلا

مفت کا کس کو برا ہے بدرقہ
رہروی میں پردۂ رہبر کھلا

سوزِ دل کا کیا کرے بارانِ اشک
آگ بھڑکی مینہ اگر دم بھر کھلا

نامے کے ساتھ آ گیا پیغامِ مرگ
رہ گیا خط میری چھاتی پر کھلا

دیکھیو غالبؔ سے گر الجھا کوئی
ہے ولی پوشیدہ اور کافر کھلا

پھر ہوا مدحت طرازی کا خیال
پھر مہ و خورشید کا دفتر کھلا

خامے نے پائی طبیعت سے مدد — بادباں بھی اٹھتے ہی لنگر کھلا
مدح سے ممدوح کی دیکھی شکوہ — عرض سے یاں رتبۂ جوہر کھلا
مہر کانپا چرخ چکر کھا گیا — بادشہ کا رایتِ لشکر کھلا
بادشاہ کا نام لیتا ہے خطیب — اب علوِ پایۂ منبر کھلا
سکّۂ شہ کا ہوا ہے روشناس — اب عیارِ آبروئے زر کھلا
شاہ کے آگے دھرا ہے آئینہ — اب مآلِ سعیٔ اسکندر کھلا
ملک کے وارث کو دیکھا خلق نے — اب فریبِ طغرل و سنجر کھلا
ہو سکے کیا مدح ہاں اک نام ہے — دفترِ مدحِ جہاں داور کھلا
فکر اچھی پر ستائش نا تمام — عجزِ اعجازِ ستائش گر کھلا
جانتا ہوں ہے خطِ لوحِ ازل — تم پہ اے خاقانِ نام آور کھلا

تم کرو صاحبقرانی جب تلک
ہے طلسمِ روز و شب کا در کھلا

صفتِ انبہ

ہاں دلِ دردمندِ زمزمہ ساز — کیوں نہ کھولے درِ خزینۂ راز
خامے کا صفحے پر رواں ہونا — شاخِ گل کا ہے گلفشاں ہونا
مجھ سے کیا پوچھتا ہے کیا لکھیے — نکتہ ہائے خرد فزا لکھیے
بارے آموں کا کچھ بیاں ہو جائے — خامہ نخلِ رطب فشاں ہو جائے
آم کا کون مردِ میداں ہے — ثمر و شاخ گوئے و چوگاں ہے
تاک کے جی میں کیوں رہے ارماں — آئے یہ گوئے اور یہ میداں

آم کے آگے پیش جائے خاک　　پھوڑتا ہے جلے پھپھولے تاک
نہ چلا جب کسی طرح مقدور　　بادۂ ناب بن گیا انگور
یہ بھی ناچار جی کا کھونا ہے　　شرم سے پانی پانی ہونا ہے
مجھ سے پوچھو تمہیں خبر کیا ہے　　آم کے آگے نیشکر کیا ہے
نہ گل اس میں نہ شاخ و برگ نہ بار　　جب خزاں آئے تب ہو اسکی بہار
اور دوڑایئے قیاس کہاں　　جانِ شیریں میں یہ مٹھاس کہاں
جان میں ہوتی گر یہ شیرینی　　کوہکن باوجود غمگینی
جان دینے میں اسکو یکتا جان　　پر وہ یوں سہل دے نہ سکتا جان
نظر آتا ہے یوں مجھے یہ ثمر　　کہ دواخانۂ ازل میں مگر
آتشِ گل پہ قند کا ہے قوام　　شیرہ کے تار کا ہے ریشہ نام
یا یہ ہوگا کہ فرطِ رافت سے　　باغبانوں نے باغِ جنت سے
انگبیں کے بہ حکمِ ربُّ الناس　　بھر کے بھیجے ہیں سر بہ مُہر گلاس
یا لگا کے خضر نے شاخِ نبات　　مدتوں تک دیا ہے آبِ حیات
تب ہوا ہے ثمر فشاں یہ نخل　　ہم کہاں ورنہ اور کہاں یہ نخل
تھا ترنج زر ایک خسرو پاس　　رنگ کا زرد پر کہاں بُو باس
آم کو دیکھتا اگر اک بار　　پھینک دیتا طلائے دست افشار
رونقِ کارگاہِ برگ و نوا　　نازشِ دودمانِ آب و ہوا
رہروِ راہِ خلد کا توشہ　　طوبیٰ و سدرہ کا جگر گوشہ
صاحبِ شاخ و برگ و بار ہے آم　　ناز پروردۂ بہار ہے آم
خاص وہ آم جو نہ ارزاں ہو　　نوبرِ نخلِ باغِ سلطاں ہو
وہ کہ ہے والیِ ولایتِ عہد　　عدل سے اسکے ہے حمایتِ عہد

مفخرِ دیں عزّ و شان و جاہ و جلال — زینتِ طینت و جمالِ کمال

کارفرمائے دین و دولت و بخت — چہرہ آرائے تاج و مسند و تخت

سایہ اس کا ہما کا سایہ ہے — خلق پر وہ خدا کا سایہ ہے

اے مفیضِ وجود سایہ و نور — جب تلک ہے نمودِ سایہ و نور

اس خداوندِ بندہ پرور کو — وارثِ گنج و تخت و افسر کو

شاد و دل شاد و شادماں رکھیو

اور غالب پہ مہرباں رکھیو

قطعات

اے شہنشاہِ فلک منظرِ بے مثل و نظیر — اے جہاندارِ کرم شیوۂ بے شبہ و عدیل

پاؤں سے تیرے ملے فرقِ ارادت اورنگ — فرق سے تیرے کرے کسبِ سعادت اکلیل

تیرا اندازِ سخن شانۂ زلفِ الہام — تیری رفتارِ قلم جنبشِ بالِ جبریل

تجھ سے عالم پہ کھلا رابطۂ قربِ کلیم — تجھ سے دنیا میں بچھا مائدۂ بذلِ خلیل

بہ سخن اوج دہ مرتبۂ معنی و لفظ — بہ کرم داغ نہ ناصیۂ قلزم و نیل

تا ترے وقت میں ہو عیش و طرب کی توقیر — تا ترے عہد میں ہو رنج و الم کی تقلیل

ماہ نے چھوڑ دیا ثور سے جانا باہر — زہرہ نے ترک کیا حوت سے کرنا تحویل

تیری دانش مری اصلاحِ مفاسد کی رہین — تیری بخشش مری انجاحِ مقاصد کی کفیل

تیرا اقبالِ ترحم مرے جینے کی نوید — تیرا اندازِ تغافل مرے مرنے کی دلیل

بختِ ناساز نے چاہا کہ نہ دے مجھکو اماں — چرخِ کج باز نے چاہا کہ کرے مجھکو ذلیل

پیچھے ڈالی ہے سرِ رشتۂ اوقات میں گانٹھ — پہلے ٹھونکی ہے بنِ ناخنِ تدبیر میں کیل

تپشِ دل نہیں بے رابطۂ خوفِ عظیم
کششِ دم نہیں بے ضابطۂ جرِّ ثقیل

دُرِّ معنی سے مرا صفحۂ لقا کی داڑھی
غمِ گیتی سے مرا سینۂ عمر کی زنبیل

فکر میری گہر اندوزِ اشاراتِ کثیر
کلک میری رقم آموزِ عباراتِ قلیل

میرے ابہام پہ ہوتی ہے تصدق توضیح
میرے اجمال سے کرتی ہے تراوش تفصیل

نیک ہوتی مری حالت تو نہ دیتا تکلیف
جمع ہوتی مری خاطر تو نہ کرتا تعجیل

قبلۂ کون و مکاں خستہ نوازی میں یہ دیر؟
کعبۂ امن و اماں عقدہ کشائی میں ڈھیل

گذارش بحضور شہنشاہ

اے شہنشاہِ آسماں اورنگ
اے جہاندارِ آفتاب آثار

تھا میں اک بینوائے گوشہ نشیں
تھا میں اک دردمندِ سینہ فگار

تم نے مجھکو جو آبرو بخشی
ہوئی میری وہ گرمیِ بازار

کہ ہوا مجھ سا ذرّۂ ناچیز
روشناسِ ثوابت و سیّار

گرچہ از روئے ننگِ بیہنری
ہوں خود اپنی نظر میں اتنا خوار

کہ گر اپنے کو میں کہوں خاکی
جانتا ہوں کہ آئے خاک کو عار

شاد ہوں لیکن اپنے جی میں کہ ہوں
بادشہ کا غلامِ کارگزار

خانہ زاد اور مرید اور مداح
تھا ہمیشہ سے یہ عریضہ نگار

بارے نوکر بھی ہو گیا صد شکر
نسبتیں ہو گئیں مشخص چار

نہ کہوں آپ سے تو کس سے کہوں؟
مدعائے ضروری الاظہار

پیر و مرشد اگرچہ مجھکو نہیں
ذوقِ آرائشِ سر و دستار

کچھ تو جاڑے میں چاہیئے آخر
تا نہ دے بادِ زمہریر آزار

کیوں نہ درکار ہو مجھے پوشش — جسم رکھتا ہوں ہے اگرچہ نزار
کچھ خریدا نہیں ہے اب کے سال — کچھ بنایا نہیں ہے اب کی بار
رات کو آگ اور دن کو دھوپ — بھاڑ میں جائیں ایسے لیل و نہار
آگ تاپے کہاں تلک انساں — دھوپ کھائے کہاں تلک جاندار
دھوپ کی تابش آگ کی گرمی — وقنا ربنا عذاب النار
میری تنخواہ جو مقرر ہے — اس کے ملنے کا ہے عجب ہنجار
رسم ہے مردہ کی چھ ماہی ایک — خلق کا ہے اسی چلن پہ مدار
مجھ کو دیکھو تو ہوں بقید حیات — اور چھ ماہی ہو سال میں دو بار
بسکہ لیتا ہوں ہر مہینے قرض — اور رہتی ہے سود کی تکرار
میری تنخواہ میں تہائی کا — ہو گیا ہے شریک ساہوکار
آج مجھ سا نہیں زمانے میں — شاعر نغز گوئے خوش گفتار
رزم کی داستان اگر سنیے — ہے زباں میری تیغ جوہر دار
بزم کا التزام گر کیجے — ہے قلم میرا ابر گوہر بار
ظلم ہے گر نہ دو سخن کی داد — قہر ہے گر کرو نہ مجھ کو پیار
آپ کا بندہ اور پھروں ننگا — آپ کا نوکر اور کھاؤں ادھار
میری تنخواہ کیجے ماہ بماہ — تا نہ ہو مجھ کو زندگی دشوار
ختم کرتا ہوں اب دعا پہ کلام — شاعری سے نہیں مجھے سروکار

تم سلامت رہو ہزار برس
ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار

قطعہ

نہ پوچھ اسکی حقیقت حضور والا نے — ق — مجھے جو بھیجی ہے بیسن کی روغنی روٹی
نہ کھاتے گیہوں نکلتے نہ خلد سے باہر — ۱۸۴۷ — جو کھاتے حضرتِ آدمؑ یہ بیسنی روٹی

مدح

نصرت الملک بہادر مجھے بتلا کہ مجھے — تجھ سے جو اتنی ارادت ہے تو کس بات سے ہے
گرچہ تو وہ ہے کہ ہنگامہ اگر گرم کرے — رونقِ بزمِ مہ و مہر تری ذات سے ہے
اور میں وہ ہوں کہ گر جی میں کبھی غور کروں — غیر کیا خود مجھے نفرت مری اوقات سے ہے
خستگی کا ہو بھلا جسکے سبب سے سرِ دست — نسبت اک گونہ مرے دلکو ترے ہات سے ہے
ہاتھ میں تیرے رہے توسنِ دولت کی عناں — یہ دعا شام و سحر قاضئ حاجات سے ہے
تو سکندر ہے مرا فخر ہے ملنا تیرا — گو شرف خضرؑ کی بھی مجھکو ملاقات سے ہے
اس پہ گزرے نہ گماں ریو و ریا کا زنہار
غالبِ خاک نشیں اہلِ خرابات سے ہے

قطعہ

ہے چارشنبہ آخرِ ماہِ صفر چلو — رکھدیں چمن میں بھر کے مئے مشکبو کی ماند
جو آئے جام بھر کے پیئے اور ہو کے مست — سبزے کو روندتا پھرے پھولوں کو جائے پھاند

بٹتے ہیں سونے روپے کے چھلّے حضور میں
ہے جن کے آگے سیم و زر مہر و ماہ ماند

یوں سمجھیے کہ بیچ سے خالی کیے ہوئے
لاکھوں ہی آفتاب ہیں اور بےشمار چاند

غالب یہ کیا بیاں ہے بجز مدحِ پادشاہ
بھاتی نہیں ہے اب مجھے کوئی نوشتہ خواند

قطعہ

اے شاہِ جہانگیر جہاں بخش جہاندار
ہے غیب سے ہر دم تجھے صد گونہ بشارت

جو عقدۂ دشوار کہ کوشش سے نہ وا ہوا
تو وا کرے اس عقدے کو سو بھی بہ اشارت

ممکن ہے کرے خضر سکندر سے ترا ذکر؟
گر لب کو نہ دے چشمۂ حیواں سے طہارت

آصف کو سلیماں کی وزارت سے شرف تھا
ہے فخر سلیماں جو کرے تیری وزارت

ہے نقشِ مریدی ترا فرمانِ الٰہی
ہے داغِ غلامی ترا توقیعِ امارت

تو آب سے گر سلب کرے طاقتِ سیلاں
تو آگ سے گر دفع کرے تابِ شرارت

ڈھونڈے نہ ملے موجۂ دریا میں روانی
باقی نہ رہے آتشِ سوزاں میں حرارت

ہے گرچہ مجھے نکتہ سرائی میں توغل
ہے گرچہ مجھے سحر طرازی میں مہارت

کیونکر نہ کروں مدح کو میں ختم دعا پر
قاصر ہے ستائش میں تری میری عبارت

نوروز ہے آج اور وہ دن ہے کہ ہوئے ہیں
نظارگیِ صنعتِ حق اہلِ بصارت

تجھ کو شرفِ مہر جہاں تاب مبارک
غالب کو ترے عتبۂ عالی کی زیارت

متفرقات

افطارِ صوم کی کچھ اگر دستگاہ ہو — اُس شخص کو ضرور ہے روزہ رکھا کرے
جس پاس روزہ کھول کے کھانے کو کچھ نہ ہو — روزہ اگر نہ کھائے تو ناچار کیا کرے

سیہ گلیم ہوں لازم ہے میرا نام نہ لے — جہاں میں جو کوئی فتح و ظفر کا طالب ہے
ہوا نہ غلبہ میسر کبھی کسی پہ مجھے — کہ جو شریک ہو میرا شریکِ غالب ہے

سہل تھا مسہل ولے یہ سخت مشکل آپڑی — مجھ پہ کیا گزرے گی اتنے روز حاضر بن ہوئے
تین دن مسہل سے پہلے تین دن مسہل کے بعد — تین مسہل تین تبریدیں یہ سب کے دن ہوئے

خجستہ انجمنِ طوئے میرزا جعفر — کہ جس کے دیکھے سے سب کا ہوا ہے جی محفوظ
ہوئی ہے ایسے ہی فرخندہ سال میں غالبؔ — نہ کیوں ہو مادہ سالِ عیسوی "محفوظ" ۱۸۵۴ء

ہوئی جب میرزا جعفر کی شادی — ہوا بزمِ طرب میں رقصِ ناہید
کہا غالبؔ سے تاریخ اسکی کیا ہے — تو بولا "اِنشراحِ جشنِ جمشید" ۱۲۷۰ھ

گو ایک بادشاہ کے سب خانہ زاد ہیں — دربار دار لوگ بہم آشنا نہیں
کانوں پہ ہاتھ دھرتے ہیں کرتے ہوئے سلام — ہے اس سے یہ مراد کہ ہم آشنا نہیں

حق شہ کی بقا سے خلق کو شاد کرے
تا شاہ شیوعِ دانش و داد کرے
یہ دی جو گئی ہے رشتۂ عمر میں گانٹھ
ہے صفر کہ افزائشِ اعداد کرے

اس رشتہ میں لاکھ تار ہوں بلکہ سوا
اتنے ہی برس شمار ہوں بلکہ سوا
ہر سینکڑے کو ایک گرہ فرض کریں
ایسی گرہیں ہزار ہوں بلکہ سوا

جن لوگوں کو ہے مجھ سے عداوت گہری
کہتے ہیں مجھے وہ رافضی اور دہری
دہری کیونکر ہو جو کہ ہووے صوفی؟
شیعی کیونکر ہو ماوریٰ النہری

ہم گرچہ بنے سلام کرنے والے
کرتے ہیں درنگ کام کرنے والے
کہتے ہیں کہیں خدا سے اللہ اللہ
وہ آپ ہیں صبح و شام کرنے والے

کہتے ہیں کہ اب وہ مردم آزار نہیں
عشاق کی پرسش سے اُسے عار نہیں
جو ہاتھ کہ ظلم سے اٹھایا ہوگا
کیونکر مانوں کہ اسمیں تلوار نہیں

سامان خور و خواب کہاں سے لاؤں
آرام کے اسباب کہاں سے لاؤں
روزہ مرا ایمان ہے غالب لیکن
خس خانہ و برفاب کہاں سے لاؤں

ان سیم کے بیجوں کو کوئی کیا جانے
بھیجے ہیں جو ارمغاں شہ والا نے
گن کر دیویں گے ہم دعائیں سو بار
فیروزہ کی تسبیح کے ہیں یہ دانے

راز و نیاز

بر دست و پائے بندِ گرانے نہادۂ — نازم بہ بندگی کہ نشانے نہادۂ
ایمن نیم ز مرگ اگر رستہ ام ز بند — دلدوز ناوکے بہ کمانے نہادۂ
تا در امید عمر بہ پندار بگذرد — از لطف در حیات نشانے نہادۂ
تا خستہ بلا نبود بے گریز گاہ — در مرگِ احتمالِ امانے نہادۂ
رازست گر دلے بجفائے شکستۂ — زادست گر سرے بسنانے نہادۂ
دوزخ بداغِ سینہ گدازے نہفتۂ — قلزم بچشمِ اشک فشانے نہادۂ
بر ہر دلے فسونِ نشاطے دمیدۂ — بر ہر سرے ز تیغ سپاسِ روانے نہادۂ
ہر دیدہ را در بخیالے کشودۂ — ہر فرقہ را ولے بگمانے نہادۂ

غالب ز غصہ مرد ہمانا خبر نداشت
کاندر خرابہ گنجِ نہانے نہادۂ

نعت

حق جلوہ گر ز طرزِ بیانِ محمدؐ ست — آرے کلام حق بزبانِ محمدؐ ست
آئینہ دارِ پرتوِ مہر ست ماہتاب — شانِ حق آشکار ز شانِ محمدؐ ست
تیرِ قضا ہر آئینہ در ترکشِ حق ست — اما کشادِ آں ز کمانِ محمدؐ ست
دانی اگر بہ معنیٔ لولاک وارسی — خود ہر چہ از حق ست از آنِ محمدؐ ست

هر کس قسم بدانچہ عزیزست می خورد — سوگندِ کردگار بجانِ محمدؐ ست
واعظ حدیثِ سایۂ طوبےٰ فرو گذار — کاینجا سخن ز سروِ روانِ محمدؐ ست
بنگر دو نیمہ گشتنِ ماہِ تمام را — کاں نیمہ جنبشی ز بنانِ محمدؐ ست
در خود ز نقشِ مُہرِ نبوت سخن رود — آں نیز نامور ز نشانِ محمدؐ ست

غالب ثنائے خواجہ بہ یزداں گذاشتیم
کاں ذاتِ پاک مرتبہ دانِ محمدؐ ست

سالکانِ طریقت

رہرواں چوں گہرِ آبلۂ پا بینند — پائے را پایہ فراتر ز ثریا بینند
ہرچہ در دیدہ عیانست نگاہش دارند — ہرچہ در سینہ نہانست ز سیما بینند
راستی از رقمِ صفحۂ ہستی خوانند — نقشِ کج بر ورقِ شہپرِ عنقا بینند
راز زیں دیدہ وراں جوئے کہ از دیدہ وری — نقطہ گر در نظر آرند سویدا بینند
راہ زیں دیدہ وراں پُرس کہ در گرم روی — جادہ چوں نبضِ تپاں در تنِ صحرا بینند
نشترے را کہ بناگاہ بدر خواہد جست — زخمہ کردار تبارِ رگِ خارا بینند
قطرہ را کہ ہر آئینہ گہر خواہد بست — صورتِ آبلہ بر چہرۂ دریا بینند
شام در کیسۂ صبحِ نمایاں نگرند — روز در منظرِ خفاش ہویدا بینند
وحشتِ تفرقہ در کاخِ مصوّر سنجند — مجمعِ انس بہ نے بستِ زلیخا بینند
ہرچہ گوید عجم از خسرو شیریں شنوند — ہرچہ آرد عرب از وامق و عذرا بینند
بنتِ ہند اگر ہمرہِ مجنوں گردند — نخرد شتہ اگر محملِ لیلا بینند
قشقہ را رونقِ ہنگامۂ ہندو خوانند — بادہ را شمعِ طرب خانۂ ترسا بینند

برسم و زمزمہ و قشقہ و زنار و صلیب
خرقہ و سبحہ و مسواک و مصلا بینند

دل نہ بندد و بہ نیرنگ و دریں دیرِ دو رنگ
ہر چہ بینند بعنوانِ تماشا بینند

ہر چہ در سو نتواں یافت بہر سو یابند
ہر چہ در جا نتواں دید بہر جا بینند

بُردانہ یاد کہ دنیاست نمودِ بے بود
ایں دل افسرو ز نمودے کہ ز دنیا بینند

آرزو

ازنکوئی نشاں نمے خواہم
خویش را بدگماں نمے خواہم

زیست بے ذوقِ مرگ خوش نبود
دل اگر رفت جاں نمے خواہم

باغبانم گرفت و خست و گذاشت
جز بباغ آشیاں نمے خواہم

کس نمی نالد از فسانۂ من
دردِ دل رایگاں نمے خواہم

ہیچ کس شوِ من نمے خواہد
ہیچ کس را زیاں نمے خواہم

ہر یکے دشمنیست دوست نما
یاری از اختراں نمے خواہم

آرزو عیب نیست خوردہ جگر
خواہم اما چناں نمے خواہم

رنجِ صاحبدلاں روا نہ بود
بندِ اہلِ زباں نمے خواہم

دوشہار افگار نہ پسندم
بارِ ہا را گراں نمے خواہم

مور را مار گیر نپذیرم
پشہ را پیلیاں نمے خواہم

ہاں وہاں نیستم محالِ طلب
نو بہار از خزاں نمے خواہم

گہر افشانم و بہا طلبم
سیم و زر رایگاں نمے خواہم

نتواں کرد با غالب پرخاش
خرد و خردہ داں نمے خواہم

خستۂ چشم زخم خویشتنم / ناز کے برلشاں نمے خواہم
خوبہ بیداد کردہ ام غالب / عہدِ نوشیرواں نمے خواہم
خواہشے چند میکنم لیکن / کارہا را رواں نمے خواہم
پائے فرسودہ در رکاب وہنوز / دستِ خود بر عناں نمے خواہم
سخن از عالمِ دگر دارم / ہمدم و رازداں نمے خواہم
گر بود خود سروشِ وحی سرائے / باخودش ہمزباں نمی خواہم
سینہ صافم قلندرم مستم / رازِ خود را نہاں نمی خواہم
پایۂ در نظر نماند و گر / خویشتن را نشاں نمی خواہم
یوسفؑ از مصر گشتہ خوشدل و من / بہ تلافی جہاں نمے خواہم
بہ زلیخا شباب بخشیدند / بختِ خود را جواں نمی خواہم
بر رُخِ حکمتِ موجۂ حق / غازۂ امتحاں نمے خواہم
عینِ من ہرچہ اقتضا میکرد / خواستم غیر آں نمے خواہم
چوں حکایت بجائے خویش رسید / تن زدم داستاں نمے خواہم

بہار

باز پیغامِ بہار آوردہ باد / مژدہ ہر روزگار آوردہ باد
نیکوئی در رنگ و بو افزودہ مہر / تازگی در برگ و بار آوردہ باد
گنج بادآورد خسرو یکطرف / گنج ہائے بے شمار آوردہ باد
گر ترنج زر نباشد گو مباش / زیں نمائش ہا ہزار آوردہ باد
شاہدِ گل تابِ مستوری نداشت / مستش اندر رہگذار آوردہ باد

از ہجومِ غنچہ در صحنِ چمن — کودکانِ نے سوار آورد باد
نقشہائے دلفریب انگیخت چرخ — ابرہائے دجلہ بار آورد باد
کرد خوش گرم تابِ آفتاب — چشمہا از کوہسار آورد باد
چوں سمن بشگفت گوہر در صدف — از کجا ایں کاروبار آورد باد
گر نہ لعبت باز بود دست از چہ رُو — لالہ و گل را بکار آورد باد
گل بروئے سبزہ می غلطد بدشت — آرزوئے سبزہ زار آورد باد
جوشِ خوں در سینہ جوشِ گل بباغ — ہم نہاں ہم آشکار آورد باد
بوئے گل شد گر بخار انگیخت خاک — موجِ گل زد گر غبار آورد باد

آئینِ مغرب

صاحبانِ انگلستاں را نگر — شیوہ و اندازِ اینان را نگر
تا چہ آئینہا پدید آوردہ اند — آنچہ ہرگز کس ندید آوردہ اند
زیں ہنرمنداں ہنر بیشی گرفت — سعی بر پیشینیاں پیشی گرفت
حق ایں قوم است آئیں داشتن — کس نیارد ملک بہ زیں داشتن
داد و دانش را بہم پیوستہ اند — ہند را صد گونہ آئیں بستہ اند
آتشے کز سنگ بیروں آورند — ایں ہنرمنداں ز خس چوں آورند
تا چہ افسوں خواندہ اند اینان برآب — دود کشتی را ہمی راند در آب
گہ دخاں کشتی بہ جیحوں می برد — گہ دخاں گردوں بہاموں می برد
غلطک گردوں بگرداند دخاں — نرہ گاو و اسپ را ماند دماں

از دخان زورق برفتار آمده | باد و موج این هر دو بیکار آمده
نغمه‌ها بی زخمه از ساز آورند | حرف چون طائر به پرواز آورند
هین نمی‌بینی که این دانا گروه | در دو دم آرند حرف از صد گروه
می زنند آتش بباد اندر همی | می درخشد باد چون اخگر همی
کار و بار مردم هشیار بین | در هر آئین صد نو آئین کار بین
پیش این آئین که دارد روزگار | گشته آئینِ دگر تقویم پار

چراغِ سحری

دمِ واپسیں بر سرِ راہ ہے
عزیزو اب اللہ ہی اللہ ہے

چراغِ سحری

قند پارسی

ہم انا اللہ خواں درختے را بگفتار آورد — ہم انا الحق گوئے مردے را بسرِ دار آورد

ایکہ پنداری کہ ناچار است گردوں در روش — نیست ناچار آنکہ گردوں را برفتار آورد

نکتہ داریم و با یاراں نمے گوئم فاش — طالبِ دیدار باید تابِ دیدار آورد

آں کند قطعِ بیاباں ایں شگافد مغزِ کوہ — عشق ہر یک را بطرزِ خاص درکار آورد

جذبِ شوقش بیں کہ در ہنگام برگشتن ز دیر — در قفائے خویشتن بُت را برفتار آورد

دانہا چوں ریزد از تسبیح تارے بیش نیست — ایں مشعبدہ دہر گاہ از سبحہ زنّار آورد

نزد ما حیف است گو نزد زلیخا میل باش — جذبہ کز چاہ یوسف را ببازار آورد

ہر انارے را کہ افشاریم از وے خوں چکد — ہر نہالے را کہ بنشانیم دل بار آورد

نیست چوں در منطقش جز ذکرِ شاہد حرف و صوت
شاہدے باید کہ غالب را بگفتار آورد

(۱۸۶۵ء)

اے ذوقِ نوا سنجی بازم بخروش آور
غوغائے شبیخونے بر بنگہ ہوش آور

گر خود بجہد از سر از دیدہ فرو بارش
دل خوں کن و آں خوں را در سینہ بجوش آور

ہاں ہمدمِ فرزانہ دانی رہِ ویرانہ
شمعے کہ نخواہد شد از باد خموش آور

شورابۂ ایں وادی تلخ است اگر داری
از شہد سبوئے من سرچشمۂ نوش آور

دانم کہ زرے داری ہر جا گروے داری
مے گر ندہد سلطاں از بادہ فروش آور

گر مغ بکدو ریزد بر کف نہ و راہی شو
ور شہ بسبو بخشد بردار و بدوش آور

ریحاں دمد از مینا رامش چکد از قلقل
آں در رہِ چشم افگن ویں زپئے گوش آور

گاہے بسبکدستی زاں بادہ ز خویشم بر
گاہے بسیہ مستی از نغمہ بہوش آور

غالب کہ بقایش باد ہمپائے اگر ناید
بارے غزلے فردے زاں موئینہ پوش آور

قصیدہ

در روزگار ما نتواند شمار یافت
خود روزگار آنچہ دریں روزگار یافت

پرگار تیز گرد فلک درمیاں مبیں
حق دادہ داد حق کہ بمرکز قرار یافت

درہائے آسماں بزمیں باز کردہ اند
ہر کس ہر آنچہ جست بہ رہگزار یافت

آمد اگر بعرض ز بالا بلا فرود
بر روئے خاک پیچ و خم زلف یار یافت

چوں حسنِ ماہ یکشنبہ بینی بداں کہ ماہ
پاداش جانگدازیٔ شبہائے تار یافت

چوں روئے رنگ گل نگری شاد شو کہ گل
اجرِ جگر خراشیٔ پیکان خار یافت

در خاک و باد و آتش و آب آشتی فزود
ایں پرورش کہ خلق ز پروردگار یافت

ناچار جز بداد گرائش نمی کنند / در دہر ہر چہ صورت ازیں ہر چہار یافت

ہر کس بقدرِ فطرت خویش ارجمند گشت / ہر شے بہ حسن جوہر خویش اشتہار یافت

گر خواجہ بندہ را خطِ آزادگی بنوشت / ہم بر درِ سرائے سحو وش بندہ وار یافت

ور بندہ خود ز خشم خطِ بندگی درید / توقیعِ خوشدلی ز خداوندگار یافت

مہ روشنی و مہر فروزش ز سر گرفت / لیل و نہار صورتِ لیل و نہار یافت

بہرام دل بہ بستنِ تیغ و کمر نہاد / ناہید ذوقِ ورزشِ مضراب و تار یافت

نظارہ فتنہ ہائے عیاں از نظر سترد / اندیشہ گنجہائے نہاں آشکار یافت

برہم زدند قاعدہ ہائے کہن بدہر / ہر کس نشاطِ تازہ ز ہر گونہ کار یافت

فیضِ سحر بہ غالبِ پیمانہ کش رسید / ذوقِ صبوح عابدِ شب زندہ دار یافت

غزلیاتِ اردو

ممکن نہیں ہے بھول کے بھی آرمیدہ ہوں / میں دشتِ غم میں آہوئے صیاد دیدہ ہوں

ہوں دردمند جبر ہو یا اختیار ہو / گہ نالۂ کشیدہ گہ اشکِ چکیدہ ہوں

جاں لب پہ آئی تو بھی نہ شیریں ہوا دہن / از بسکہ تلخیٔ غمِ ہجراں چشیدہ ہوں

نے سبحہ سے علاقہ نہ ساغر سے واسطہ / میں معرضِ مثال میں دستِ بریدہ ہوں

ہوں خاکسار پر نہ کسی سے ہے مجھکو لاگ / نے دانۂ فتادہ ہوں نے دامِ چیدہ ہوں

جو چاہیئے نہیں وہ مری قدر و منزلت / میں یوسفِ بہ قیمتِ اول خریدہ ہوں

ہرگز کسی کے دل میں نہیں ہے مری جگہ / ہوں میں کلامِ نغز ولے ناشنیدہ ہوں

اہلِ ورع کے حلقے میں ہر چند ہوں ذلیل / پر عاصیوں کے زمرے میں میں برگزیدہ ہوں

پانی سے سگ گزیدہ ڈرے جس طرح اسدؔ
ڈرتا ہوں آئینے سے کہ مردم گزیدہ ہوں (۶)

شب وصال میں مونس گیا ہے بن تکیہ
ہوا ہے موجب آرام جان و تن تکیہ

خراج بادشہ چیں سے کیوں نہ مانگوں آج؟
کہ بن گیا ہے خم جعد پر شکن تکیہ

بنا ہے تختۂ گلہائے یاسمیں بستر
ہوا ہے دستۂ نسرین و نسترن تکیہ

فروغ حسن سے روشن ہے خوابگاہ تمام
جو رخت خواب ہے پرویں تو ہے پرن تکیہ

مزا ملے کہو کیا خاک ساتھ سونے کا
رکھے جو بیچ میں وہ شوخ سیم تن تکیہ

اگرچہ تھا یہ ارادہ مگر خدا کا شکر
اٹھا سکا نہ نزاکت سے گلبدن تکیہ

ہوا ہے کاٹ کے چادر کو ناگہاں غائب
اگرچہ زانوئے نل پر رکھے دمن تکیہ

بضرب تیشہ وہ اس واسطے ہلاک ہوا
کہ ضرب تیشہ پہ رکھتا تھا کوہکن تکیہ

یہ رات بھر کا ہے ہنگامہ صبح ہونے تک
رکھو نہ شمع پر اے اہل انجمن تکیہ

اگرچہ پھینک دیا تم نے دور سے لیکن
اٹھائے کیونکہ یہ رنجور خستہ تن تکیہ

غش آگیا جو پس از قتل میرے قاتل کو
ہوئی ہے اسکو مری نعش بے کفن تکیہ

شب فراق میں یہ حال ہے اذیت کا
کہ سانپ فرش ہے اور سانپ کا ہے من تکیہ

[1] یہ غزل اور اس کے بعد کی دو غزلیں بطور غیر متداول کلام کے رسالہ اردو اور نگ آباد اور چند کتب میں شائع ہوئی ہیں۔ غالب کی تصنیفات میں ان کے متعلق کوئی اندراج نہیں۔ لیکن چونکہ یہ خاندان لوہارو کے افراد سے حاصل ہوئی اور نواب ضیاالدین کے ورثا سے اشعار غالب کا ملنا کوئی عجیب بات نہیں۔ اسلئے ہم نے بھی انہیں درج کتاب کر دیا ہے۔ لیکن ظاہر ہے کہ انہیں اس وثوق سے کلام غالب نہیں کہا جا سکتا جس طرح اس غزل اور اردو قطعے کو جو مرزا کی زندگی میں اردوئے معلےٰ میں ان کے نام سے درج ہو گئے تھے۔ اور اس سلسلے میں ہم یہ بتا دینا ضروری سمجھتے ہیں۔ کہ نواب سر امیر الدین والئے لوہارو ان غزلیات کو کلام غالب نہیں سمجھتے ؛

روا رکھو نہ رکھو تھا جو لفظ "تکیہ کلام" — اب اسکو کہتے ہیں اہل سخن "سخن تکیہ"

ہم اور تم فلک پیر جسکو کہتے ہیں
فقیر غالب مسکیں کا ہے کہن تکیہ

آپ نے مسّنی الضّر کہا ہے تو سہی — یہ بھی اے حضرت ایوب گلا ہے تو سہی

رنج طاقت سے سوا ہو تو نہ پیٹوں کیوں سر — ذہن میں خوبیٔ تسلیم و رضا ہے تو سہی

ہے غنیمت کہ بہ اُمید گزر جائے گی عمر — نہ ملے داد مگر روز جزا ہے تو سہی

دوست ہی کوئی نہیں ہے جو کرے چارہ گری — نہ سہی لیک تمنائے دوا ہے تو سہی

غیر سے دیکھئے کیا خوب نباہی اُس نے — نہ سہی ہم سے پر اس بت میں وفا ہے تو سہی

نقل کرتا ہوں اسے نامۂ اعمال میں میں — کچھ نہ کچھ روز ازل تم نے لکھا ہے تو سہی

کبھی آجائے گی کیوں کرتے ہو جلدی غالب
شہرۂ تیزیٔ شمشیر قضا ہے تو سہی

کمال حسن اگر موقوف انداز تغافل ہے ؟ — تکلّف برطرف تجھ سے تری تصویر بہتر ہے

ذرا کر زور سینے پر کہ تیر پُر ستم نکلے ؟ — جو وہ نکلے تو دل نکلے جو دل نکلے تو دم نکلے

خدا کے واسطے پردہ نہ کعبے کا اٹھا واعظ ؟ — کہیں ایسا نہ ہو یاں بھی وہی کافر صنم نکلے

جس دن سے کہ ہم خستہ گرفتار بلا ہیں — کپڑوں میں جوئیں بخیے کے ٹانکوں سے سوا ہیں

مسجد کے زیر سایہ اک گھر بنالیا ہے — یہ بندۂ کمینہ ہمسایۂ خدا ہے

میں ہوں مشتاقِ جفا مجھ پہ جفا اور سہی
تم ہو بیداد سے خوش اس سے سوا اور سہی

تم ہو بُت پھر تمہیں پندارِ خدائی کیوں ہے؟
تم خداوند ہی کہلاؤ خدا اور سہی

کیوں نہ فردوس میں دوزخ کو ملا لیں یا رب!
سیر کے واسطے تھوڑی سی فضا اور سہی

غیر کی مرگ کا غم کس لئے اے غیرتِ ماہ!
ہیں ہوس پیشہ بہت وہ نہ ہُوا اور سہی

حسن میں حور سے بڑھ کر نہیں ہونے کی کبھی
آپ کا شیوہ و انداز و ادا اور سہی

تیرے کوچے کا ہے مائل دلِ مضطر میرا
کعبہ اک اور سہی قبلہ نما اور سہی

کوئی دنیا میں مگر باغ نہیں ہے واعظ
خلد بھی باغ ہے خیر آب و ہوا اور سہی

مجھ کو وہ دو کہ جسے کھا کے نہ پانی مانگوں
زہر کچھ اور سہی آبِ بقا اور سہی

مجھ سے غالبؔ یہ علائی نے غزل لکھوائی
ایک بیداد گرِ رنج فزا اور سہی

۱۲۸۲ھ

لطفِ نظارۂ قاتل دمِ بسمل آئے
جان جائے تو بلا سے پہ کہیں دل آئے

اُنکو کیا علم کہ کشتی پہ مری کیا گزری
دوست جو ساتھ مرے تا لبِ ساحل آئے

وہ نہیں ہم کہ چلے جائیں حرم کو اے شیخ!
ساتھ حجاج کے اکثر کئی منزل آئے

آئیں جس بزم میں وہ لوگ پکار اٹھتے ہیں
لو وہ برہم زنِ ہنگامۂ محفل آئے

دیدہ خونبار ہے مدت سے ولے آج ندیم!
دل کے ٹکڑے بھی کئی خون کے شامل آئے

سامنا حور و پری نے نہ کیا ہے نہ کریں
عکس تیرا ہی مگر تیرے مقابل آئے

اب ہے دلی کی طرف کوچ ہمارا غالبؔ
آج ہم حضرتِ نواب سے بھی مل آئے

دسمبر ۱۸۶۵ء

رستخیز بیجا

بسکہ فعّالِ ما یرید ہے آج — ہر سلحشور انگلستاں کا
گھر سے بازار میں نکلتے ہوئے — زہرہ ہوتا ہے آب انساں کا
چوک جس کو کہیں وہ مقتل ہے — گھر نمونہ بنا ہے زنداں کا
شہرِ دہلی کا ذرّہ ذرّہ خاک — تشنۂ خوں ہے ہر مسلماں کا
کوئی واں سے نہ آ سکے یاں تک — ق — آدمی واں نہ جا سکے یاں کا
میں نے مانا کہ مل گئے پھر کیا — وہی رونا تن و دل و جاں کا
گاہ جل کر کیا کیے شکوے — سوزشِ داغہائے پنہاں کا
گاہ رو کر کہا کیے باہم — ماجرا دیدہ ہائے گریاں کا
اس طرح کے وصال سے یا رب — کیا مٹے دل سے داغ ہجراں کا — ۱۸۵۷

فرد

روز اس شہر میں اک حکم نیا ہوتا ہے — کچھ سمجھ میں نہیں آتا ہے کہ کیا ہوتا ہے

قصیدہ

ملاذِ کشور و لشکر پناہِ شہر و سپاہ — جنابِ عالی ایلن برون والا جاہ
بلند رتبہ وہ حاکم وہ سرفراز امیر — کہ باج تاج سے لیتا ہے جس کا طرفِ کلاہ

وہ محضِ رحمت و رافت کہ بہرِ اہلِ جہاں
نیابتِ دمِ عیسیٰ کرے ہے جسکی نگاہ

وہ عینِ عدل کہ دہشت سے جسکی پرسش کے
بنے ہے شعلۂ آتش انیسِ پرِ کاہ

زمیں سے سو وہ گُہر اٹھے بجائے غبار
جہاں ہو توسنِ حشمت کا اسکے جولاں گاہ

وہ مہرباں ہو تو انجم کہیں الٰہی شکر!
وہ خشمگیں ہو تو گردوں کہے خدا کی پناہ!

یہ اسکے عدل سے اضداد کو ہے آمیزش
ق کہ دشت و کوہ کے اطراف میں بہر سرِ راہ

ہژبر پنجے سے لیتا ہے کام شانے کا
کبھی جو ہوتی ہے الجھی ہوئی دُمِ روباہ

نہ آفتاب وہ لے آفتاب کا ہم چشم
نہ بادشاہ وہ لے مرتبے میں ہمسرِ شاہ

خدا نے اسکو دیا ایک خوبرو فرزند
ستارہ جیسے چمکتا ہوا بہ پہلوئے ماہ

زہے ستارۂ روشن کہ جو اُسے دیکھے
شعاعِ مہرِ درخشاں ہو اسکا تارِ نگاہ

خدا سے یہ ہے توقع کہ عہدِ طفلی میں
بنیگا شرق سے تا غرب اُسکا بازیگاہ

جوان ہو کے کریگا یہ وہ جہانبانی
کہ تابع اسکے ہوں روز و شب سپید و سیاہ

کہیگی خلق اُسے داورِ سپہر شکوہ
لکھیں گے لوگ اسے خسروِ ستارہ سپاہ

عطا کریگا خداوندِ کارساز اُسے
روانِ روشن و خوئے خوش و دلِ آگاہ

ملے گی اسکو وہ عقلِ نہفتہ داں کہ اُسے
پڑے نہ قطعِ خصومت میں احتیاجِ گواہ

یہ ترکتاز سے برہم کریگا کشورِ روس
یہ لیگا بادشہِ چیں سے چھین تخت و کلاہ

سنینِ عیسوی اٹھارہ سو اور اٹھاون
یہ چاہتے ہیں جہاں آفریں سے شام و پگاہ

یہ جتنے سیکڑے ہیں ہزار ہو جائیں
دراز اسکی ہو عمر اسقدر سخن کوتاہ

تاریخ تذکرۂ سراپا سخن مطبوعہ ۱۲۷۷ھ

اس کتابِ طرب نصاب نے جب — آب و تابِ انطباع کی پائی
فکرِ تاریخِ سال میں مجھ کو — ایک صورت نئی نظر آئی
ہندسے پہلے سات سات کے دو — دیئے ناگاہ مجھ کو دکھلائی
اور پھر ہندسہ تھا بارہ کا — با ہزاراں ہزار زیبائی
سالِ ہجری تو ہو گیا معلوم — بے شمولِ عبارت آرائی
مگر اب ذوقِ بذلہ سنجی کو — ہے جداگانہ کارفرمائی
سات اور سات ہوتے ہیں چودہ — بہ امید سعادت افزائی
غرض اس سے ہیں چاردہ معصوم — جن سے ہے چشم و جاں کو زیبائی
اور بارہ امام ہیں بارہ — جن سے ایماں کو ہے توانائی

ان کو غالب یہ سال اچھا ہے
جو ائمہ کے ہیں تولائی

سہرا

ہم نشیں تارے ہیں اور چاند شہاب الدین خاں — بزمِ شادی ہے فلک کاہکشاں ہے سہرا
ان کو لڑیاں نہ کہو بحر کی موجیں سمجھو — ہے تو کشتی میں ولے بحرِ رواں ہے سہرا

قصیدہ

کرتا ہے چرخ روز بصد گونہ احترام
فرمانروائے کشورِ پنجاب کو سلام

حق گو و حق پرست و حق اندیش و حق شناس
نواب مستطاب امیرِ شہ احتشام

جسم رتبہ میکلوڈ بہادر کہ وقتِ رزم
ترکِ فلک کے ہاتھ سے وہ چھین لیں حسام

جس بزم میں کہ ہو انہیں آئینِ میکشی
واں آسماں شیشہ بنے آفتاب جام

قطعہ

چاہا تھا میں نے تم کو مہ چار دہ کہوں
دل نے کہا کہ یہ بھی ہے تیرا خیالِ خام

دو رات میں تمام ہے ہنگامہ ماہ کا
حضرت کا عزّ و جاہ رہیگا علی الدوام

سچ ہے تم آفتاب ہو جس کے فروغ سے
دریائے نور ہے فلکِ آبگینہ فام

میری سنو کہ آج تم اس سرزمین پر
حق کے تفضّلات سے ہو مرجعِ انام

اخبار "لودھیانہ" میں میری نظر پڑی
تحریر ایک جس سے ہوا بندہ تلخ کام

ٹکڑے ہوا ہے دیکھ کے تحریر کو جگر
کاتب کی آستین ہے مگر تیغِ بے نیام

وہ فرد جس میں نام ہے میرا غلط لکھا
جب یاد آ گئی ہے کلیجہ لیا ہے تھام

سب صورتیں بدل گئیں ناگاہ یک قلم
نمبر رہا نہ نذر نہ خلعت کا انتظام

ستّر برس کی عمر میں یہ داغِ جانگداز
جس نے جلا کے راکھ مجھے کر دیا تمام

تھی جنوری مہینے کی تاریخ تیرھویں
استادہ ہو گئے لبِ دریا پہ جب خیام

اس بزم پُر فروغ میں اس تیرہ بخت کو
نمبر ملا نشست میں از روئے اہتمام

سمجھا اُسے گر اب ہوا پاش پاش دل — دربار میں جو مجھ پہ چلی چشمک عوام
عزّت پہ اہلِ نام کے ہستی کی ہے بنا — عزّت جہاں گئی تو نہ ہستی رہی نہ نام
تھا ایک گونہ ناز جو اپنے کمال پر — اس ناز کا فلک نے لیا مجھ سے انتقام
آیا تھا وقت ریل کے کھلنے کا بھی قریب — تھا بارگاہِ خاص میں خلقت کا اژدہام
اس کشمکش میں آپ کا مدّاحِ دردمند — آقائے نامور سے نہ کچھ کہہ سکا سلام
جو واں نہ کر سکا تھا وہ لکھا حضور کو — دیں آپ میری داد کہ ہوں فائز المرام
ملک و سپہ نہ ہو تو نہ ہو کچھ ضرر نہیں — سلطانِ بر و بحر کے در کا ہوں میں غلام
وکٹوریہ کا دہر میں جو مدح خواں ہو — شاہانِ عصر چاہیئے لیں عزت اس سے وام
خود ہے تدارک اس کا گورمنٹ کو ضرور — بے وجہ کیوں ذلیل ہو غالبؔ ہے جسکا نام
امرِ جدید کا تو نہیں ہے مجھے سوال — بارے قدیم قاعدے کا چاہیئے قیام
ہے بندہ کو اعادۂ عزّت کی آرزو — چاہیں اگر حضور تو مشکل نہیں یہ کام
دستورِ فنِ شعر یہی ہے قدیم سے — یعنی دعا پہ مدح کا کرتے ہیں اختتام
ہے یہ دعا کہ زیرِ نگیں آپ کے رہے — اقلیم ہند و سندھ سے ملکِ روم و شام

قطعہ[۱]

مقامِ شکر ہے اے ساکنانِ خطۂ پاک
رہا ہے زور سے ابرِ ستارہ بار برس
کہاں ہے ساقیٔ مہوش؟ کہاں ہے ابرِ مطیر؟
بہار، لائیے گلنار گوں، بہار، برس
خدا نے بجھ کو عطا کی ہے گوہر افشانی

۱؎ مکاتیبِ غالب

درِ حضور پر اے ابر بار بار برس
ہر ایک قطرے کے ساتھ آئے جو ملک وہ کہے
امیدِ کلب علی خاں جئیں ہزار برس
فقط ہزار برس پر کچھ انحصار نہیں
کئی ہزار برس بلکہ بے شمار برس
جنابِ قبلۂ حاجات اس بلاکش نے
بڑے عذاب سے کاٹے ہیں پانچ چار برس
شفا ہو آپ کو، غالب کو بندِ غم سے نجات
خدا کرے کہ یہ ایسا ہو سازگار برس

قطعہ مدحیہ[1]

ہند میں اہلِ تسنن کی ہیں دو سلطنتیں
حیدر آباد دکن، رشکِ گلستانِ ارم
رام پور اہلِ نظر کی ہے نظر میں وہ شہر
کہ جہاں ہشت بہشت آ کے ہوئے ہیں باہم
حیدر آباد بہت دور ہے اس ملک کے لوگ
اُس طرف کو نہیں جاتے ہیں جو جاتے ہیں تو کم
رام پور آج ہے وہ بقعۂ معمور کہ ہے

[1] مکاتیب غالب

مرجع و مجمع اشرافِ نژادِ آدمؑ
رامپور ایک بڑا باغ ہے از روئے مثال
دل کش و تازہ و شاداب و وسیع و خرّم
جس طرح باغ میں ساون کی گھٹائیں برسیں
ہے اسی طور پہ یاں دجلہ فشاں دستِ کرم
ابرِ دستِ کرم کلبِ علی خان سے مُدام
دُرِّ شہوار ہیں جو گرتے ہیں قطرے پیہم
صبحدم باغ میں آ جائے جسے ہو نہ یقیں
سبزہ و برگِ گلُ و لالہ پہ دیکھے شبنم
حبذا باغِ ہمایون تقدس آثار
کہ جہاں چرنے کو آتے ہیں غزالانِ حرم
مسلکِ شرع کے ہیں راہرو و راہ شناس
خضر بھی یاں اگر آ جائے تو لے اُن کے قدم
مدح کے بعد دُعا چاہیئے اور اہلِ سخن
اسکو کرتے ہیں بہت بڑھ کے بہ اغراق رقم
حق سے کیا مانگیئے ؟ ان کے لئے جب ہو موجود
ملک و گنجینہ و خیل و سپہ و کوس و علم
ہم نہ تبلیغ کے مائل نہ غلو کے قائل
دو دعائیں ہیں کہ وہ دیتے ہیں نواب کو ہم
یا خدا! غالبِ عاصی کے خداوند کو دے
دو وہ چیزیں کہ طلبگار ہے جن کا عالم

اولاً عمرِ طبیعی بہ دوامِ اقبال
ثانیاً دولتِ دیدارِ شہنشاہِ اُمم

قطعہ

خوشی تو ہے آنے کی برسات کے — پئیں بادۂ ناب اور آم کھائیں
سر آغازِ موسم میں اندھے ہیں ہم — کہ دلّی کو چھوڑیں لوہارو کو جائیں
سوا اناج کے جو ہے کہ مطلوب جاں — نہ واں آم پائیں نہ انگور پائیں
ہوا حکم باورچیوں کو کہ ہاں — ابھی جا کے پوچھو کہ کل کیا پکائیں
وہ کھٹے کہاں پائیں املی کے پھول — وہ کڑوے کریلے کہاں سے منگائیں

فقط گوشت سو بھیڑ کا ریشہ دار
کہو اسکو کیا کھا کے ہم حظ اٹھائیں

رباعیات

رقعہ کا جواب کیوں نہ بھیجا تم نے — ثاقب! حرکت یہ کی ہے بیجا تم نے
حاجی کلّو کو دیکے بیوجہ جواب — غالب کا پکا دیا کلیجا تم نے

اے روشنیٔ دیدۂ شہاب الدین خاں — کٹتا ہے بتاؤ کسی طرح سے رمضاں
ہوتی ہے تراویح سے فرصت کب تک — سنتے ہو تراویح میں کتنا قرآں

کلامِ غالب

شعر کے پڑھنے میں کچھ حاصل نہیں ... مانتا لیکن ہمارا دل نہیں
علم ہی سے قدر ہے انسان کی ... ہے وہی انسان جو جاہل نہیں
کیا کہیں کھائی ہے حافظ جی کی مار ... آج ہنستے آپ جو کھِل کھِل نہیں
جس نے "قادر نامہ" سارا پڑھ لیا
اسکو "آمد نامہ" کچھ مشکل نہیں

قصیدہ

مرحبا! سالِ فرخی آئیں ... عیدِ شوال و ماہِ فروردیں
شب و روز افتخارِ لیل و نہار ... مہ و سال اشرفِ شہور و سنیں
گرچہ ہے بعد عید کے نوروز ... لیک بیش از سہ ہفتہ بعد نہیں
سو اس اکیس دن میں ہولی کی ... جا بجا مجلسیں ہوئیں رنگیں
شہر میں کو بکو عبیر و گلال ... باغ میں سو بسو گل و نسریں
شہر گویا نمونہ گلزار ... باغ گویا نگار خانۂ چیں
تین تیوہار اور ایسے خوب ... جمع ہرگز ہوئے نہ ہونگے کہیں
پھر ہوئی ہے اسی مہینے میں ... منعقد محفلِ نشاطِ قریں

محفلِ غسلِ صحتِ نواب
رونق افزائے مسندِ تمکیں

بزم گہہ میں امیر شاہ نشاں
رزم گہ میں حریفِ شیر مکیں

پیشگاہِ حضورِ شوکت و جاہ
خیر خواہِ جنابِ دولت و دیں

جن کی مسند کا آسماں گوشہ
جنکی خاتم کا آفتاب نگیں

جنکی دیوارِ قصر کے نیچے
آسماں ہے گدائے سایہ نشیں

دہر میں اسطرح کی بزم سرور
نہ ہوئی ہو کبھی بروئے زمیں

انجمِ چرخ گوہر آگیں فرش
نور لے ماہ ساغرِ سیمیں

راجہ اندر کا جو اکھاڑا ہے
ہے وہ بالائے سطحِ چرخ بریں

وہ نظر گاہِ اہلِ وہم و خیال
یہ ضیا بخش چشمِ اہلِ یقیں

واں کہاں یہ عطا و بذل و کرم
کہ جہاں گدیہ گر کا نام نہیں

یاں زمیں پر نظر جہانتک جائے
ژالہ آسا بچھے ہیں در ثمیں

نغمہ مطربانِ زہرہ نوا!!!
جلوہ لولیانِ ماہ جبیں

اُس اکھاڑے میں جو کہ ہے مظنون
یاں وہ دیکھا بہ چشمِ صورت بیں

سرورِ دہر فرہوا جو سوار
بہ کمالِ تجمل و تزئیں!!

سب نے جانا کہ ہے پری توسن
اور بالِ پری ہے دامنِ زیں

نقش سمِ سمند سے یکطرف
بن گیا دشت دامنِ گل چیں

فوج کی گرد راہ مشک فشاں
راہ رووں کے مشام عطر آگیں

بسکہ بخشی ہے فوج کو عزت
فوج کا ہر پیادہ ہے فرزیں

موکب خاص یوں زمیں پر تھا
جسطرح ہو سپہر پر پرویں

چھوڑ دیتا تھا گور کو بہرام
ران پر داغِ تازہ دیکے وہیں

اور داغ آپ کی غلامی کا
خاص بہرام کا ہے زیبِ سُریں

بندہ پرور ثنا طرازی سے
مدعا عرضِ فنِ شعر نہیں

آپ کی مدح اور میرا یہ منہ
گر کہوں بھی تو آئے کس کو یقیں

اور پھر اب کہ ضعفِ پیری سے
ہو گیا ہوں نزار و زار و حزیں

پیری و نیستی! خدا کی پناہ
دستِ خالی و خاطرِ غمگیں

صرف اظہار ہے ارادت کا
ہے قلم کو جو سجدہ ریز نہیں

مدح گستر نہیں دعا گو ہے
غالبِ عاجزِ نیاز آگیں

ہے دعا بھی یہی کہ دنیا میں
تم رہو زندہ جاوداں آمیں!

جنوری ۱۸۶۵ء

خاتمہ

دمِ واپسیں برسرِ راہ ہے
عزیزو اب اللہ ہی اللہ ہے

ماخذ

۱ دیوانِ غالب اردو قلمی نسخہ بھوپال لائبریری ۱۸۲۱ء
۲ دیوانِ غالب اردو قلمی نسخہ مملوکہ پروفیسر محمود خان صاحب شیرانی (۱۸۲۷ء)
۳ میخانۂ آرزو (فارسی نظم ونثر) قلمی ۴۷۱ خدابخش لائبریری (۱۸۳۸ء)
۴ دیوانِ غالب فارسی قلمی ۹۸ خدابخش لائبریری بانکی پور (۱۸۴۱ء)
۵ دیوانِ غالب اردو مطبوعہ (۱۸۴۱ء) مملوکہ خان بہادر سید ابو محمد صاحب
۶ دیوان غالب فارسی مطبوعہ ۱۸۴۵ء رام نگر سٹیٹ (بنارس) لائبریری
۷ دیوان غالب اردو مطبوعہ ۱۸۴۷ء مملوکہ مولانا حسرت موہانی
۸ پنج آہنگ - انڈیا آفس لائبریری $\frac{306}{33026}$ ۱۸۵۳ء
۹ دیوانِ غالب اردو قلمی نسخہ ۱۵۲ رامپور اسٹیٹ لائبریری (۱۸۵۷ء)
۱۰ کلیات نظم فارسی - کلیات نثر فارسی - درفش کاویانی - اردو معلّٰے وغیرہ

---

۱ عیار الشعرا قلمی انڈیا آفس لائبریری
۲ تذکرۃ الشعرا (سرور) انڈیا آفس لائبریری
۳ گلشن بے خار قلمی برٹش میوزیم ۲۱۶۴
۴ دہلی ریذیڈنسی کے ریونیو ریکارڈز
۵ آثار الصنادید
۶ تذکرۃ الشعرائے اردو مولوی کریم الدین ۱۸۴۸ء
گلستان بیخزاں - جلوۂ خضر - تذکرۂ غوثیہ - دیوان شیفتہ وغیرہ

مرکنٹائل پریس لاہور میں باہتمام بابو گوپالداس مینیجر چھپا اور مسٹر حق نواز صاحب نے لاہور سے شائع کیا

"آبِ کوثر" اور "موجِ کوثر"

یعنی

ہندوستانی مسلمانوں کی مذہبی اور علمی تاریخ

از

شیخ محمد اکرام ایم - اے

مولف "غالب نامہ"

قیمت ہر دو حصص تین روپے

ملنے کا پتہ

تاج کمپنی لمیٹڈ - ریلوے روڈ - لاہور